مرزا علی لطف ۔ حیات اور کارنامے

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

ANJUMAN TARAQQI URDU HIND
Urdu Ghar, Rouse Avenue
NEW DELHI-110002

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

اس مقالے پر عثمانیہ یونیورسٹی نے مصنف کو اگست ۱۹۷۷ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

129988

اشاعتِ اول ۱۹۷۹ء

خوش نویس .... مجید مظہری

مطبع .... اکسل فائن آرٹ جامع مسجد محبوب چوک، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

تعداد اشاعت .... ۵۰۰ پانچ سو

قیمت ۳۰/- روپیہ

باہتمام :— ادارۂ شعر و حکمت

۸۶۵-۴-۱۱، ریڈہلز۔ حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۴

ملنے کے پتے:—

۱۔ مصنف :— مکان نمبر ۲/۱۰۳۲-۹-۵، حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد۔ (۵۰۰۰۰)۔

۲۔ الیاس بک ڈپو۔ چار مینار۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲۔

۳۔ اردو اکیڈیمی۔ آندھرا پردیش۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲۔

۴۔ نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ)

انتساب

اپنی پیاری پھوپی اماں فاطمہ بیگم مرحومہ (اہلیہ مرزا عباس علی صاحب مرحوم)
کے نام جن کی آغوش میں مجھ کو ماں کا پیار اور باپ کی شفقت ملی اور جن کی سرپرستی
اور تربیت کا فیضان ہی ہے کہ آج میں کچھ بن سکا۔ ۲۸؍اگست ۱۹۷۸ء دوشنبہ
۱ بجے دوپہر کو جب اس بزرگ ہستی کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ
یتیم اور یسیر کس کو کہتے ہیں۔۔

ہم بھلانے چلے بھی ہیں کس کو
جس کی ہر بات یاد آتی ہے (وقار صدیقی)

(ڈاکٹر) مرزا اکبر علی بیگ

پہلا حصّہ

حیات

فہرس

مقدمہ و

پیش لفظ ھ

نام ۱

والد ۴

پیدائش ۱۱

مولد ۱۳

تعلیم و تربیت ۱۴

شعر گوئی کی ابتدا ۱۵

تلمذ ۱۵

ترکِ وطن ۔ لکھنؤ کو روانگی ۱۹

لطفؔ کی کلکتہ میں آمد ۳۳

گلشن ہند کی وجۂ تالیف ۳۶

لطفؔ کی کلکتے سے حیدرآباد میں آمد ۴۰

نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کی سرپرستی ۴۲

اعظم الامراء ارسطو جاہ کی مصاحبت	۴۵
لطفؔ کی میر عالم سے وابستگی	۵۲
حیدر آباد دکن میں لطفؔ کے معاصر شعرا	۵۴
لطفؔ کی وفات	۸۲
مرزا علی لطفؔ کی سیرت	۸۳
ـــــ مذہبی عقائد ـــــ	۸۴
ـــــ تاہل ـــــ	۸۵
لطفؔ کے تلامذہ	۸۷
لطف تخلّص کے دیگر شعرا	۹۰

دوسرا حصّہ

کارنامے

لطف کی تذکرہ نگاری

تذکرہ نگاری اور اس کا فن	۹۸
گلشنِ ہند کا ماخذ۔ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم اور اُس کا مصنف	۱۰۷
گلزارِ ابراہیم کے ترجمے اور ان کا موازنہ	۱۱۲
تذکرۂ گلشنِ ہند کے قلمی نسخے	۱۳۰
تذکرۂ گلشنِ ہند کے مطبوعہ نسخے	۱۴۱
اردو تذکروں میں گلشنِ ہند کا مرتبہ	۱۴۴
لطف کا اسلوبِ بیان	۲۰۹

شاعری

دیوان لطف	۲۱۸
لطف کی غزل گوئی	۲۲۱
منتخب کلام	۲۵۰
لطف کی قصیدہ نگاری	۲۵۸
لطف کی مثنوی نگاری	۲۸۴
[illegible]	۳۴۹

لطف کی تاریخ گوئی ۳۳۳
لطف کا فارسی کلام ۳۳۵

کتابیات ۳۳۷

تعارف

آج سے پچھتر برس پہلے مرزا علی لطفؔ اردو ادب کا ایک غیر اہم نام تھا۔ تذکروں سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ میرؔ و سوداؔ کے عہد میں اس نام کا ایک شاعر گزرا ہے جس نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی قلمبند کیا تھا۔ یہ تذکرہ ناپید تھا اور مرزا علی لطفؔ کے دیوان سے بھی عام طور پر لوگ واقف نہیں تھے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ رود موسیٰ کی طغیانی میں یہ بیش بہا تذکرہ جو کسی کتب خانے کی زینت بنا ہوا تھا ' دریا برد ' ہو کر علم و ادب کے ایک قدر داں مولوی غلام محمد کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ ان کی درخواست پر مولانا شبلی نعمانی نے اس تذکرے کو مرتب کیا اور عبداللہ خاں نے مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھوا کر اسے ۱۹۰۶ء میں شائع کر دیا۔ اس تذکرے کی دستیابی کی طرح اس کی تالیف بھی ایک اتفاق تھی کہ مرزا علی لطفؔ جو عازمِ حیدر آباد تھے اپنے دوست شیر علی افسوسؔ کی دعوت پر چند روز کے لیے کلکتہ میں قیام پذیر ہوئے اور گلکرسٹ کے پاسِ خاطر سے اپنے قیام کو طول دے کر یہ تذکرہ مرتب کیا۔ اس تذکرے

کی اشاعت کے بعد مرزا علی لطفؔ کا شمار نہ صرف یہ کہ فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والے اہم مصنفین میں ہونے لگا بلکہ انھیں اُردو زبان میں شعرا کا پہلا تذکرہ لکھنے کا امتیاز حاصل ہوگیا۔ مرزا علی لطفؔ ایک خوش فکر شاعر تھے اور اپنے زمانے میں ایک شاعر ہی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے تذکرے کی مقبولیت کے ساتھ انھیں ایک بلند پایہ نثر نگار، مورخ اور نقّاد کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہوی اس کی وجہ سے ان کی شاعرانہ شخصیت نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مرزا علی لطفؔ کے نثری اور شعری کارناموں کی اہمیت متقاضی تھی کہ ان کی حیات اور ادبی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ بعض محقّقیں نے اس طرف توجہ بھی کی لیکن کسی وجہ سے اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس موہوم امید کے ساتھ کہ وہ لطفؔ کی حیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات تک رسائی حاصل کرسکیں گے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں انھیں سخت مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر ان کی مساعی بارآور ہویں۔ حیاتِ لطفؔ کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرنے کے علاوہ انھوں نے تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لطفؔ کے نام، توطن، تلمّذ سے لے کر تاریخِ وفات تک بہت سے متنازع فیہ امور کی یکسوئی کر دی۔

دوسرا اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ "گلشنِ ہند" کا گلزارِ ابراھیم اور دوسرے تذکروں سے موازنہ کرتے ہوئے لطفؔ کے اس کارنامے کی حقیقی قدرو قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ اسی ضمن میں حیدری کے تذکرے "گلشنِ ہند" کے بارے میں انھوں نے جو انکشافات کیے ہیں وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے لطفؔ کے دیوان کو کھوج نکالا اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لے کر لطفؔ کو صفِ دوم کے ایک قابلِ ذکر شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا۔

مرزا اکبر علی بیگ کی یہ پہلی علمی اور تحقیقی کاوش ہے۔ جہاں تک مواد کی فراہمی کا تعلق ہے انھوں نے بساطِ بھر تلاش و جستجو سے کام لیا اور جو معلومات حاصل ہوئیں، ضروری تفتیش کے بعد ان سے کار آمد نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی اور مستحکم دلائل کے ساتھ انھیں اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔ کوئی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق تحقیق مزید کے لیے نئی راہیں کھول دے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اپنے

مقالے میں کچھ ایسے گوشے ابھارے ہیں جو اہلِ تحقیق کو دعوتِ فکرو نظر دیتے ہیں ––

حیدرآباد ۔

۷ - ۱۲ - ۱۹۷۹ء

(ڈاکٹر) مغنی تبسم

ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد ۔

پیش لفظ

مرزا علی لطف کا شمار اردو کے اوّلین تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے لطف سے قبل اردو شاعروں کے بہت سے تذکرے مرتب ہوئے لیکن یہ سب فارسی زبان میں ہیں لطف پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں تذکرہ نگاری کی بنا ڈالی۔ ان کا تذکرہ "گلشنِ ہند" کہنے کو فارسی تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ ہے لیکن اس میں لطف نے اتنے اضافے کئے ہیں کہ ہم بغیر کسی تردّد کے اس کو لطف کی تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔

عام طور پر لطف کا شمار فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے مصنّفین میں کیا جاتا ہے لیکن اس کالج سے لطف کا براہِ راست تعلق نہیں رہا۔ محض ایک بار وہ شیر علی افسوس کے توسط سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ (پروفیسر ہندوستانی، فورٹ ولیم کالج کلکتہ) سے متعارف ہوئے اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ علی ابراہیم خاں خلیل کے فارسی تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" کا اُردو میں ترجمہ کریں چنانچہ ان کے ایما پر لطف نے اس تذکرے کو اُس زمانے کی سلیس اور سادہ زبان میں لکھ کر گلکرسٹ کی خدمت میں پیش کیا جسے ڈاکٹر گلکرسٹ نے بے حد پسند کیا لیکن نامعلوم وجوہ سے یہ تذکرہ شائع نہ ہوا۔

لطف نے اپنا تذکرہ "گلشنِ ہند" ۱۸۰۱ء میں کلکتہ ہی میں مکمل کیا مگر بدقسمتی سے اس تذکرے کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ حسنِ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ رودِ موسی کے سیلاب میں بہتا ہوا مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل، دولتِ آصفیہ

کے ہاتھ لگا جس کو انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حوالے کیا جو ان دنوں حیدر آباد دکن ہی میں مقیم تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بعد تصحیح و تحشیہ اس کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا لیکن انجمن چند اسباب کی بنا پر اس کو چھاپ نہ سکی۔ بعد ازاں عبداللہ خاں نے مولوی عبدالحق کے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ رفاہِ عام پریس لاہور سے ۱۹۰۶ء میں اس کو شایع کیا۔ پھر ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے مقدمے کے ساتھ اس تذکرہ کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا اس میں گلزارِ ابراہیم کے وہ حصے شامل کر دیئے گئے جن کا ترجمہ لطف نے نہیں کیا تھا۔

لطف نے تذکرہ گلشن ہند میں اردو کے (۶۹) شعرا کے حالات زندگی، ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ دئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے شعرا کے حالاتِ زندگی میں تو کوئی ترمیم نہیں کی مگر لطف کے دئے ہوئے نمونۂ کلام میں تحریف کر دی اور کئی صفحات حذف کر دیئے ڈاکٹر زور نے بھی اُسی طرح مولوی عبدالحق کی من و عن تقلید کی۔ راقم الحروف نے تذکرۂ گلشنِ ہند کے اصل نسخوں سے جب مطبوعہ نسخوں کا موازنہ کیا تو ان میں کافی فرق پایا۔

لطف ایک اچھے نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک پُرگو شاعر بھی تھے۔ عام طور پر ادبی حلقوں میں لطف کو ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے حالانکہ وہ میر و سودا کے عہد کے ایک خوش گو اور اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ اب تک لطف کی شاعرانہ حیثیت کو کسی نے متعین کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کا دیوان ہنوز منظرِ عام پر آیا ہے۔ "دیوان لطف" کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کے مطالعے سے بحیثیت شاعر لطف کا مقام متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ابھی تک مختلف تذکروں میں لطف کا چیدہ چیدہ کلام ہی بطورِ نمونہ

ملتا ہے۔ اب پہلی بار لطفؔ کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ اس مقالہ میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے لطفؔ کی مثنوی "نیرنگِ عشق" کو مرتب کر کے مجلسِ تحقیقات اردو، حیدرآباد دکن سے ۱۹۶۲ء میں شایع کیا ہے لیکن اس میں بھی مثنوی کے تمام نسخوں سے موازنہ اور تقابل کرنے کی بجائے صرف چار نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے تحقیق کے دوران اس مثنوی کے مزید دس نسخوں کا پتہ چلا ہے جس کی نشان دہی متعلقہ باب میں کی گئی ہے۔

اردو کے تذکروں اور تاریخوں میں لطفؔ کے حالاتِ زندگی بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ لطفؔ کی حیات پر سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی ہے جو "حیاتِ لطفؔ" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں مجلسِ تحقیقات اردو، حیدرآباد دکن سے شایع ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں فراہمی مواد کے سلسلے میں "حیاتِ لطفؔ" کے علاوہ اور بہت سے ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں لطفؔ کی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں دوسرے حصے میں لطفؔ کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے

اس مقالے کی ترتیب و تدوین اور فراہمی مواد کے سلسلے میں راقم الحروف کو کئی اصحاب کا تعاون حاصل رہا ہے، جس کے لئے وہ ان سب کا سپاس گزار ہے۔ خاص طور شفیق و محترم اُستاد جناب ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب ریڈر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ بحیثیت نگران کار انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور اپنے گراں قدر مشوروں سے سرفراز فرمایا۔

مقالے کی تیاری کے سلسلے میں راقم الحروف نے مندرجہ ذیل کتب خانوں اور اداروں کے کتابی ذخیروں سے استفادہ کیا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، کتب خانہ اردو اکیڈمی، کتب خانہ خواتین دکن، کتب خانہ گورنمنٹ سٹی کالج، کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو، ایچ ای، ایچ دی نظامس ٹرسٹ لائبریری اور اسٹیٹ آرکیوز لائبریری (حیدرآباد) نیشنل آرکیوز آف انڈیا، نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی لائبریری۔ مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) انجمن ترقی اردو (علی گڑھ)۔ اور نیشنل ریسرچ سنٹر (بمبئی)، مہاتما گاندھی ریسرچ سنٹر (بمبئی) نیشنل لائبریری (کلکتہ)، ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ)۔ اس کے علاوہ رضا لائبریری (رام پور) خدا بخش لائبریری (پٹنہ) اسٹاٹ سی بلیوتھک (جرمنی)، نیشنل لائبریری پیرس (فرانس)، انڈیا آفس لائبریری لندن (انگلینڈ)، برٹش میوزیم لائبریری (انگلینڈ) اور انجمن ترقی اُردو، کراچی (پاکستان) کے منتظمین کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اپنے کتب خانوں سے مطلوبہ مواد فراہم کیا۔

ان بہت سے اصحاب کے منجملہ جنھوں نے میرے استفسارات کے جوابات مرحمت فرمائے ہیں خاص طور پر میں جناب قاضی عبدالودود، جناب پروفیسر محمد حسن، جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ، جناب ڈاکٹر خلیق انجم، جناب ڈاکٹر اکبر حیدری، جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر ظہیر احسن، جناب ڈاکٹر عبدالحق اور جناب ڈاکٹر احمر لاری کا شکر گزار ہوں انھوں نے لطف کے متعلق نہ صرف میرے استفسارات کا جواب دیا بلکہ مطلوبہ تذکروں کے نقولات بھی روانہ کیے۔ استادِ محترم ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا اور میری ہمت افزائی کی۔ ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ (سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے نہ صرف موضوع

تحقیق میرے لئے مختص کیا بلکہ مختلف موقعوں پر اپنے مفید مشوروں سے مستفید کیا اور ان ہی کی ہمت افزائی کی وجہ سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا۔ راقم الحروف کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ ڈائرکٹر اسٹیٹ آرکیوز آندھرا پردیش حیدرآباد نے اس مقالے کی تیاری کے وقت دو سال کا "پارٹ ٹائم فیلوشپ" عطا کیا جس سے مزید سہولت حاصل ہوئی اس کے لئے میں ڈائرکٹر اسٹیٹ آرکیوز کا ممنون ہوں۔

اس مقالے کی اشاعت کے لئے ایچ' ای' ایچ دی نظامس ٹرسٹ حیدرآباد اور گورنمنٹ آف آندھرا پردیش نے جزوی امداد دی جس کے لئے میں مشکور ہوں۔

میں اپنے ماموں جناب میر کاظم علی صاحب مرحوم (برقؔ موسوی) اور برادر محترم جناب ہاشم حسن سعید صاحب کا ممنون ہوں جن کے مشورے اور نیک تمنائیں شاملِ حال رہی ہیں۔

جناب مجید مظہری صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ مقالے کی کتابت کی۔

آخر میں، میں جناب سید غوث صاحب پروپرائٹر اکسل فائن آرٹ کا مشکور ہوں جن کی وجہ سے اس مقالے کی اشاعت مقررہ وقت پر انجام پاسکی

حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد (ڈاکٹر) مرزا اکبر علی بیگ

یکم نومبر ۱۹۷۹ء

تاثرات

مرزا علی لطف دورِ فورٹ ولیم کالج کی ان ادبی شخصیات میں سے ہیں جن پر اب تک پوری توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعرائے اردو کے اولین تذکرے کی حیثیت سے گلشنِ ہند کی اہمیت مسلّم ہے لیکن اب تک اس تذکرے کے جتنے متن سامنے آئے ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل نہیں تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے ان پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان حصوں کی نشان دہی کی ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ پہلی اشاعتوں میں گلشنِ ہند کے کچھ حصے حذف کر دیے گئے تھے اور نمونۂ کلام میں بھی کانٹ چھانٹ کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تمام نسخوں کا موازنہ کرنے کے بعد اس بارے میں نہایت اہم معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس مقالے کے ذریعے مرزا علی لطف کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے، وہ ہے ان کی تخلیقی حیثیت۔ مصنف نے مرزا علی لطف کا دیوان عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں کھوج نکالا ہے۔ اب تک دیوانِ لطف کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ بالعموم لطف کی شعری شخصیت کی تصویر مختلف تذکروں میں حوالے کے طور پر درج کیے گئے چند اشعار کی مدد سے مرتب کی جاتی تھی۔ اس دیوان سے پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ لطف کی بنیادی حیثیت شاعر ہی کی ہے اور ان کا ذہن تخلیقی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے، مثنوی اور رباعیاں بھی، اور غزلوں کا بھی وقیع ذخیرہ دیوان میں موجود ہے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس سارے شعری سرمایے پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور لطف کی خوش گوئی اور سخن آفرینی کی تحسین و قدر کی ہے۔

مقالے کے آغاز میں لطف کی سوانحی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور ان کی شخصیت کو مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اپنی معلومات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اگر ہماری تحقیق نسبتاً غیر معروف ادبی شخصیتوں پر اس طرح توجہ صرف کرے تو ادبی تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی

اردو شاعری کے عہدِ وسطیٰ میں جن شعراء نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں ایک نمایاں شخصیت مرزا علی لطفؔ کی بھی ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی اور دوسری اصنافِ سخن میں اپنے نتائجِ طبع کے علاوہ ایک اہم تذکرہ گلشنِ ہند بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے جس کو اٹھارھویں صدی کے شعر و ادب سے بحث کرنے والا کوئی طالبِ علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، استاد شعبۂ اردو سٹی کالج حیدرآباد نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے لئے مرزا علی لطفؔ کی شخصیت اور تصانیف کو منتخب کیا ہے۔ انھوں نے تمام معلوم مصادر کے علاوہ بعض ایسے مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جن کا ابھی تک پورا استعمال نہیں ہوا تھا۔

فاضل مقالہ نگار نے بہت محنت اور سلیقے کے ساتھ یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اس کی اشاعت سے نہ صرف مرزا علی لطفؔ کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عہدِ متوسطین کی ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہمیں دستیاب ہو جاتی ہے۔

دانش گاہوں کے بہت سے تحقیقی مقالے عموماً سطحی ہوتے ہیں اور چھپوانے سے زیادہ چھپانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ علمی کاوش یقیناً قابلِ قدر اور لائقِ مبارکباد ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
ریڈر، شعبۂ عربی، فیکلٹی آف آرٹس
دہلی یونیورسٹی، دہلی — ۱۱۰۰۰۷

نام :- لطف نے اپنے تذکرے "گلشنِ ہند" میں اپنے نام کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے :-

"لطف تخلّص، مرزا علی نام ۔ راقم ہے اس چند اوراقِ پریشاں کا"[۱]

اس بیان کے پیشِ نظر لطف کے نام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے لیکن بعض تذکروں میں مرزا علی لطف کی بجائے کچھ اور نام لکھے گئے ہیں ۔

تذکرہ "طبقات الشعراء" میں جو "گلشنِ ہند" سے ستائیس برس پہلے لکھا گیا تھا لطف کا نام مرزا علی ہی لکھا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ "مجمع الانتخاب" "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" "خطباتِ گارساں دتاسی" اور بیاضِ سخن" میں بھی یہی نام بتایا گیا ہے ۔

"گلستانِ بے خزاں" میں لطف کا نام مرزا اعالی لکھا ہے[۲] ۔ لیکن فہرست میں میرزا علی ہی چھپا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے ۔ نمونۂ کلام مرزا علی لطف ہی کا دیا گیا ہے ۔

"تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" میں سودا کے شاگردوں کے تحت لطف کا ذکر ہے اور نام لطف علی بیگ بتایا گیا ہے ۔ اس کی عبارت یہ ہے ۔

---

۱ ۔ لطف مرزا علی ۔ گلشنِ ہند ۔ (مرتبہ شبلی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

۲ ۔ باطن، قطب الدین گلستانِ بے خزاں (لکھنؤ ۱۸۷۵ء) ص ۲۰۲

"لطف علی بیگ تخلّص لطف، شاگرد (رفیع) سودا"[1]

اس تذکرے میں صفحہ ۱۷۵ پر ملول کے شاگردوں کے ضمن میں لطف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"خوش فکر اور منتہی، لطف تخلص، نام میرزا علی شاگرد شاہ ملول"[2]

دونوں جگہ پر جو نمونۂ کلام دیا گیا ہے وہ مختلف ہے۔ لطف علی بیگ لطف کے نام سے صرف یہ مقطع دیا ہے جس میں تخلّص بھی ہے لیکن یہ مطلع دیوانِ لطف میں موجود نہیں۔

اس سے کیوں چشمِ مروت تجھے اے یار نہیں
تیرے الطاف کا کیا لطف سزاوار نہیں

یہ شعر چوں کہ دیوان میں موجود نہیں ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ لطف شاگردِ ملول، میرزا علی لطف سے الگ کوئی شخصیت ہے جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے "عمدۂ منتخبہ" میں بھی دو جگہ ذکر آیا ہے ایک جگہ میرزا علی لطف کے نام سے اور دوسری جگہ لطف کو ملول کا شاگرد ظاہر کرتے ہوئے۔ اس تذکرے میں لطف شاگرد ملول کا جو نمونۂ کلام دیا گیا ہے وہ دیوان میں موجود ہے۔ اسی تذکرے میں میرزا علی لطف کے نام سے جو اشعار دئے گئے ہیں وہ "دیوانِ لطف" میں موجود ہیں مثلاً یہ اشعار ص (۹) ب پر ملتے ہیں[3]:-

خاموشی ہماری کے تئیں سحر ہی سمجھو
گو ہم کو لگا لینے کا ڈھب کچھ نہیں معلوم

یہ بھی ہے نئی چھیڑ کہ اوٹھ وصل میں سو بار
پوچھے ہے کہ کتنی رہی شب کچھ نہیں معلوم

۱۔ ناصر، سعادت خاں خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ شمیم انہونوی) لکھنو ۱۹۷۱ء، ص ۳۶

۲۔ ناصر سعادت خاں خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ شمیم انہونوی) لکھنو ۱۹۷۱ء ص ۱۷۵

۳۔ لطف، مرزا علی دیوان منتخب مرزا علی خاں۔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ)

"عمدۂ منتخب" میں مرزا علی لطف کا ذکر دو بار اس طرح آیا ہے گویا دو الگ اشخاص ہیں۔ صفحہ ۵۵۰ پر لطف کے جو حالات لکھے ہیں وہ مرزا علی لطف کے ہیں اور نمونۂ کلام بھی انھیں کا ہے[1]۔ مثلاً یہ شعر ؎

روشن ضمیر کیوں کہ نہ ہو دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

یہ شعر "دیوانِ لطف" میں موجود ہے[2]۔ اس کے بعد ایک اور مقام پر لطف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"لطف تخلص مرزا علی۔ ساکن لکھنو، شاگرد شاہ ملول"[3]

یہاں بھی نمونۂ کلام مرزا علی لطف کا دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیوان میں صفحہ ۱۰ پر ملتا ہے[4]۔

؎ آپ تو بات میں بگڑتے ہیں
واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

صاحب تذکرہ کو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہوا ہے جس کا سبب لطف کو شاگرد ملول بتایا جانا ہے۔ پہلے لطف سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور چند روز ان کا قیام عظیم آباد میں رہا۔ دوسری بار لطف کو شاگرد ملول اور لکھنو کے ساکن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں کسی وجہ سے انھیں دھوکہ ہوا کہ یہ دو مختلف لطف ہیں۔ گارساں دتاسی نے ان کی غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

---

۱۔ سرور، نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر، عمدۂ منتخبہ (تذکرہ سرور) (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) (دہلی ۱۹۶۱ء) ص ۵۵۰۔

۲۔ دیوان منتخب۔ ص ۱۴ (ب)۔

۳۔ عمدۂ منتخبہ۔ ص ۵۵۱۔

۴۔ دیوان منتخب۔ ص ۱۰

"سرور انھیں لکھنو کے مرزا علی لطف سے مختلف
شخص سمجھتے ہیں جو ملول کے شاگرد اور "گلشنِ ہند"
کے مصنّف ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شخصیتیں
ایک ہیں[1] -"

سرور کا لکھنو کے لطف کو دہلی کے لطف سے مختلف سمجھنا تعجب خیز بھی ہے جب کہ انھیں کے ہمعصر تذکرہ نگار شاہ کمال لطف سے لکھنو میں مل چکے ہیں اور ۱۸۰۰ء ہی میں اپنا تذکرہ مکمل کیا تھا جس میں لطف کے حالات بھی لکھے ہیں انھوں نے لطف کو شاگردِ مرزا بتایا ہے[2] -

ایسی ہی غلط فہمی "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" کے مصنف کو ہوئی ہے - لطف کے بارے میں اس طرح کی غلط فہمیوں کا سبب ان کی شاگردی کے بارے میں اختلافات بھی ہیں - کوئی انھیں میر کا شاگرد کوئی سودا کا اور کوئی ملول کا شاگرد بتاتا ہے جبکہ لطف نے صاف لفظوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں -

اس بارے میں مفصل بحث تلمّذ کے تحت ملاحظہ ہو - نام کے بارے میں مستند بیان ظاہر ہے لطف ہی کا ہو سکتا ہے - اس کے لئے مزید دلیل یا توثیق درکار نہیں ہے -

والد : لطف کے آباء و اجداد کا تعلق ایران سے تھا - ان کے والد کاظم بیگ خاں استر آباد کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کی افواج کے ہمراہ فروری ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۲ ہجری ہندوستان آئے تھے -

---

۱- گارساں دتاسی - ہندوستانی دے لالترے تیور ہندوی ایت ہندوستانی (فرانسیسی) پیرس ۱۸۷۰ء ص ۱۳۶

۲- شاہ کمال - تذکرہ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۶۷۹ (ب)

لطف نے اپنے تذکرے گلشنِ ہند میں والد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے[1] ۔
متوطن استر آباد شجاعت بنیاد کے ہیں ۔

نادر شاہ ہندوستان سے ایران لوٹے تو مرزا کاظم بیگ یہیں رہ پڑے جیساکہ لطف نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے وہ اپنے دیرینہ آشنا اور ہم وطن ابوالمنصور خاں

۱۔ یحییٰ تنہا کے تذکرے سیر المصنفین (حصہ اول) میں لطف کے والد کا نام ناظم بیگ لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ سہو کاتب ہو۔

۲۔ لطف مرزا علی ۔ گلشن ہند (مرتبہ شبلی لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

معدودے چند تذکروں اور تواریخ میں استر آباد کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ موجودہ نئے ایران کے نقشے میں "استر آباد" موجود نہیں ہے استر آباد قدیم ایران کا مشہور صوبہ رہ چکا ہے خراساں کی جنوبی اور مغربی حدود کا اکثر حصہ چونکہ سرحدی علاقہ نہیں تھا بلکہ ایران کے دوسرے صوبہ جات سے ملا ہوا تھا۔ اس حصے میں یا تو ایرانی رہتے تھے یا وہ بالکل ہی غیر آباد تھا۔ یہ علاقہ صوبہ استر آباد سے شروع ہوتا تھا جو اس خطہ پر مشتمل تھا جو بحرہ اخضر کے جنوبی و مغربی گوشہ یعنی خلیج استر آباد اور ضلع شاہ رود کے درمیان واقع تھا۔ جن ایک قطعہ زمین جو "گرگان" اور اتریک کی ندیوں کے مابین مشرق کی طرف طول بلد کے خط متوازی تک چلا گیا تھا۔ صوبہ استر آباد میں "استر آباد" ہی کے نام سے ایک شہر تھا جو اس صوبہ کا دار الحکومت تھا۔ اس شہر کی آبادی آٹھ ہزار تھی اور حاکم صوبہ استر آباد اسی شہر میں رہتا تھا۔ استر آباد کی بندرگاہ "بندر گز" تھی جو بیس میل کے فاصلے پر خلیج کے کنارے واقع تھی یہ تمام تفصیلات "خیابانِ فارس" یعنی ترجمہ کتاب "پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن" مصنفہ لارڈ کرزن وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند مترجمہ ظفر علیخاں جلد اول مطبع شمسی (حیدر آباد دکن ۱۹۰۲ء) سے لئے گئے ہیں۔

صفدر جنگ کی وساطت سے دربارِ شاہی میں باریاب ہوئے[1]۔ صفدر جنگ سے ان کے تعلقات ایران ہی سے تھے۔ صفدر جنگ اپنے ماموں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے عہدِ صوبہ داری میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچ چکے تھے اور محمد شاہ کے دربار میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ ابو المنصور خاں صفدر جنگ کا نام مرزا مقیم تھا[2]۔

۱۔ لطف مرزا علی گلشن ہند (مرتبہ شبلی۔ لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۱۶

۲۔ یہ تمام حالات "تاریخ اودھ" (جلد اول) مرتبہ حکیم محمد نجم الغنی خاں رام پوری' نامی مطبع (مراد آباد ۱۹۰۹ء) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ وہ جعفر خاں بیگ کے صاحبزادے تھے۔ مرزا مقیم کو انکے ماموں سعادت خاں برہان الملک نے محمد شاہ کے زمانے میں نیشاپور (ایران) سے ہندوستان بلایا اور اپنی بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم کا عقد ان سے کر دیا۔ برہان الملک کا اثر محمد شاہ پر بہت تھا۔ امور سلطنت میں ان کا بڑا دخل تھا۔ محمد شاہ کے وہ وزیر رہے۔ ۲۷ واسطوں سے ان کا نسب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ برہان الملک کی سفارش پر محمد شاہ نے مرزا محمد مقیم کو "ابو المنصور خاں صفدر جنگ" کا خطاب عطا کیا۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کا بھتیجا شیر جنگ (نثار محمد) اور بھانجے مرزا محمد مقیم (ابو المنصور خاں صفدر جنگ) نے محمد شاہ کے دربار میں عرضیاں بھیجیں کہ برہان الملک کے وارث کی حیثیت یعنی صوبہ داری اودھ کی خدمت پر انکی مسند نشینی کی جائے۔ محمد شاہ نے نادر شاہ سے مشورہ کیا۔ نادر شاہ نے صفدر جنگ کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ صفدر جنگ صوبہ اودھ کی صوبہ داری پر فائز ہوئے۔ عمدۃ الملک کی تحریک سے صفدر جنگ کو صوبہ داری سے محمد شاہ بادشاہ نے دہلی بلا لیا۔ ۱۱۵۰ ہجری / ۱۷۴۴ء کو صفدر جنگ توپ خانہ کی افسری (میر آتش) اور کشمیر کی صوبہ داری کی خدمت کا خلعت دیا گیا۔

مرزا علی لطف نے دربارِ دہلی سے اپنے والد کے تعلق کے بارے میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ :-

"مقدرِ عنایاتِ بادشاہی ہوئے - اب آگے بیان اموراتِ دنیوی باعث ہے طولِ کلام کا اور وہ معاملہ ہے دیکھا ہوا خاص و عام کا۔"[1]

اس بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ دربار میں کس عہدے پر فائز رہے - ہو سکتا ہے کہ بحیثیت شاعر بادشاہ کے زمرۂ مصاحبین و مقربین میں شامل رہے ہوں -

لطف کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کاظم بیگ خاں فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے "غزل فارسی کہنے میں حضرت کو یدِ طولیٰ تھا"[2]

وہ ہجری تخلّص کرتے تھے -

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے شاہ کمال کے تذکرہ "مجمع الانتخاب" کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ وہ آصف الدولہ کے عہد میں عرصہ تک لکھنؤ میں رہے - چنانچہ شاہ کمال مرتب تذکرہ "مجمع الانتخاب" نے اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے (۱۱۹۰ ہجری / مطابق ۱۷۷۶ء) تا ۱۲۱۴ ہجری مطابق ۱۸۰۰ء) میں ان سے ملاقات کی تھی۔[3] اسی بنیاد پر انھوں نے آگے چل کر لطف کے ترکِ وطن کے سلسلے میں تحریر کیا ہے کہ " آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد ہی لطف اور ان کے والد دونوں لکھنؤ چلے گئے۔"[4]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کو شاہ کمال کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے -

شاہ کمال لکھتے ہیں :-

۱- لطف - "گلشنِ ہند" (مرتبہ شبلی - لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

۲- لطف - "گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی - لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۷

۳- حیاتِ لطف - (حیدرآباد دکن - ۱۹۶۲ء) ص ۳

۴- حیاتِ لطف - (حیدرآباد دکن - ۱۹۶۲ء) ص ۸

"مرزا علی خاں صاحب لطف تخلص شاگرد رشید مرزا صاحب قبلہ
مرزا کاظم بیگ خاں مرحوم و مغفور کے والد مرزائی موصوف بودند ہجری
تخلص می فرمودند، جوانِ خوش فکر و خوش مزاج و عمدہ معاش و
در نظم و نثر یکتائے روزگار است و ایں فقیر از لکھنو واقف
چنانچہ یک بار بدولت خانہ مرزا صاحب معزالیہ بتقریب
دیدن کبوتران "نیلہ بھورا کہ در قدو قامت تمام شہر اشتہار داشتند
ہمراہ مرزا مغل شاگردِ میاں جرأت صاحب نیز رفتہ ملاقات ساختہ بود"[۱]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ کمال نے لکھنؤ میں مرزا علی لطف سے ملاقات کی تھی نہ کہ اُن کے والد سے۔ کیوں کہ شاہ کمال نے اُن کے والد کو اپنی عبارت میں مرحوم و مغفور لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ کمال سے ملاقات کے وقت مرزا علی لطف کے والد مرزا کاظم بیگ کا انتقال ہو چکا تھا۔

مرزا علی لطف کے دو بھائی تھے۔ مرزا علی رضا اور حاجی مرزا جان دونوں اپنے زمانے کے مشہور سوز خواں تھے[۲]۔ علی رضا شاعر بھی تھے رضا تخلص کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ رضا نواب ارسطو جاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ "مجموعہ فصاحت" میں ان کا ایک فارسی قصیدہ اور دو اردو قصیدے درج ہیں جو انھوں نے نواب ارسطو جاہ کی مداح میں لکھے تھے۔ اس کے علاوہ چند فارسی قطعات بھی شامل ہیں[۳]۔

اردو قصیدوں کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۶۷۸

۲۔ غلام حسین جوہر گلزار آصفیہ (حیدرآباد ۱۸۵۴ء) ص ۴۵۰

۳۔ شاہ علی تجلی مجموعہ فصاحت (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۱۲۹(۱)

نام نواب اعظم الامرا　　ہے منوّر مثال بدرِ منیر
سیکھ جاوے یہاں ارسطو بھی　　علم و حکمت فراست و تدبیر
لے کے مشرق سے تا بہ مغرب تک　　ہیں زمانہ میں بے عدیل و نظیر
دستِ قدرت سے حق نے کھینچا ہے　　کرم و جود و فیض کی تصویر
ہو جدھر چشمِ مرحمت کی نظر　　فیض کو پہنچے کیا صغیر و کبیر!
مگر اک رہ گیا قدیمو نہیں　　فدوی بے گناہ و بے تقصیر
ہوں میں حضرت کا مدح خوانِ قدیم　　جانتے ہیں سبھی غریب و امیر
شعرائے جدید پا دیں صلہ　　ہو گئی پالکی کسے جاگیر
ہے یہ مقصد میرا سو بر آوے　　خدمتِ پالکی معہ جاگیر
تا رضا پالکی پہ ہو کہ سوار　　کرے دیوانِ مدح میں تسطیر

نواب ارسطو جاہ نے اپنے محل میں ایک حوض تعمیر کیا تھا اس موقع پر رضا نے چند قطعات تاریخ تحریر کئے تھے۔

آستانہ رفیع و حوض وسیع
کرد بنیاد ذاتِ بابرکات
خضر فرمود سالِ تاریخش
بے شبہ ایں نشانِ آبِ حیات[1]
عجب حوضی مثال آب حیواں
بدایوں خانہ نوّابِ مرجع
سر آتش فرد نم بہر تاریخ
خرد گفتار عجب حوض مربع[2]

۱۔ شاہ علی تجلی۔ مجموعۂ فصاحت (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۱۲۸
۲۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص ۱۲۸

مشیر الملک وزیر جناب آصف جاہ

بنا نمود عجب بارگاہِ عالی شان

بلند کرسی و حوض کلاں چار محل

رواق و شقف منقش ز کاک نقاشاں

رواق ہائے رفیع و مکان ہائے وسیع

عجب حریم و عجب حوض و نہر آبِ رواں

بنائے سال رضا از خرد چو پرسیدم

ز انبساط بفرمود حوضِ والا شان[۱]

رضا نے نوحے اور مرثیے بھی لکھے تھے ایک قدیم بیاض میں رضا کا حسب ذیل نوحہ دستیاب ہوا ہے۔

آج شبیر کا اے اہل عزا چہلم ہے

روتے ہیں حور و ملک ارض و سما چہلم ہے

مضطرب ہووے نہ کیوں خاک پہ غم سے لوٹیں

رخصتِ صبر و تحمل ہے رضا چہلم ہے[۲]

بعض تذکروں[۳] اور قدیم بیاضوں[۴] میں رضا کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے بھی اچھے شاعر تھے ان کی دو غزلوں کے چند اشعار نمونۂ کلام کے طور پر پیش ہیں:۔

۱۔ شاہ علی تجلی۔ مجموعہ فصاحت (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۱۲۸

۲۔ بیاض کلام شعرا (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۱۲۹

۳۔ عمدۂ منتخبہ۔ مجمع الانتخاب (قلمی مجموعۂ فصاحت (قلمی) یادگارِ ضیغم (قلمی) داخلہ نشان ۷۹ھ۔

۴۔ بیاض کلام شعراء (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) داخلہ نشان ۵۰۴۔ ۴۲۲۔

ہم آپ پریشان ہیں دلبر کا خدا حافظ
دل زلف میں جا الجھا ابر کا خدا حافظ

پوروں سے لگا مہندی مژگاں سے ذبح کرنا
ہم کو تو شہادت ہے خنجر کا خدا حافظ

بازارِ محبت میں اے سیم تناں تم سے
زردار کا سودا ہے بے زر کا خدا حافظ

اس ہجر کی آتش سے کہتا ہے رضا جل کر
دنیا تو گزرتی ہے محشر کا خدا حافظ

وہ صفائی نہیں جو پہلی ملاقات میں تھی
صاف کل ساختگی اس کی ہر اک بات میں تھی

بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے
یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

دیکھیں تو آ کے اٹھاتا ہے کون ہمیں
اب تو در پر تیرے ہم مرنے کو ہی بیٹھے ہیں

میں بے وفا جو کہوں یار کو سو بیجا ہے
میرے نصیب میں یہ مدعا نہ ہونا تھا

مرزا علی لطف کے دوسرے بھائی حاجی مرزا جان کے حالات کا علم نہ ہو سکا غلام حسین جوہر کے بیان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ چوروں نے انھیں قتل کر دیا تھا۔[1]

پیدائش ۔ لطف کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ خود لطف نے

۱۔ گلزار آصفیہ۔ ص ۴۵۰

اپنے تذکرہ یا کسی تصنیف میں اپنی تاریخِ پیدائش نہیں لکھی ۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے قدرت اللہ شوق کے تذکرے کو سند مانتے ہوئے مرزا علی لطف کے سنہ ولادت کے تعین کی کوشش کی ہے ۔ قدرت اللہ شوق نے اپنا تذکرہ طبقات الشعراء ۱۱۸۸ھ / مطابق ۱۷۷۴ء میں لکھا ۔ اس تذکرے میں شوق نے لطف کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی مثنوی کا بھی ۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکھتی ہیں :۔

> " اس لحاظ سے اگر اس تصنیف کے زمانے میں ان کی (لطف کی) عمر کم سے کم انیس، بیس برس فرض کی جائے تو ان کا سنہ ولادت ۱۱۶۸ھ ہجری کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔"[۱]

لطف کا سنہ پیدائش ۱۱۶۸ ہجری کے بجائے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے مثنوی کے وقت لطف کی عمر انیس بیس ہوگی اس کا کوئی ٹھوس ثبوت ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے فراہم نہیں کیا ہے ۔ محض قیاس آرائی کی بنا پر سنہ ولادت کا تعیّن کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے لکھا ہے کہ

> " مرزا علی لطف کی پیدائش دار السلطنت دلّی میں غالباً ۱۷۶۰ء اور ۶۴ ۱۷ء کے درمیان ہوئی کیوں کہ جس وقت کلکتے آئے ان کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی ۔"[۲]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی طرح ڈاکٹر جاوید نہال نے بھی محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کیا ہے جس کی بناء پر یہ تسلیم کیا جائے کہ جس وقت وہ کلکتہ آئے ان کی عمر لگ بھگ چالیس برس کی تھی ۔

۱۔ ثمینہ شوکت، ڈاکٹر ۔ حیاتِ لطف (حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۴

۲۔ جاوید نہال، ڈاکٹر ۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۳

ڈاکٹر جاوید نہال مزید لکھتے ہیں :۔

"اس عہد کے اکثر فارسی تذکروں میں مرزا علی لطف کا حال مل جاتا ہے لیکن تمام تذکرے ان کے سنہ پیدائش سے خالی ہیں[1] ۔"

اس بیان کی روشنی میں ڈاکٹر جاوید نہال نے کس ثبوت کی مدد سے لطف کی سنہ پیدائش مقرر کی تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید نہال کی طرح قاضی عبدالودود بھی قیاس آرائی سے نہیں چوکتے وہ لکھتے ہیں :۔

"پیدائش کہیں کی ہو "صغر سن" سے مقیم لکھنو ضرور تھے ۔قیاس ہے کہ ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے[2]۔"

ان قیاس آرائیوں کے سوا تلاش و تخلیق کے باوجود راقم الحروف کو ایسا مواد دستیاب نہیں ہو سکا جس سے لطف کی تاریخِ پیدائش کا قطعی طور پر تعین ہو سکے ۔

مولد لطف نے تذکرے میں اپنے مولد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا لیکن اپنے خاندان کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد نے شاہ جہاں آباد دہلی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور دربار سے متوسل ہو گئے تھے[3]۔ اس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ لطف دہلی میں پیدا ہوئے ہوں گے ۔ چنانچہ اکثر تذکرہ نگاروں نے دہلی کو لطف کا مولد قرار دیا ہے ۔

۱۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۳
۲۔ قاضی عبدالودود "عبدالحق بحیثیت محقق" معاصر ۱۰ ہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۳۶
۳۔ گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی ۔ لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

سرور اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"مولد و منشا مرزا علی موصوف دارالخلافہ"[1]

شیفتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف کی عمر کا ابتدائی زمانہ دہلی میں ہی بسر ہوا۔ چنانچہ شیفتہ لکھتے ہیں :۔

"در دہلی نشوونما یافتہ"[2]

شیفتہ کی تقلید کرتے ہوئے، عبدالجبار خاں ملکاپوری' لطف کی ولادت اور نشوونما کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔ "آپ کی ولادت دلّی میں ہوئی اور نشوونما بھی دلّی ہی میں ہوئی"۔[3]

تعلیم و تربیت: مرزا علی لطف کی استعداد علمی کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ مختلف تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لطف کی تعلیم و تربیت دہلی ہی میں ہوئی۔[4]

لطف نے مختلف علماء سے استفادہ کیا اور علوم متداولہ کی تکمیل کی اور بقول عبدالجبار ملکاپوری "علامہ دہر منتہائے عصر ہوئے"۔[5]

غلام حسین جوہر لکھتے ہیں :۔

"عربی، فارسی اور ہندی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی"[6]

لطف کے اساتذہ کے نام تذکروں میں نہیں دئے گئے ہیں۔ لطف کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ لطف نے فارسی کی تحصیل انھیں سے کی اور اپنے فارسی کلام پر والد ہی سے اصلاح لی تھی۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :۔

۱۔ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی) ص ۵۵۔

۲۔ گلشن بے خار (لکھنو۔ ۱۸۳۵ء) ص ۱۶۷

۳۔ محبوب الزمن (حصہ دوم) (حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۱

۴۔ سخن الشعراء۔ (گلستان بے خزاں۔ یادگار ضیغم وغیرہ۔

۵۔ محبوب الزمن (حصہ دوم) (حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۱

۶۔ گلزار آصفیہ (حیدرآباد دکن ۱۳۰۸ ہجری) ص ۴۵۰۔

اصلاح فارسی کی اس ہیچ مندان کو آپ ہی کی جناب (مرزا کاظم بیگ خاں ہجری) سے ہے[1]۔ اس زمانے کے علماء سے تحصیل علم کرنے کے بارے میں مولوی محمد منورؔ صاحب بہادر گوہر لکھتے ہیں :۔

" اپنے زمانے کے علماء سے تحصیل علم کرکے فاضل یکتا اور شاعر غرّا ہوئے"[2]

شعرگوئی کی ابتدا: مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ "گلشن ہند" میں اپنی شعرگوئی کی ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ :۔

"عالم شباب میں علماء کی خدمت میں کتب درسیہ علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ شعروشاعری کا شوق ہوا۔ فارسی و اردو میں کلام موزوں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ استادی کے درجے کو پہنچے"[3]۔

لطف کی ابتدائی تعلیم و تربیت دلّی میں ہوئی۔ شعروادب کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد کاظم بیگ خاں ہجری کا شمار اس زمانے کے مشہور فارسی گوشعرا میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں دلّی شعروشاعری کا مرکز بنا ہوا تھا یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ اردو شاعری کا زرین عہد تھا۔ دبستانِ دلّی کے مشہور شعرا میر تقی میر۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ میر محمد سوز کے اشعار خاص و عام کی زبان پر تھے۔ آئے دن مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ گمان اغلب ہے کہ لطف نے اپنی نوجوانی میں دلّی کے ان مشاعروں میں شرکت کی ہوگی۔

تلمّذ: لطف کے تلمّذ کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض تذکرہ نگار انھیں سودا کا شاگرد بتاتے ہیں، بعض ملول کا اور بعض تذکرہ نگاروں نے لطف کو میر کا شاگرد لکھا ہے۔

ان مختلف بیانات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس بارے میں لطف

۱۔ گلشن ہند۔ ص ۱۴۷

۲۔ سخوران بلند فکر۔ (مدراس ۱۹۳۶ء) ص ۲۰۴

۳۔ محبوب الزمن (حصّہ دوم۔ حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۱

کا بیان دیکھتے چلیں ۔ لطف لکھتے ہیں :۔

"اصلاح فارسی کی اس ہیچ مندان کو آپ ہی (مرزا کاظم بیگ ہجری) کی جناب سے ہے"[1]۔

جہاں تک میر اور سودا کی شاگردی کا تعلق ہے بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ لطف ان سے انکار کریں ۔ میر یا سودا کا شاگرد کہلانا ان کے لئے باعثِ افتخار ہو سکتا تھا ۔ اس لئے قیاس اغلب ہے کہ کسی خاص مصلحت کی بناء پر انھوں نے خود کو میر یا سودا کا شاگرد ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو ۔

شیفتہ نے لطف کو میر کا شاگرد بتایا ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"نسبتِ شاگردی بمیر تقی داشتہ"[2]۔

گارسانِ ڈی تاسی بھی شیفتہ کے ہم خیال نظر آتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"ہندوستان کے روحانی ادیب مرزا علی لطف گرگان میں استر آباد کے باشندے کاظم بیگ خاں کے فرزند . . . . نے ہندوستانی (اردو) زبان اختیار کی اور میر تقی کی شاگردی کی"[3]۔

محمد حسین خاں[4] اور احمد حسین سحر[5] بھی شیفتہ اور گارسان ڈی تاسی کی طرح لطف کو میر کا شاگرد ہی لکھتے ہیں ۔

ایک بات جو قطعی طور سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ لطف کو میر سے تلمذ حاصل نہیں رہا ۔

۱۔ گلشنِ ہند ۔ (لاہور سنہ ١٩٠٦ء) ص ١٢٦

۲۔ گلشنِ بے خار ۔ (لکھنو سنہ ١٨٣٥ء) ص ١٦٧

۳۔ تاریخ ہندوستانی اور ہندوستانی ادب (فرانسیسی) فرانس ١٨٧٠ء جلد دوم ص ٢٣٦

۴۔ تذکرہ ریاض الفردوس (ترتیب حواشی مرتضیٰ حسین فاضل) (لکھنو ١٨٦٧ء) ص ١٢٤

۵۔ بہارِ بے خزاں (بہ تصحیح ڈاکٹر نعیم احمد) دہلی ١٩٦٨ء) ص ٨٣

لطف نے جب اپنا تذکرہ لکھا میر زندہ تھے اور لطف نے اپنے تذکرہ میں میر کا جو حال لکھا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لطف میر کے قریب رہ چکے تھے اور حیدر آباد آنے کے بعد بھی ان کے حالات سے باخبر تھے۔ اس امکان کے پیشِ نظر کہ ان کا تذکرہ میر کی نظر سے گزرے گا وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے تھے اور اگر وہ میر کے شاگرد ہوتے تو اس کا اظہار ضرور کرتے۔

تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے انہیں سودا کا شاگرد قرار دیا ہے۔ ان میں خوب چند ذکا اور شاہ کمال شامل ہیں جن کے بیانات کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔

خوب چند ذکا نے لطف کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

"مرزا علی لطف دی شخصی مغل زادہست۔ ساکن بلدۂ لکھنو از مرزا محمد رفیع سودا اصلاح یافتہ"[۱]

شاہ کمال لکھنو میں لطف سے مل چکے تھے اور حیدر آباد میں بھی لطف کے ساتھ رہے وہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا علی خاں لطف شاگرد رشید مرزا صاحب قبلہ"[۲]

ان کے علاوہ قاسم[۳]، ناصر[۴]، نساخ[۵] اور حسرت موہانی[۶] وغیرہ نے بھی انھیں سودا کا شاگرد لکھا ہے۔

عشق نے سودا کے شاگرد ہونے کا ذکر دوسری طرح کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

۱۔ نیاز الشعرا ۔ (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم) ص ۱۳۷۔ اس عبارت کی نقل ڈاکٹر عبدالحق استاد اردو دہلی یونیورسٹی۔ دہلی نے عنایت فرمائی۔ ص ۱۳۷

۲۔ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری۔ ص ۶۷۹ (ب)

۳۔ مجموعۂ نغز ص ۱۴۸۔

۴۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔ ص ۳۶۔

۵۔ سخن الشعراء ۔ ص ۴۰۵۔

۶۔ مرزا علی لطف ۔ اردوئے معلی (علی گڑھ اگست ۱۹۱۰) ص ۳

"ازیں جہت خود را بہ شاگردی مرزا متہم کردہ"[۱]۔

گویا لطف حقیقت میں سودا کے شاگرد نہیں تھے لیکن خود کو شاگرد ظاہر کرتے تھے۔ عشقی کے اس بیان سے کسی قدر یہ معمّہ حل ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ لطف یا تو حقیقت میں سودا کے شاگرد تھے اور یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔ پھر کچھ بات ایسی ہوئی کہ انھوں نے خود کو کسی کا شاگرد ظاہر کرنا پسند نہیں کیا۔ جیسا کہ قاضی عبدالودود کا خیال ہے:۔

"اُس کا امکان ہے کہ لطف نے کسی زمانے میں مشہور کر رکھا ہو کہ انھوں نے سودا سے اصلاح لی تھی لیکن بعد کو اس امر واقعی کا اعلان کر دیا ہو کہ کسی کے شاگرد نہیں"[۲]۔

لطف نے جب تذکرہ لکھا سودا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت لطف نے شاگردی سے انکار کیا تو کم از سودا کے سامنے جواب دہ ہونے کا انھیں خوف نہیں رہا تھا ڈاکٹر خلیق انجم بھی اس خیال کے حامی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں سودا کے ۳۶ شاگردوں کی طویل فہرست دی ہے۔ لطف کے حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے لطف کے تلمّذ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطف کو سودا سے تلمّذ تھا لیکن بعد میں ان کی شاگردی سے وہ منکر ہو گئے"[۳]۔

ایک قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ لطف حقیقت میں سودا کے شاگرد نہ رہے ہوں سودا کا انتقال ہو چکا تھا اور انھوں نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے خود کو مستند شاعر ظاہر کرنے کی غرض سے یہ مشہور کر دیا کہ سودا سے نسبت تلمّذ حاصل رہی ہے اور بعد ازاں تذکرہ لکھتے وقت

۱۔ تذکرہ عشقی۔ (مرتبہ کلیم الدین احمد پٹنہ ۱۹۶۳ء) ص ۱۷۷

۲۔ عبدالحق بحیثیت محقق معاصر سالہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۳۱

۳۔ مرزا محمد رفیع سودا (دہلی ۱۹۶۶ء) ص ۵۹۱

جو حقیقت تھی اسے ظاہر کردیا ہو۔

لطف ملول کے شاگرد یقیناً نہیں تھے۔ ایسا ہوتا تو وہ تذکرہ میں اس کا اظہار ضرور کرتے۔ شاہ ملول فارسی کے شاعر تھے اردو میں بھی وہ شعر کہا کرتے تھے۔ پہلے ان کا تخلّص ملول تھا۔ بعد میں انھوں نے الہام تخلّص اختیار کیا۔ لطف نے الہام ہی کے تخلّص کے تحت ان کے حالات اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ یہ غلط فہمی کہ لطف ملول کے شاگرد تھے غالباً اس بناء پر ہوئی کہ لکھنؤ میں ان کی نشست و برخواست زیادہ تر ملول کے ہاں رہا کرتی تھی اور جیسا کہ لطف نے لکھا ہے کہ بیشتر اہلِ لکھنو کو شاگردی کے سوائے ان سے اعتقاد تمام ہے۔ اس اعتقاد کی بناء پر لطف کو بھی ملول کا شاگرد سمجھ لیا گیا ہو۔

ترکِ وطن ۔ لکھنو کو روانگی

لطف کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ نادر شاہ کے حملوں کے بعد جب دہلی تباہ و تاراج ہوگئی تو اکثر اہلِ کمال ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ لطف نے اپنے تذکرہ "گلشنِ ہند" میں اپنے قیام دہلی اور ترکِ وطن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس کے برعکس ان حالات پر کس حد تک روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے دہلی کے اکثر شعراء دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے حالات بہت خراب تھے ہر طرف بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ سلاطینِ مغلیہ بالکل کمزور ہو چکے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سلطنت کے بارے میں یہ ضرب المثل خاص و عام کی زبان پر تھی "سلطنتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم"۔ جب بادشاہ کمزور ہو جاتا ہے تو امراء و اعلیٰ عہدہ دار سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دہلی کے امراء و اعلیٰ عہدہ داروں کا ہوا۔ بادشاہ امراء و اعلیٰ عہدہ داروں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انگریز اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لئے ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں خاص و عام پریشان تھے۔ ظاہر ہے کہ لطف بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غالباً ان اسباب کی بناء پر لطف دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ

پروفیسر سید محمد لکھتے ہیں :-

"لطف دہلی کی تباہی کے بعد ایک عرصہ تک دہلی میں رہے۔ بالآخران کو آوارہ وطن ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں لکھنو اور حیدرآباد ہی دو ایسے علم وفن اور دولت وحکومت کے مرکز تھے۔ جو کوئی دہلی سے نکلتا ان ہی دو مقاموں میں سے کسی ایک کا رُخ کرتا۔"[1]

ترکِ وطن کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی وہ کم عمر تھے کہ ان کے والد کاظم بیگ خاں ہجری کا انتقال ہوگیا اور وہ بے سہارا ہو گئے مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ :-

"والد کے انتقال کرنے پر لطف نے سیاحی اختیار کی"[2]

نواب آصف الدولہ نے قدیم خاندانی مراسم کی بناء پر لطف کو اپنے پاس بلالیا اور اپنے زمرۂ ملازمین میں داخل کرکے گزر بسر کے لئے کچھ مشاہرہ مقرر کردیا۔ اس قیاس کو لطف کے بیان سے تقویت پہنچتی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد وامتیاز تھا۔"[3]

لطف جب لکھنو پہنچے ہیں تو ان کی صغر سنی کا زمانہ تھا لیکن چوں کہ ان کی تاریخ پیدائش کا ہم کو علم نہیں ہے اس لئے یہ بات قطعی طور سے نہیں کہی جاسکتی کہ وہ کس سنہ میں دہلی سے لکھنو روانہ ہوئے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ایک تخمینی سنہ ۱۱۸۷ھ (مطابق ۷۳-۱۷۷۲ء) متعین کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں :-

---

۱۔ ارباب نثر اردو (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۷ء) ص ۱۲۸

۲۔ "مرزا علی لطف" اردوئے معلی (علی گڑھ اگست سنہ ۱۹۱۰ء) ص ۳

۳۔ گلشنِ ہند۔ ص ۱۴

"علی لطف کا قیام دہلی میں واقعتاً کس سنہ تک رہا اس کا حوالہ ہم کو کسی تذکرہ سے نہیں ملتا۔ اس سلسلہ میں بھی واقعاتی شہادتوں سے مدد لے کر ان کو دہلی سے روانہ ہونے کے ایک تخمینی سنہ کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ سنہ ۱۱۸۷ ہجری (۱۷۷۳ء) تک دہلی میں مقیم رہے اور اس کے بعد وہ لکھنو گئے۔ ہمارے اس قیاس کی بنیاد خود لطف کے بعض بیانات ہیں۔ "گلشنِ ہند" میں انھوں نے اپنے زمانے کے بعض مشاہیر شعراء کے حالات جو دہلی سے لکھنو آئے نہیں لکھے ہیں۔ چنانچہ میر قمرالدین خاں منّت کے حالات میں لکھتے کہ "۱۱۹۱ ہجری (مطابق ۱۷۷۷ء) میں وہ دہلی سے لکھنو آئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لطف لکھنو آ چکے تھے۔ لیکن آخر وہ کس سنہ میں لکھنو آئے اس کے مزید تعین میں ہم کو لطف کے اس بیان سے مدد ملتی ہے جس میں انھوں نے آصف الدولہ سے اپنے توسل کا ذکر کیا ہے.... ان کے (لطف کے) دہلی سے نکلنے کے اسباب میں سے ایک سبب تو دہلی کی تباہی تھی۔ لیکن اس کا سب سے اہم سبب نواب آصف الدولہ سے ان کے خاندانی مراسم تھے۔ ان واقعات کے مدِنظر ہم ان کو لکھنو جانے کا ایک تخمینی ۱۱۸۷ ہجری (مطابق ۱۷۷۳ء) متعین کرسکتے ہیں[1]۔"

اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ لطف کے لکھنو جانے کا تخمینی سنہ ۱۱۸۷ء کیوں قرار دیا جائے۔ پیش کردہ شواہد سے صرف اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ۱۱۹۱ ہجری (مطابق ۱۷۷۷ء) سے قبل لکھنو جا چکے تھے کیوں کہ جب قمرالدین خاں منّت لکھنو پہنچے ہیں لطف وہاں پہلے

۱۔ حیاتِ لطف (حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۸

ہی سے موجود تھے۔

میسر کے بیان میں لطف ۱۱۹۷ہجری / ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ میں اپنے قیام کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ لطف لکھتے ہیں:۔

"جب مرزا رفیع سودا بلدہ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ فانی کو سدھارے تو میر مذکور شاہ جہاں آباد میں تھے ۱۱۹۷ ہجری (مطابق ۱۷۸۳ء) میں رایاتِ عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے"۔[1]

لطف نے لکھنؤ کا ادبی ماحول اور صحبتیں بھی دیکھی ہیں دہلی کی تباہی کے بعد وہاں سے جن سربرآوردہ شعراء نے لکھنؤ کا رُخ کیا اُن میں سودا، میر، سوز، مصحفی۔ منّت۔ افسوس وغیرہ قابل ذکر ہیں یہ تمام شعراء لطف کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہمعصر رہے ہیں۔ لطف کے خیال میں قصیدہ سودا پر ختم ہوا ہے میر کو وہ غزل میں صدرنشین بارگاہ سخندانی قرار دیتے ہیں اکثر شعراء سے لطف کے گہرے مراسم تھے۔ اردو شاعری کی بزم جو دہلی میں قائم تھی وہ لکھنؤ میں قائم ہو گئی ایک علیحدہ دبستانِ شاعری کا قیام عمل میں آیا جو "دبستان لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہوا۔ سودا، میر، سوز، مصحفی، منّت، افسوس کی شاعری کی ابتدا تو دہلی سے ہوئی مگر ان سب کی شاعری کا عروج لکھنؤ میں ہوا۔ دہلی کے شعراء کے ہاں تصوّف کے مسائل نظم ہوتے تھے ان کا عشق حقیقی ہوتا تھا لکھنؤ والوں نے عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی کو ترجیح دی۔ فارغ البالی ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کے شعراء کے ہاں تعیش پسندی کا رنگ بھی نظر آنے لگا میر، سودا نے پھر بھی دبستانِ دہلی کی مکمل نمائندگی کی مگر دوسرے شعراء جو دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوئے تھے رفتہ رفتہ ان کی شاعری پر لکھنؤ کا رنگ چڑھنے لگا۔

بانیٔ سلطنت اودھ نواب سعادت خاں برہان الملک نے اپنی تمام تر توجہ سلطنت کے استحکام میں صرف کی ان کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ نے شعراء کی بڑی سرپرستی کی۔ شجاع الدولہ

۱۔ گلشنِ ہند ص ۱۵۳

129988

کے بعد ان کے بیٹے آصف الدولہ تخت نشیں ہوئے وہ خود شاعر تھے اور آصف تخلص کرتے تھے انھوں نے شعراء کی بڑی سرپرستی کی وہ اپنے دربار میں مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے۔ جس میں بڑے بڑے شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔

مرزا علی لطف صغر سنی ہی سے آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ آصف الدولہ کے دربار میں لطف اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ آصف الدولہ نے لطف کی بڑی سرپرستی کی ان کی اس قدردانی کی بناء پر لطف کو "افراطِ عنایت" اور "الطاف" نصیب ہوا عجیب بات ہے کہ لطف کی سرپرستی آصف الدولہ نے کی جب کہ لطف کے والد مرزا کاظم بیگ خاں ہجری کی سرپرستی آصف الدولہ کے دادا نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نے کی تھی۔ ان دیرینہ تعلقات کی بناء پر لطف نے آصف الدّولہ کے دورِ مسندِ وزارت میں لکھنو ہی میں قیام کیا۔ آصف الدّولہ نے ۱۲۱۲ ہجری (مطابق ۱۷۹۸ء) میں انتقال کیا۔

آصف الدولہ کی وفات پر لطف نے ایک پُر اثر قطعہ بھی لکھا ہے جو ان کے دلی جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے لطف لکھتے ہیں۔

آصف الدّولہ جب جہاں سے گیا
ایک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا ہوتے ہی لبریز
خالی سب عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتش غم سے
دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کیے
خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

بولے یوں دور کر کے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا ۱۲۰۶ھ
۱۲ ۱۲

لکھنؤ میں لطف کے ۱۱۹۸ہجری / ۱۷۸۴ء میں قیام کا ثبوت ان کے مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم کے سلسلے کے بیان میں ملتا ہے۔ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ شاہ دہلی کمزور ہو چکا تھا اور امراء و اعلیٰ عہدہ دار سازشوں میں مصروف تھے۔ ولی عہد سلطنت جہاندار شاہ نے حالات کی ناموافقت کی بناء پر نقلِ مقام کو ترجیح دی۔ لکھنو دہلی سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنت دہلی کے حدود میں شامل تھا اور صوبہ اودھ کا مستقر تھا۔ حاکمِ اودھ " وزیر سلطنت " کہلاتا تھا۔ جہاندار شاہ کے نواب آصف الدولہ سے دیرینہ تعلقات بھی تھے۔ اس بناء پر وہ ۱۱۹۸ہجری (مطابق ۱۷۸۴ء) میں لکھنو پہنچے۔ نواب آصف الدولہ نے جہاندار شاہ کا ولی عہدِ سلطنت کی حیثیت سے بہت ہی پُرجوش استقبال کیا۔ حسب مراتب آداب سے پیش آئے گھنٹوں ہاتھ باندھے وہ جہاندار شاہ کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جہاندار شاہ خود شاعر تھے جہاندار تخلّص کرتے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔ لکھنو آنے کے بعد انھوں نے مہینے میں دو بار اپنے ہاں مشاعرے کی بناء ڈالی۔ جس میں لکھنو کے سربرآوردہ شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ جہاندار شاہ ہر شاعر کے گھر پر اپنے چوبدار کو بھیج کر مشاعرے میں شرکت کی دعوت دیا کرتے تھے۔ چنانچہ لطف کے گھر پر بھی چوبدار بھیج کر ان سے مشاعرے میں شرکت کی خواہش کی۔ جہاندار شاہؔ لطف سے یا تو ان کے قیام دلی سے واقف تھے یا لکھنو آنے کے بعد ان کی شہرت سنی اور ان سے ملاقات کے خواہش مند ہوئے۔ اس زمانے میں شاعروں کی حالت بہت ابتر تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر پر کیچڑ اچھالنے لگا تھا اور مناظرہ بازی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لطف سنجیدہ مزاج اور ستھرے ذوق کے تھے اس لئے وہ ان باتوں کو پسند

نہیں کرتے تھے اس لئے انھوں نے مشاعرے میں شرکت سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی اور دن خدمت میں حاضر ہو جائیں گے جہاندار شاہ نے لطف کی معذرت کو قبول نہیں کیا دوبارہ چوبدار کو بھیجا کہ ان کا مشاعرے میں آنا ضروری ہے۔ مناظرہ بازی کا دستور ہمارے مشاعروں میں نہیں ہے[۱]۔ اس اصرار کے باوجود لطف جہاندار شاہ کے مشاعرے میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن نواب آصف الدولہ نے لطف کو مجبور کیا کہ وہ مشاعرے میں شرکت کریں چنانچہ لطف کہتے ہیں۔

"غرض ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا۔ مکرر غزلیں اس دن تفصیلات سے پڑھوائیں اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں فرمائیں پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا اور سامعین کو مورد عنایت و امداد فرمایا[۲]"

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کی ایما سے وہ جہاندار شاہ جہاندار کے دائرہ ملازمت بں داخل ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں لطف کا قیام آصف الدولہ کی وفات ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۹۸-۱۷۹۷ تک مسلسل نہیں رہا اس سلسلے میں قدرت اللہ شوق نے لطف کے بیان میں لکھا ہے کہ :-

"اکثر اوقات در بلدہ لکھنؤ اقامت دارد[۳]"

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لطف لکھنؤ میں مسلسل اقامت گزیں نہیں رہے بلکہ وہ لکھنؤ سے باہر دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کرتے رہے۔ لکھنؤ کو انھوں نے ایک طرح سے اپنا مستقر بنا لیا تھا اور چوں کہ آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے اس لئے زیادہ تر ان کا قیام لکھنؤ میں رہتا تھا۔ غالباً نواب آصف الدولہ کے دربار میں حاضری کی پابندی نہیں تھی

۱۔ گلشن ہند۔ ص ۷۲
۲۔ گلشن ہند۔ ص ۷۲
۳۔ طبقات الشعرا (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۱۳۹

اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ جب جہاندار شاہ نے لطف کو اپنے ہاں مشاعرے میں بلوایا تو لطف نے نواب آصف الدولہ کی ایما سے نہ صرف جہاندار شاہ کے مشاعرے میں شرکت کی بلکہ "سعادت ملازمت" کا "شرف" بھی حاصل کیا۔

لطف کے معاصر شاہ کمال کے تذکرے "مجمع الانتخاب" سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ کمال سنہ ۱۱۹۰ ہجری/۱۷۷۶ء تا ۱۲۱۴ ہجری/۱۸۰۰ء لکھنو میں مقیم رہے۔ لطف سے ملاقات کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:—

"ایں فقیر از لکھنو واقف چنانچہ یک بار بدولت خانہ مرزا صاحب معزالیہ (لطف) بتقریب دیدن کبوتران نیلہ بھورا کہ در قد و قامت بہ تمام شہر اشتہار داشتند ہمراہ مرزا مغل شاگرد میاں جرأت صاحب نیز رفتہ ملاقات ساختہ بود۔ بعد ملاحظ کبوتران یک دو گھڑی صحبت شعر و سخن ہم ماندہ بود"[1]

اس بیان سے ظاہر ہے کہ شاہ کمال جب سنہ ۱۸۰۰ء میں لکھنو سے حیدرآباد آئے لطف لکھنو میں موجود تھے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنو میں لطف کو آرام اور اطمینان کی زندگی میسر ہوئی۔ مرفع الحالی کی وجہ سے اعلیٰ نسل کے کبوتران کے پاس تھے۔ جس کی شہرت سارے شہر میں تھی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لطف کے پاس کمیاب و نادر کبوتر تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا شوق ایک صاحب ثروت رئیس یا صاحب استطاعت شخص ہی کر سکتا تھا۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد غالباً لطف کی ملازمت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ لکھنو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

پروفیسر حامد حسین قادری نے لکھا ہے کہ:۔

۱۔ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۶۸۰ (ا)

"لطف کو اساتذۂ سخن کے مقابلے میں اپنے حباہ کی صورت لکھنو میں نظر نہ آئی - پٹنہ پہنچے"[۱]

ہو سکتا ہے کہ لکھنو کا قیام ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کیونکہ جہاندار شاہ کے تذکرے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ لطف نے مشاعروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی - اپنے ایک شعر میں بھی انھوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے -

شورِ زغن و زاغ یہی ہے جو چمن میں
تو نغمہ سرایانِ چمن یاں سے چلے ہم[۲]

یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ لطف نے کتنی مدت تک لکھنو میں قیام کیا اور کس سنہ میں عظیم آباد پہنچے - مختلف تذکرہ نگاروں نے لطف کے عظیم آباد میں سکونت اختیار کرنے کا ثبوت بھی دیا ہے - چنانچہ سرور اپنے تذکرہ میں لطف کے عظیم آباد کے قیام کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مولد و منشاء مرزا علی موصوف دارالخلافہ از چندے بہ نواحِ عظیم آباد اقامت دارد -"[۳]

عظیم آباد کے راجاؤں نے شعراء کی بڑی سرپرستی کی ہے صوبۂ عظیم آباد کا قدیم نام "پاٹلی پتر" تھا - اورنگ زیب عالمگیر نے اس صوبہ کا نام عظیم آباد رکھا تھا عظیم آباد کا موجودہ نام "پٹنہ" ہے جو ریاست بہار کا پائے تخت ہے - عظیم آباد کے راجہ شتاب رائے شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے - لطف نے اپنے تذکرہ "گلشنِ ہند" میں میر ضیاء الدین ضیا (معاصر سودا) میر باقر حزیں (شاگرد مظہر) اور اشرف علی فغاں کے بیانات میں

---

۱ - دیوان لطف تاریخ اردو ص ۱۰۴

۲ - دیوانِ لطف (قلمی مخزونہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری) ص ۹ (ب)

۳ - عمدۂ منتخبہ (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی - دہلی) ص ۵۵

لکھا ہے کہ یہ شعراء دہلی سے عظیم آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ دہلی، لکھنو اور حیدر آباد دکن کے علاوہ بعض چھوٹے مراکز شعر و سخن بھی قائم ہوئے جن میں رام پور، بھوپال، مرشد آباد اور خود عظیم آباد سرِ فہرست ہیں۔ عظیم آباد کے راجاؤں نے شعرائے دہلی کی بڑی قدر و منزلت کی۔ شیفتہ[1]، نساخ[2]، ضیغم[3]، سید علی حسن خاں[4] متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ لطف نے عظیم آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ لکھنو سے لطف کا خیال عظیم آباد ہوتے ہوئے بنگال کی سیاحت کر کے حیدر آباد جانے کا تھا۔ چنانچہ پروفیسر سید محمد لکھتے ہیں :-

"لطف نے حیدر آباد کے سفر کا ارادہ کیا اور چند روز عظیم آباد پٹنہ میں گزار کر بنگال کی سیاحت کرتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی[5]۔"

جاوید نہال کا خیال ہے کہ لطف سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد دہلی سے عظیم آباد منتقل ہوئے[6]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطف ایک سے زیادہ عظیم آباد گئے تھے۔ دہلی سے وہ پہلے عظیم آباد اور عظیم آباد سے لکھنو پہنچے ہوں گے۔ لطف کا محبوب مشغلہ شاعری کے ساتھ ساتھ سیاحت بھی تھا۔ چنانچہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ لطف اپنے اس شوقِ سیّاحی کی بناء پر اپنے دورانِ قیام لکھنو میں بھی عظیم آباد آتے جاتے رہے ہوں گے۔ شاید وہ لکھنو کی سکونت ترک کر کے عظیم آباد

۱۔ گلشنِ بے خار ۔ ص ۱۶۷ ۔ ۲۔ سخن الشعراء ۔ ص ۵۰۴

۳۔ یادگارِ ضیغم (قلمی مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو) ص ۵۵۲

۴۔ بزمِ سخن (آگرہ ۱۸۸۱ء) ص ۱۰۱

۵۔ اربابِ نثرِ اردو (حیدر آباد دکن ۱۹۳۷ء) ص ۱۲۹

۶۔ انیسویں صدی میں بنگال کا ادب ص ۳۲۳

میں مستقل قیام کرنا چاہتے تھے اس خیال سے انھوں نے عظیم آباد کا رُخ کیا۔ مولانا حسرت موہانی کا خیال ہے کہ لطف حیدر آباد سے عظیم آباد آئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"والد کے انتقال کرنے پر لطف نے سیاحی اختیار کی اور اکثر اطراف ہند و دکن کی سیر کے بعد عظیم آباد کو اپنا مسکن قرار دیا۔"[۱]

یہ بات درست نہیں ہے کہ لطف نے حیدر آباد دکن کی سیر کرنے کے بعد عظیم آباد کو اپنا مسکن قرار دیا۔ اس کے برعکس لطف دہلی سے لکھنو اور لکھنو سے براہِ عظیم آباد و مرشد آباد یا براہِ مرشد آباد و عظیم آباد کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ سے وہ حیدر آباد دکن چلے آئے چنانچہ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں :۔

"از بنگالہ بہ حیدر آباد در عہد حضرت غفران مآب (نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی) آمدہ۔"[۲]

غلام حسین جوہر کی تائید میں گارسان دی تاسی بھی اس بات پر متفق ہیں کہ لطف آخر میں حیدر آباد آئے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"پٹنہ اور لکھنو میں رہا اور آخر میں حیدر آباد آگیا۔"[۳]

ان بیانات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ لطف نے اپنا مسکن حیدر آباد دکن کو بنایا تھا نہ کہ عظیم آباد کو۔ حیدر آباد دکن ہی میں لطف کا انتقال ہوا۔

مرزا علی لطف کس تاریخ کو لکھنو سے روانہ ہوئے اور کب مرشد آباد پہنچے اس کا تعیّن دشوار ہے۔ اس زمانے میں سفر کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ وسائل حمل و نقل کی سہولت نہیں

۱۔ مرزا علی لطف "اردوئے معلی" (علی گڑھ اگسٹ ۱۹۱۰ء) ص ۳

۲۔ تاریخ گلزار آصفیہ (حیدر آباد دکن ۱۳۰۶ ہجری) ص ۴۵۰

۳۔ خطبات گارساں دتاسی (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء) ص ۸۳

ہونے کی وجہ سے لطف کا سفر لکھنؤ تا مرشد آباد خاصہ طویل تھا۔ راستے میں ہو سکتا ہے کہ وہ عظیم آباد میں بھی ٹھہرے ہوں۔

کسی تذکرے سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ لطف کب مرشد آباد آئے تھے۔ اس مسئلہ کو خود لطف نے اپنے بیان سے کس قدر آسان کر دیا ہے چنانچہ وہ سوز کے مرشد آباد آنے کے بارے میں جس انداز سے اطلاع فراہم کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف سوز کے مرشد آباد پہنچنے کے وقت ۱۲۱۲ ہجری / ۱۷۹۸ء مرشد آباد میں موجود تھے۔ لطف لکھتے ہیں۔

"۱۲۱۲ ہجری مطابق ۱۷۹۸ء میں مرشد آباد تک تشریف لائے لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے"[۱]

لطف کے خود اپنے بیان کے بہ موجب محمد وجیہہ الدین عشقی بھی لطف کی مرشد آباد میں آمد اور اقامت کے بارے میں روشنی ڈالتے ہیں چنانچہ عشقی لکھتے ہیں:۔

"قبل ازیں چندے در شہر مرشد آباد و کلکتہ رحل اقامت افگندہ"[۲]

عشقی کی تائید میں جاوید نہال لطف کے مرشد آباد میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت انھیں ترک دہلی کر کے عظیم آباد منتقل ہونا پڑا تھا۔ وہاں سے وہ مرشد آباد گئے تھے"[۳]

اپنے بیان کی تکرار کرتے ہوئے جاوید نہال دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا علی لطف عظیم آباد سے مرشد آباد گئے تھے اس وقت مرشد آباد اردو کا بڑا مرکز تھا اور انشا اور مرزا جان طپش کا بڑا شہر تھا"[۴]

۱۔ گلشن ہند۔ ص ۱۱۳

۲۔ تذکرہ عشقی۔ (مرتبہ کلیم الدین احمد۔ دو تذکرے) پٹنہ ۱۹۶۳ء) ص ۱۷۷

۳۔ انیسویں صدی میں بنگال کا ادب۔ ص ۳۲۳

۴۔ انیسویں صدی میں بنگال کا ادب۔ ص ۳۲۴

لطف کے مرشد آباد کے قیام کے بارے میں سیّد عزیز الدین احمد بلخی عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

"وہ کچھ دنوں لکھنو اور مرشد آباد میں رہے"[1]

صوبہ مرشد آباد تاریخ ہند میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے نواب جعفر خاں کو ۱۱۱۶ ہجری / ۱۷۰۴ء میں "مرشد قلی خاں" کا خطاب دے کر بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ مرشد قلی خاں نے اپنے نام سے ایک شہر آباد کیا جسکا نام "مرشد آباد" رکھا گیا۔ بنگال کا صدر مقام اس شہر کو بنایا گیا۔ مرشد قلی خاں سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ سرشار تخلّص کرتا تھا۔ اُس نے شعراء کی بڑی قدر و منزلت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا داماد موتمن الملک شجاع الدولہ صوبہ دار بنگال ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا علاؤ الدولہ سرفراز خاں بہادر حیدر جنگ مسند نشیں ہوا۔ اس کو علی وردی خاں مہابت جنگ نے جو شجاع الدولہ کا مشیر و مصاحب تھا قلیل مدت میں معزول کر کے خود بنگال کا صوبہ دار بن بیٹھا۔ علی وردی خاں کے انتقال کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ مسند نشیں ہوا۔ سراج الدولہ نے انگریزوں سے جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں شکست کھائی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی یہ پہلی فتح تھی انگریزوں نے میر جعفر کو معزول کر کے میر قاسم کو صوبہ دار بنگال بنایا گیا۔ میر قاسم کی انگریزوں سے نہیں نبھی تب انگریزوں نے میر قاسم کو معزول کر کے میر جعفر کو دوبارہ صوبہ دار بنایا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا نجم الدولہ مسند نشیں ہوا۔ نجم الدولہ کے بعد اس کا بھائی سیف الدولہ جانشیں ہوا۔ جس کے زمانے میں انگریزوں کا تسلّط ہوا۔ صوبہ دار بنگال کو صرف سالانہ خرچ ملنے لگا۔ سیف الدولہ کے بعد اس کا چھوٹا بھائی مبارک الدولہ مسند نشیں ہوا۔ اسکے بعد نظام الملک صوبہ دار بنگال مقرر ہوا۔ ۱۱۸۳ ہجری نظام الملک نے ۱۲۳۵ ہجری / ۱۸۱۹ء میں انتقال کیا۔ یہی زمانہ لطف کے مرشد آباد آنے کا ہو سکتا ہے۔ نوابانِ مرشد آباد نے شعرائے دہلی کی بڑی قدر و منزلت کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ شوق، اظہور علی خلیق نوابانِ مرشد آباد کے طلب کرنے پر مرشد آباد آئے تھے۔ مرشد آباد

۱۔ تاریخ شعرائے بہار۔ ص ۷۹

ان دنوں علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔

لطف کے مرشد آباد میں قیام کرنے کا ثبوت وہ خود فراہم کرتے ہیں۔ شیر علی افسوس کلکتہ جانے سے قبل مرشد آباد میں وارد ہوئے تھے وہ لطف کے گہرے دوست تھے چنانچہ لطف لکھتے ہیں:-

"جب مرشد آباد میں یہ (افسوس) آئے تو وفورِ محبت سے اس دن غریب خانہ میں تشریف لائے۔ کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنو سے نکلا تھا اور واردِ مرشد آباد کا تھا دیدار سے اپنے انھوں نے خوش و خرم کیا اور چلتے ہوئے وعدہ کلکتہ کے سیر کا اس عاصی سے لیا۔"[۱]

لطف کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افسوس نے کلکتہ جانے سے قبل مرشد آباد میں لطف کے ہاں قیام کیا اور ان سے کلکتہ کی سیر کا وعدہ لیا۔ اب ہم کو افسوس کے کلکتہ جانے کا سنہ جاننا ضروری ہوجاتا ہے۔ تھامس روبک[۲] نے اپنی کتاب "فورٹ ولیم کالج کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ:-

"افسوس کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت مترجم ۱۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ہوا۔"

شیر علی افسوس نے خود اپنی تاریخ تقرر روزِ جمعہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۰ء لکھی ہے[۳]

لطف نے افسوس کے تقرر کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے گلشن ہند میں بتایا ہے کہ افسوس کو دو سو روپیہ مشاہرہ اور پانچ سو روپیہ سفر خرچ کے طور پر دیا گیا۔[۴]

ڈاکٹر ظہیر احسن نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے شیر علی افسوس پر مقالہ لکھا ہے....

راقم الحروف کے استفسار پر موصوف نے بذریعہ خط مرزا علی لطف کے قیام مرشد آباد کے بارے میں

۱۔ گلشن ہند۔ ص ۴۹

۲۔ بحوالہ محمد عتیق صدیقی گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۹۸

۳۔ بحوالہ فائق "کلب علی خاں "آرائشِ محفل" (مقدمہ) (لاہور ۱۹۶۳) ص ۳۰

۴۔ گلشن ہند۔ ص ۴۹

روشنی ڈالی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"لطف کے ساتھ افسوس کے ٹھہرنے کی کوئی روایت کہیں نہیں ملتی اور یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ مرشد آباد میں کتنے دنوں قیام رہا۔ قرینہ اغلب ہے کہ قیام مختصر رہا ہوگا۔ اس لئے وہ کالج کے ملازموں کے زمرہ میں آچکے تھے اور انھیں جلد سے جلد کلکتہ پہنچنا تھا۔ واقعات اور تفصیلات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ جمعہ ۱۷ر اکتوبر ۱۸۰۰ء ۲۷ر جمادی الاول ۱۲۱۵ ہجری اور ۷ر جون ۱۸۰۰ء کے درمیان کسی تاریخ کو لکھنو سے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچے ہوں گے۔ راہ میں ان کی ملاقات مرزا علی لطف سے مرشد آباد میں ہوئی"[۱]

اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ لطف کا محبوب مشغلہ شاعری کے ساتھ ساتھ سیاحت بھی تھا۔ گمان اغلب ہے کہ لطف مرشد آباد سے دوبارہ لکھنو گئے ہوں۔ لکھنو میں ایک قلیل مدت تک قیام کرنے کے بعد وہ پھر مرشد آباد واپس ہوئے ہوں۔ لطف نے شیر علی افسوس کی مرشد آباد میں آمد کی اطلاع دی ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ان کے (افسوس) کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنو سے نکلا تھا اور وارد مرشد آباد کا تھا"[۲]

مرزا علی لطف کی کلکتہ میں آمد

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد مرزا علی لطف نے لکھنو کا قیام ترک کر دیا لکھنو سے وہ براہِ عظیم آباد مرشد آباد روانہ ہوئے لطف کی مرشد آباد آمد کے دو سال بعد شیر علی افسوس بھی جن کا تقرر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منشی کی حیثیت سے ہوا تھا کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف (۲۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء)
۲۔ گلشن ہند۔ ص ۴۹

پہنچے اور چند روز لطف کے ہاں قیام کیا۔ لطف نے اپنے تذکرے میں افسوس کے مرشد آباد۔ آنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"چنانچہ جب مرشد آباد میں یہ (افسوس) آئے تو وفورِ محبت سے اس دن غریب خانہ میں تشریف لائے۔ کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا اور وارد مرشد آباد کا تھا دیدار سے انھوں نے نہایت خوش وخرم کیا اور چلتے ہوئے وعدہ کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا"[۱]

شیر علی افسوس کے کلکتہ روانہ ہونے کے بعد لطف بھی افسوس کی دعوت پر کلکتہ پہنچے۔ لطف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز عہدیداروں سے شیر علی افسوس کے بہت اچھے مراسم تھے۔ جیسا کہ خود لطف نے لکھا ہے:۔

"غرض کہ بالفعل ۔ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری (مطابق ۱۸۰۱ء) میں بلدہ کلکتہ میں صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور (افسوس) ملاقاتیں بعزت تمام رکھتے ہیں"[۲]۔

افسوس نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے لطف کا تعارف کروایا تو گلکرسٹ ان کی ادبی صلاحیتوں سے کافی متاثر ہوئے۔ گلکرسٹ کی نظروں سے علی ابراہیم خاں خلیل کا فارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" گزر چکا تھا اور مدت سے ان کا خیال تھا کہ اس تذکرہ کو اردو زبان میں لکھوائیں چنانچہ لطف کو اس کام کے لئے موزوں جان کر گلکرسٹ نے اپنے خیال کا اظہار کیا خود لطف لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ اس خیر خواہ خفی وجلی، مرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے نہایت محبت واخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے تو ہم اس تذکرے کو

۱۔ گلشن ہند ۔ ص ۴۹

۲۔ گلشن ہند ۔ ص ۴۹

اپنی طرز پر لکھیں۔"[1]

محض افسوس کی دعوت پر لطف کلکتہ گئے تھے۔ ان کا ارادہ وہاں طویل قیام کا نہ تھا وہ چند روز کلکتے کی سیر کر کے حیدر آباد جانا چاہتے تھے۔ لیکن گلکرسٹ نے اپنی فرمائش کو اخلاق وخوبی سے بیان کیا کہ لطف انکار نہ کر سکے ان کو اخلاقاً کہنا پڑا "میں لاکھ جان سے حاضر ہوں" چنانچہ لطف نے کچھ مدت کے لئے حیدر آباد جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور گلشنِ ہند کی تدوین میں مصروف ہو گئے۔[2]

جاوید نہال نے لکھا ہے کہ" لطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکتی تھی"[3] حقیقت یہ ہے کہ لطف نے ملازمت کے حصول کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو ہمہ وقتی منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو سکتا تھا کیوں کہ گلکرسٹ ان کی قابلیت سے متاثر تھے اور شیر علی افسوس جو ان کے دوست اور بہی خواہ تھے انگریز حکام اور کالج کے عہدہ داروں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی زبان (اردو) کی بیشتر کتابیں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئیں۔ بعض کتابیں کالج کونسل کی ایما یا منظوری سے لکھوائی گئیں۔ تصنیف وتالیف کے کام کے لئے منشیوں کا تقرر کیا جاتا تھا جس میں سے بعض مستقل تھے اور بعض جز وقتی مرزا علی لطف کو جز وقتی منشی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ کالج کے مستقل ملازم نہیں تھے لیکن ان سے تذکرہ گلشنِ ہند کی تالیف کے لئے فرمائش کی گئی تھی۔ خود لطف کے الفاظ میں:۔

۱۔ گلشنِ ہند ۔ ص ۹م ۔

۲۔ گلشنِ ہند ۔ ص ۳ ۔

۳۔ انیسویں صدی بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۸

"موافق حکم اس صاحب والامناقب کے کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا (گلکرسٹ) اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس ہیچمداں نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بہ موجب ارشاد اس ممدوح کے "گلشن ہند" لکھا"۔[1]

مرزا علی لطف نے بہت ہی قلیل مدت تک کلکتہ میں قیام کیا۔ تذکرہ گلشنِ ہند کی تالیف (۱۲۱۵ ہجری / ۱۸۰۱ء) کے بعد وہ حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ شاہ کمال جو لطف کے معاصر اور قریبی دوست تھے انھوں نے (۱۲۱۵ ہجری / ۱۸۰۱ء) میں لطف کی حیدرآباد میں موجودگی کی اطلاع بہم پہنچائی ہے۔[2]

گلشنِ ہند کی وجۂ تالیف

گلشنِ ہند کے دیباچے میں اس تذکرے کی وجۂ تالیف بیان کرتے ہوئے لطف نے لکھا ہے:-

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا "گلزار ابراہیم" رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا۔ ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحبِ عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصّل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو۔ اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے۔

۱۔ گلشنِ ہند ۔ ص ۵

۲۔ مجمع الانتخاب ۔ (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۲۸۰ (و)

اور نوشتِ کیفیت بہت اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی مرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے۔ نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمے میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں" اگرچہ یہ پابندِ الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا لیکن اس خلقِ مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اسباب کے اور کچھ نہیں آیا میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سر مو آپ کے فرمانے نہیں باہر ہوں۔"

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں لطف شیر علی افسوس کی دعوت پر کلکتہ گئے تھے۔ جہاں ان کا تعارف ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ہوا اور انھیں کی فرمائش پر لطف نے گلزار ابراہیم کو بہت کچھ اضافے کے ساتھ اردو میں منتقل کیا۔ وجہ تالیف کے سلسلے میں لطف کے اس بیان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ چند امور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ لطف کا تقرر فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں مستقل یا عارضی منشی کی حیثیت سے نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ لطف سے محض گلزارِ ابراہیم کا ترجمہ کروانا چاہتے تھے۔ گلکرسٹ کے یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمے میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں"۔ اس جملے سے ایک مفہوم یہ نکلتا ہے کہ لطف "گلزار ابراہیم" کو اردو میں منتقل کردیں تاکہ اس کی مدد سے گلکرسٹ اس تذکرے کو اپنی طور پر (اپنے الفاظ میں) یا سادہ اور صاف زبان میں جس کا سمجھنا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے طالب علموں کے لئے دشوار نہ ہو لکھیں "ہم" کا مرجع "لطف اور گلکرسٹ" بھی ہوسکتے ہیں اس صورت میں عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر لطف تعاون کریں تو وہ اور گلکرسٹ مل کر اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنائیں۔ یہ بات یہاں واضح رہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اشاعتی پروگرام میں یہ کتاب شامل نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ جب لطف نے گلکرسٹ سے ملاقات کی تو وہ لطف کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے اور یہ سوچا ہوگا کہ لطف کے کلکتے میں قیام سے فائدہ اٹھا کر کیوں نہ کالج کے لئے ان سے کوئی کتاب لکھوائی جائے

یا پھر بطور (Courtesy) انھوں نے لطف کو یہ کتاب لکھنے کے لئے کہا ہو اور منشاء یہ ہو کہ اس کتاب کی تالیف سے لطف کو کچھ مالی فائدہ پہنچ جائے تعجب کی بات یہ ہے کہ خود فورٹ ولیم کالج کے منشی حیدر بخش حیدری سال بھر پہلے "گلشن ہند" ہی کے نام سے گلزار ابراہیم کا ترجمہ اور تلخیص کر چکے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے گلکرسٹ کو ضرور دکھائی ہوگی اور یہ درخواست بھی کی ہوگی کہ اسے کالج کے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا جائے۔ گلکرسٹ اگر یہ چاہتے کہ گلزار ابراہیم کا مکمل ترجمہ کیا جائے یا اسکو مزید اضافوں کے ساتھ تالیف کیا جائے تو وہ حیدری سے یہ کام لیسکتے تھے لیکن انھوں نے حیدری کو نظر انداز کرتے ہوئے لطف سے یہ خواہش کی کہ وہ اس تذکرہ کو مرتب کریں۔ پھر اس تذکرہ کا نام بھی انھوں نے گلشن ہند ہی تجویز کیا جو حیدری کا دیا ہوا نام تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گلکرسٹ حیدری سے ناخوش تھے اور انھیں زک پہنچانا چاہتے تھے۔ حیدری سے اختلاف کا سبب کالج کی داخلی سیاست ہو سکتی ہے جسکے بارے میں ہمارے معلومات محدود ہیں۔ حیدری سے ناراضگی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیدری نے یہ دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ "گلشن ہند" ان کی اپنی تالیف ہے اور انھوں نے بڑی محنت سے شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے جمع کئے جبکہ حیدری نے صرف گلزار ابراہیم کی تلخیص کر دی تھی۔[۱] بہر حال لطف نے یہ تذکرہ کلکتے کے قیام کے دوران مکمل کر دیا۔ اور وہاں سے حیدر آباد چلے آئے گلکرسٹ نے لطف سے یہ تذکرہ لکھوا لیا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ گلکرسٹ نے اس تذکرہ کو اشاعتی پروگرام میں شامل کرنے کی سفارش نہ کی ہو۔ گلکرسٹ نے پوری کوشش کی ہوگی کہ یہ کتاب شائع ہو جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارباب متعلقہ نے اس کتاب کی اشاعت کی تجویز رد کر دی چنانچہ "Proceedings of The Council of The College of Fort William" (پروسیڈنگ آف دی کونسل آف دی کالج آف فورٹ ولیم) کی فہرست میں ۱۹۰۵ عیسوی تک کی

---

[۱] ملاحظہ ہو تفصیلی بحث ص ۱۱۲ تا ص ۱۲۷ مقالہ ہذا۔

زیرِ طبع یا زیرِ تالیف کتابوں کی مکمل فہرست دی گئی ہے[1] اس میں لطف کے "گلشن ہند" کا نام نہیں ہے۔ حالات و قرائن سے اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ حیدری اور ان کے مربیوں (گلکرسٹ کے مخالفین) نے اس تذکرے کو فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات میں شامل ہونے نہیں دیا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۰۲ء تک حیدری اس کے لئے کوشاں رہے کہ ان کا تذکرہ اشاعت کے لئے قبول کرلیا جائے اور انھیں اس تذکرے کی تکمیل کے لئے مالی امداد حاصل ہو۔[2]

لطف کا تذکرہ ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا دیباچے کے آخر میں قطعہ تاریخ درج ہے۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا
کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلٹتی ہے

حیراں پھریں ہیں بے سر و پا بھن اور دے
تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے
۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء

گلکرسٹ کا اگر ابتداء میں یہ خیال بھی ہو کہ لطف کے فراہم کردہ مواد کو وہ خود اپنی طرز پر لکھیں گے تو انھوں نے اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے گلکرسٹ نے یہ سوچا کہ لطف اس تذکرے کو آسان بول چال کی زبان میں نہیں لکھ سکیں گے لیکن جب لطف کا تذکرہ انھوں نے دیکھا تو اس کی زبان اور طرزِ تحریر سے مطمئن ہو گئے ہوں اور اس کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔

۱۔ قلمی مخزونہ آرکیوز آف انڈیا دہلی ص ۲۷۴ تا ۲۷۶۔

۲۔ تفصیل ملاحظہ ہو ص ۱۱۸ تا ۱۲۰ مقالہ ہذا۔

لطف کی کلکتے سے حیدر آباد میں آمد

مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ "گلشنِ ھند" کو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا۔ اس کی تکمیل کے بعد وہ کلکتے سے حیدر آباد پہنچے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ یہ پابندِ الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا لیکن اس خُلقِ مجسّم (گلکرسٹ) کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے بیان فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کہ اور کچھ نہ بن آیا میں لاکھ جان سے حاضر ہوں الحمدُ لِلّٰہ آج کے دن کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے ہیں..... اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔"[1]

شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرے کی تکمیل کے ساتھ ہی وہ حیدر آباد روانہ ہوئے چنانچہ لطف کے ایک شناسا شاہ کمال جو ان سے لکھنؤ میں ملاقات کر چکے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں حیدرآباد آگئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"وقتیکہ باعثِ نیرنگی زمانہ فقیر از لکھنو در شہر حیدر آباد رسیدہ مرزا صاحب موصوف (لطف) باتفاق زمانہ نیز بعد یکساں وارد شہر مذکور شدند۔"[2]

۱۔ گلشنِ ھند ۔ ص ۳ تا ۵

۲۔ مجمع الانتخاب ۔ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ ۔ ص ۶۷۹ (ب)

اس سلسلے میں گارساں دتاسی کے بیان سے بھی مدد ملتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ۔

"آخر میں وہ لطف حیدرآباد آگیا۔ جہاں وہ کمال سے ایک سال بعد پہنچا۔ کمال کو وہ لکھنؤ ہی سے جانتا تھا اور دکن میں اس سے پھر ملاقات ہوئی۔"[1]

اس لحاظ سے لطف کے حیدرآباد آنے کا ۱۲۱۵/۱۸۰۱ء قرار پاتا ہے۔ خود لطف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض سیاحت وتفریح کی غرض سے حیدرآباد آئے تھے لیکن قرائن کہتے ہیں کہ وہ اپنے بھائی علی رضا رضاؔ کی ایما پر حیدرآباد آئے تھے جو نواب ارسطوجاہ بہادر کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھیں بھائی کے خطوط سے ارسطوجاہ بہادر کی علم دوستی اور شعراء کی قدر دانی کا حال معلوم ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ علی رضا رضاؔ نے ارسطوجاہ بہادر سے لطف کا ذکر کیا ہو اور ان ہی کے ایما سے انھوں نے لطف کو حیدرآباد بلایا ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو لطف ممکن تھا کہ کلکتہ ہی میں رہ جاتے۔ ان کے لئے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کرنا دشوار نہ تھا کیوں کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ انکی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت سے متاثر تھے۔ لطف کی غرض اگر محض سیاحت ہوتی تو وہ چند روز حیدرآباد میں قیام کرکے لوٹ جاتے لیکن وہ یہاں پہنچ کر نواب ارسطوجاہ بہادر کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور حیدرآباد دکن کی مستقل سکونت اختیار کی۔

لطف دہلی سے نکل کر لکھنؤ اور پھر کلکتہ میں قیام کرنے کے بعد حیدرآباد دکن آئے تھے لیکن دکن میں ان کو ہمیشہ دہلی کی یاد ستاتی رہی اور دہلی کے دوستوں کی یاد آتی رہی۔ دیکھئے لطف کے ان اشعار میں کس قدر سچائی اور اثر ہے: ۔

۱۔ خطبات گارساں دتاسی (اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء) ص ۸۴

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ وپیغام کی
رخصت اے اہلِ وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قائم گردشِ ایام کی
یاد نے ان تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پر جان ماری ہے دلِ ناکام کی
گردشِ چشمِ بتاں کر لبکہ ساغر نوش کی
گردشِ گردوں کو ہم کہتے ہیں گردش جام کی
جب سے کھینچا لطف رنج فرقت یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردشِ ایّام کی
جا کے دکن سے بادِ صبا تو کہیو ہند کے یاروں کو
صبر کا تحفہ بھیجو ہمیں اس سے بہتر سوغات نہیں
ہر صبح گھر سے دیتی ہے یاد وطن نکال
غربت میں عمر کٹ گئی صبا کی طرح
ہوا آوارہ ہندوستان سے کہاں لطف اب خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلش کے گوروں نے

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی سرپرستی

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا عہد حکومت ۱۱۷۵ / ۱۷۶۱ء تا ۱۲۱۸ ہجری مطابق ۱۸۰۳ء ہے۔ لطف ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں کلکتے سے حیدرآباد دکن آئے۔ لطف کے

کلکتے سے حیدرآباد دکن آنے کے بعد نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی تین سال تک زندہ رہے۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا عہد حکومت جنگ و جدل میں گزرا وہ اپنے دور کے آخری حصے میں شعر و شاعری کی جانب مائل ہوئے تھے۔ اور اس دور میں انھوں نے شعر و سخن کی خاص سرپرستی کی۔ ان کی قدر دانیوں اور علم پروری کا شہرہ سُن کر دُور دُور سے اردو اور فارسی کے شعراء حیدرآباد دکن چلے آئے۔ حیدرآباد دکن میں اس وقت بڑے بڑے شعراء موجود تھے جن میں مقامی شاعر بھی تھے اور بیرونی شعراء بھی ان میں قابلِ ذکر محمد حفیظ دہلوی، ماہ لقا بائی چنداؔ، محمد صدیق قیسؔ، شیر محمد خاں ایماؔن، میرزو الفقار علی صفاؔ لکھنوی، شاہ کمالؔ، احسن اللہ خاں بیاںؔ دہلوی، شاہ تجلی علی تجلیؔ، شاہ نصیر وغیرہ ہیں۔[۱]

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اپنی تخت نشینی ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء کے نو سال بعد ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء میں اورنگ آباد کی بجائے شہر حیدرآباد دکن کو سلطنتِ آصفیہ کا دارالحکومت بنایا۔[۲] اورنگ آباد کی تمام شعر و سخن کی سرگرمیاں حیدرآباد دکن میں منتقل ہوگئیں۔ شعراء جوق در جوق یہاں آکر بس گئے۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی "غفرانِ مآب" کے لقب سے عوام و خواص میں مشہور تھے۔ آصف جاہ ثانی کا انتقال ۱۲۱۸ھ / مطابق ۱۸۰۳ء میں ہوا۔ لطف کے معاصر شاعر شاہ کمال نے آصف جاہ ثانی کی وفات پر ایک قطعہ لکھا ہے جس سے تاریخ وفات ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء نکلتی ہے۔

وہ فخرِ خسروِ دوراں وزیرِ ملکِ دکھن
جو تھا نظام علی خاں سبھوں کا یاں والی
نظام الملک تھا کتنا تھا کوئی آصف جاہ
یہ تھا وہ رشکِ سلیماں یہ قدر تھی عالی[۳]

۱۔ غلام حسین جوہر "گلزارِ آصفیہ" (حیدرآباد) ۲۔ محمد نجم الغنی "تاریخ ریاست حیدرآباد دکن" لکھنؤ ص ۱۹۳
۳۔ "مجمع الانتخاب" قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ ص ۶۷۸ (۲)

لطف کے ہمعصر تذکرہ نگار غلام حسین جوہر نے لطف کی نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کے دربار سے وابستگی اور چار سو روپیہ ماہوار و پالکی کا ذکر کیا ہے ۔ غلام حسین جوہر لکھتے ہیں :-

"از بنگالہ بہ حیدرآباد در عہدِ حضرت غفران مآب (نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی) آمدہ مشہور گشت ...... قصائد غرا در شانِ حضور پُرنور گزرانیدہ بدرماہ چہار صد روپیہ و سرفرازی پالکی میاھی گردید"[1] ۔

غلام حسین جوہر کے بیان کی تائید عبدالجبار ملکاپوری نے بھی کی ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نظام علیخاں آصف جاہ ثانی نے ازراہ قدردانی لطف کو چار سو روپیہ ماہوار ایک پالکی سے سرفراز فرمایا[2] ۔

صاحبِ تذکرہ ضیغم کو تسامح ہوا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"غفران مآب نواب نظام علی خاں بہادر کے عہدِ حکومت میں حیدرآباد آئے اور اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کے مصاحب ہوئے اور چار سو روپیہ ماہوار پاتے تھے"[3] ۔

صاحبِ تذکرۂ ضیغم کی یہ بات درست نہیں ہے گمان اغلب ہے کہ نظام علیخاں لکھنے کی بجائے اعظم الامراء ارسطو جاہ لکھ گئے ۔ نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے دربار میں لطف نواب ارسطو جاہ ہی کے وسیلے سے پہنچے تھے ۔

کافی تحقیق و جستجو کے باوجود راقم الحروف کو لطف کے وہ قصیدے دستیاب نہ ہو سکے جو انھوں نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی مدح میں لکھے تھے ۔

---

۱ ۔ گلشنِ آصفیہ (حیدرآباد) ۔ ص ۔ ۴۵

۲ ۔ محبوب الزمن (حیدرآباد ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۱

۳ ۔ محمد عبداللہ ضیغم "تذکرۂ ضیغم" (قلمی مخزونہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو) ص ۵۵۲

اعظم الامراء ارسطوجاہ کی مصاحبت

نواب ارسطوجاہ فارسی اور اردو شاعری کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے شعراء کی بڑی سرپرستی کی ہے متعدد شعراء ان سے وابستہ تھے۔ نواب ارسطوجاہ کا نام غلام سید خاں خطابات سہراب جنگ، معین الدولہ، مشیر الملک، اعظم الامراء ارسطوجاہ تھے ان کے والد نثراد خاں آصف جاہ اوّل کے ہمراہ حیدرآباد آئے تھے۔ ان کا خاندان ایرانی تھا۔ نثراد خاں کو برار کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد نواب نظام علیخاں ثانی نے نواب ارسطوجاہ کو اورنگ آباد کا صوبہ دار مقرر کیا بعد ازاں ان کو حیدرآباد دکن طلب کر کے پیشکاری کی خدمت عطا کی۔ ۱۷۸۱ء میں ان کو مدارالمہام (وزیر اعظم) کی خدمت عطا کی۔ ان کی مدارالمہامی کا عہد نواب نظام علی خاں نظام ثانی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا یعنی نواب نظام علی خاں کے انتقال کے بعد یہ صرف دو مہینے تک زندہ رہے ۱۲۱۹ء / ۱۸۰۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

نواب ارسطوجاہ کے دربار میں فارسی اور اردو کے ڈیڑھ سو سے زیادہ شعراء کا کثیر مجمع موجود رہتا تھا۔ شاہ تجلی علی تجلی کی تالیف "مجموعہ فصاحت" میں نواب ارسطوجاہ کی مدح میں اس زمانے کے شعراء کے قصائد موجود ہیں اس بناء پر پروفیسر عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں:۔

۱۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی ارسطوجاہ (حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء)

"اس زمانے میں عام طور پر ہندوستان اور خصوصاً دکن میں اردو شعراء کا قدرداں اور سرپرست ارسطوجاہ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں تھا۔"[1]

لطف کے ہم عصر شاہ کمال نے ان کے ارسطوجاہ سے توسل کا حال اپنے تذکرہ میں لکھا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اوّل ملاقات مرزا صاحب معز الیہ از فقیر (شاہ کمال) بہ مکان امجد علیخاں صاحب بہ صحبت مشاعرہ گردیدہ بعد ازاں بوسیلۂ منشی عزیز اللہ صاحب، منشی انگریز یعنی حشمت جنگ بہادر بہ سرکار نواب ارسطوجاہ بہادر برشتۂ روزگار عہدہ سرفراز شدہ اکثر ملاقات می شود۔"[2]

اس بیان کی روشنی میں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ لطف کے تعلقات حیدرآباد کے اُس وقت کے انگریز ریسیڈنٹ کرک پٹرک حشمت جنگ سے بھی تھے۔ حشمت جنگ کے منشی عزیز اللہ ہی کے توسط سے وہ ارسطوجاہ کے یہاں باریاب ہوسکے۔ ارسطوجاہ نے ازراہ کرم لطف کو اپنے مصاحبین میں شامل کرلیا اور اپنی جانب سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کردی۔[3]

نواب ارسطوجاہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے دربار میں اپنی معرفت لطف کی باریابی کا انتظام کیا۔ نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی نے چار سو روپیہ ماہوار اور سواری کے لئے ایک پالکی عطا کی۔ وفات کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لطف کی یہ ماہوار مسدود ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے اس زمانے کی چار سو روپیہ ماہوار مسدود ہوجائے تو یہ بات پریشانی کا باعث ہوسکتی تھی۔ چنانچہ لطف کو نواب ارسطوجاہ کی مقرر کردہ ڈیڑھ سو روپیہ والی ماہوار ناکافی محسوس ہونے لگی۔ اپنے ایک قصیدہ میں لطف نواب ارسطوجاہ سے

۱۔ ارسطوجاہ (حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء) ص ۵۸

۲۔ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ۔ کتب خانہ سالارجنگ) ص ۶۸۰ (ؤ)

۳۔ مرزا علی لطف "قصیدہ" دیوان لطف (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۲۱

درخواست کرتے ہیں کہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ان کے لئے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں لہٰذا اس میں مزید ڈیڑھ سو روپیہ کا اضافہ کر کے جملہ تین سو روپیہ ماہوار ان کو دی جائے ۔ اس قصیدہ میں لطف کہتے ہیں۔

سرکار سے تری جو زراہ تفضّلات
ہے ڈیڑھ سو روپیہ خادم کا ماہوار
ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار
بے گفتگو بچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
خلقِ خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار
باقی جو سو رہے کئی دن میں زبان پہ ہے
مثلِ مجرّدات فقط ان کا ہے شمار
لیکن نہ وہ اضافہ نہ ہووے برائے نام
کافر ہوں سو بچاس گر ہو کشودِ کار
تضعیفِ فصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف
کیوں کہ یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہو میرے تین سو
چھ سو جب امیّوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار
تجھ سا ہو قدر دانِ نکات اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیر پنجۂ چرخِ ستم شعار

بس لطف اتنی بے ادبی تجھ سے ہے بعید
جو اس نفس درازیوں سے اپنی شرمسار
جب تک جہاں میں نام بہار و خزاں رہے
اور ابر تر ہو گلشنِ دنیا کا آبیار
باغِ اہلِ عدو کا ترے رہوے بت خزاں
اور گلشنِ امید ترا ہو سدا بہار[۱]

لطف کا یہ قصیدہ (۱۰۱) اشعار کا ایک طویل قصیدہ ہے جو دو مطلعوں پر مشتمل ہے پہلا مطلع ہے:۔

ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں وہ لطمہ خوار
عمّانِ مدح کا ترے پیدا نہیں کنار

دوسرا مطلع ہے:۔

بخشش نے تیری رشک بیاباں کئے بحار
ہمت سے تیری غیرتِ دریا ہے کوہسار

اس قصیدہ میں لطف نے حُسنِ طلب سے پہلے نواب ارسطو جاہ کے خاندانی حالات و مراتب کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے لطف کو اپنے سپاہی پیشہ ہونے پر ناز تھا جس کا اظہار انھوں نے مندرجۂ ذیل اشعار میں کیا ہے:۔

کیوں کر کہ شاعری میری میراث کچھ نہیں
نے فخر میں سمجھتا ہوں اسکو نہ ننگ و عار
فنِ سپاہ گری میں وہ ہے کسب کونسا
جو جانتا نہیں میں بہ تائیدِ کردگار

۱۔ مرزا علی لطف ۔ دیوان لطف (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۲۱ (ب)

پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب
کھل جائے گا دہ تجھ پہ کسی روز وقتِ کار[1]

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی اپنے سپاہی پیشہ ہونے پر فخر کیا ہے۔ محمد ابراہیم ذوق کے جواب میں غالب کے قصیدے میں ایسے اشعار موجود ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپاہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس قصیدہ سے اسبات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو میں لطف خوش حال تھے۔ حیدر آباد دکن میں بھی ارسطوجاہ کی ملازمت میں بھی لطف فارغ البال تھے مگر یہاں کے دربار سے اور نواب ارسطوجاہ کے ہاں سے بعض غیر مستحق لوگوں کو چھ سو تا چھ ہزار روپئے دئے جاتے تھے۔ لطف نے اپنی ماہوار کے اضافہ کی درخواست میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔

دوسرا قصیدہ لامیہ ہے جس میں ۷۵ اشعار ہیں یہ قصیدہ بھی دو مطلعوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مطلع یہ ہے :۔

تھی جو مُرغِ فکر کو منقارِ حسرت زیرِ بال
تپ چھپے ہیں آج داسطے عید کا جیسے ہلال[2]

دوسرا مطلع یہ ہے :۔

جس جگہ برپا ہو تیرا خیمۂ عزّ و جلال
مبتذل ہے داں فلک کے اطلسِ کہنہ کے بال

۱۔ مرزا علی لطف "قصیدہ" دیوانِ لطف (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی)
ص ۲۱ (ا)

اس قصیدہ میں لطف نے ارسطو جاہ کے جاہ و جلال کی تعریف کی ہے ان کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف کی ہے۔ سخاوت کو بیان کیا ہے۔ اور دعا پر اس قصیدہ کو ختم کیا ہے۔ دعائیہ اشعار یہ ہیں:-

مدح کو اے لطف بس تو اب دعا سے کر بدل
کیوں کہ مدت سے اجابت کو ہے شوقِ اتصال
صفحۂ گیتی پہ جب تک مہر کو ہے مشقِ نور
اور جس دن تک ہے مہ کو لازمی شکلِ ہلال
نیرِ اقبال کو تیرے رہے مشقِ عروج
کوکبِ اعدا کو لازم ہو سدا اوجِ زوال

دوسرے قصیدے کے ۵۳ اشعار ہیں۔ قصیدے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

گل معطر تھی صبا تک نکہت دلکش کے ساتھ
جس کے آگے بوئے گل کو حکم نوک خار ہے

مطلع غالباً کہا ہوگا جو کسی وجہ سے شامل نہیں کیا گیا دس اشعار کے بعد اس تمہید کے ساتھ ایک مطلع کہا ہے۔ مطلع یہ ہے:-

گوہر خوش آب پہ جوں سلک گوہر دے تو نذر
گر سخن سنجوں میں تجھ کو آبرو درکار ہے
تجھ پہ درِ عقل کو یہ گرمئی بازار ہے
جا چھپا خجلت سے دریا میں درِ شہوار ہے

اس قصیدہ میں لطف نے نواب ارسطو جاہ کی تعریف کی ہے۔ "دعائیہ" پر یہ قصیدہ ختم ہوتا ہے۔

کر دعا پر ختم بس اے لطف ہے ترکِ ادب

اور اجابت کا بھی اب اس امر میں اصرار ہے

گلشنِ اقبال تیرا نت رہے با آب و رنگ

دہر کا شاداب و خرّم جب تلک گلزار ہے

ایک قصیدہ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے صاحبزادے جہاندار علی خاں کیوان جاہ کی تسمیہ خوانی کے موقع پر لکھا ہے۔ لطف نے اس قصیدہ میں کیوان جاہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ کیوان جاہ کی پرورش نواب ارسطوجاہ کی نگرانی میں ہوئی نواب ارسطوجاہ کے اکلوتے فرزند سپہدار جنگ سیف الدولہ (عرف مالی میاں) کے انتقال پر نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی نے اپنے اس بیٹے (کیوان جاہ) کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ اس قصیدے میں نواب ارسطوجاہ کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ اس قصیدہ میں ۲۵ اشعار ہیں اس قصیدہ میں بھی مطلع نہیں ہے۔ قصیدہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:۔

جب بخورِ عنبرِ عیش و صدائے عودِ جشن

مل کے دونوں نے بہم تا عرشِ اعظم راہ کی

حسنِ مدعا بیان کرتے ہوئے لطف اس دعائیہ پر ختم کرتے ہیں جس کے اشعار یہ ہیں۔

لطف چل پھر کر دعا اوس کی حضوری میں کہ یوں

ہوتی دلجمعی نہیں مدّاحِ دولت خواہ کی

اے وزیرِ اعظم فرماں رہِ ملکِ دکن

فیض ہے بے شک تجھے درگہ سے حضرت شاہ کی

رشوتیں دے کر اجابت نے اجارہ ہی کیا

جب دعا کی عالمِ بالا پہ بھی تنخواہ کی

بہرِ اسمائے جلیلِ قدر رحمٰن الرّحیم

ہو مبارک تجھ کو بسم اللہ کیوان جاہ کی

لطف کی میر عالم سے وابستگی

نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کا انتقال ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں ہوا۔ انکے انتقال کے بعد ۵۔ ربیع الثانی ۱۲۱۹ ہجری مطابق ۱۳۔ جولائی ۱۸۰۴ء کو نواب سکندر جاہ نے میر عالم کو مدار المہامی سے سرفراز فرمایا۔ نواب ارسطو جاہ بہادر کے انتقال کے بعد لطف اپنے ایک مربی و سرپرست سے محروم ہو گئے۔ میر عالم اپنے پیش رو کی طرح شعراء کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے وہ خود شاعر تھے اور عالم تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے لطف کو بھی اپنے الطاف سے سرفراز کیا۔ میر عالم کا اصلی نام سید ابوالقاسم تھا۔ وہ حیدرآباد میں ۱۸۔ جولائی ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید رضی عالم و مجتہد تھے۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ "اقدس" ان کا تخلص تھا۔ ان کا فارسی دیوان موجود ہے۔ نواب ارسطو جاہ نے میر عالم کی بڑی سرپرستی کی۔ چنانچہ ارسطو جاہ ہی کے ایما پر میر عالم ہی نے سرکار نظام اور انگریزوں کے درمیاں سفارت کا کام انجام دیا۔ لارڈ کارنوالس گورنر جنرل اور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی دونوں نے میر عالم کے "عہدۂ سفارت" کو پسند کیا۔ نظام ثانی نے اس بناء پر ابوالقاسم کو "میر عالم" کا خطاب دیا اور پنج ہزار ذات دو ہزار علم و نقارہ پالکی جھالر دار اور خلعت فاخرہ سے سرفرار کیا۔ ان کے فرزند میر رضی کو "میر دوراں" کا خطاب دیا گیا۔ نواب ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد میر عالم کو وزیر اعظم کی خدمت سے سرفراز فرمایا۔ میر عالم کی حسب ذیل تصانیف مشہور ہیں۔

۱۔ مصباح العارفین ــ نماز شب کے طریقے یہ ۱۲۱۸ ہجری/ ۱۸۰۴ء میں تالیف ہوئی۔

۲۔ مثنوی میر عالم — یہ مثنوی مہ لقا چندا کے سراپا میں نظم کی گئی جو اُن کی شاگرد تھی۔

۳۔ زیارت عاشورہ — زیارتِ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

۴۔ رقعات میر عالم — خطوط کا مجموعہ جو ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء میں شائع ہوا۔ ۲۱ رشوال ۱۲۲۳ھ

مطابق ۱۸۰۸ء شب جمعہ کو میر عالم کا انتقال ہوا[۱]۔ غلام حسین جوہر نے تاریخ وفات لکھی۔

افسوس کہ آں میر فرطیبر عالم

بانام نکو رفت وزیر عالم

جوہر زسنِ انتقالش گفتا

حقّا بہشت جائے میر عالم

۱۲۲۳ ہجری

میر عالم کی وزارتِ عظمیٰ کا دور بہت مختصر رہا وہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء تا ۱۲۲۳ھ /

۱۸۰۸ء یعنی صرف چار سال تک وزیر اعظم رہے۔

میر عالم کی وفات تک لطف ان کے دربار سے وابستہ رہے لطف نے میر عالم کی مدح میں بڑے معرکے کے قصیدے لکھے ہیں۔ ایک قصیدے میں لطف نے میر عالم کے عدل و انصاف اور ان کی جاہ و حشمت کا ذکر کیا ہے۔ اپنے اشعار کی لطافت کو بیان کیا ہے۔ زمانہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ لطف نے عروج و زوال کی منزلوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میری حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی ہے۔ اگر عنایت شاملِ حال ہو جائے تو اچھے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ میر عالم کو لطف آلِ پیمبرؐ کا واسطہ دیتے ہیں۔ اپنے قصیدہ کا صلہ وہ میر عالم کے اجداد سے لینے کے خواہش مند ہیں۔ دعائیہ پر لطف نے اپنا یہ قصیدہ ان دعائیہ اشعار پر ختم کیا ہے:-

تو جو اتنی عرض حاجت روائے خلق ہے تجھ سے

کہیں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا

ادب سے دُور ہے عرضِ مکرّر لطف سے ہر چند

۱۔ یہ تفصیلات "میر عالم" مؤلف محمد سراج الدین طالب دشمس الاسلام پریس حیدرآباد ۱۹۳۶ء سے اخذ کیے گئے ہیں۔

مزا ہے لطف کی تکرار میں قندِ مکرّر کا
ہوا طولِ سخن اب خاتمہ بہتر دعا پر ہے
طریقہ جو کہ ہے مدحت گراں نظم گستر کا
جہاں میں جب تلک زہر و شکر تلخی و شیرینی
کریں معمول پر اپنے اثر کیا خیر کیا شر کا
شکر دے تلخ کامی زہر کی بدخواہ کو تیرے
کرے تلخیٔ زہر احباب سے نت کام شکر کا[1]

حیدرآباد دکن میں لطف کے معاصر شعرا

حیدرآباد دکن میں لطف نے ایک طویل عرصہ گزارا لطف نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے زمانے میں حیدرآباد دکن آئے۔ اُس وقت نواب نظام علی خاں آصف جاہ مدارالمہام (Prime Minister) تھے۔ نواب نظام علیخاں آصف جاہ کی وفات ۱۸۰۳ء کے بعد نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث ۱۸۰۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ نواب ارسطوجاہ کا انتقال ۱۸۰۴ء میں ہوا ان کے بعد میر عالم "پرائم منسٹر" ہوئے۔ لطف دونوں بادشاہوں کے درباری شعراء سے نہ صرف متعارف تھے بلکہ اکثر و بیشتر سے ان کی دوستی بھی تھی۔ نواب ارسطوجاہ اور میر عالم کے مصاحبین شعراء سے بھی لطف واقف تھے۔ عوام اور خواص میں لطف مشہور تھے۔ امراء در دسا لطف کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ معاصرین شعراء لطف کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور ان کی عظمت کے

۱۔ "دیوانِ لطف" (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۱۹ (ب)

معترف تھے۔[1]

مندرجہ ذیل فہرست اور حالات حیدرآباد کے ان شعراء کے ہیں جو لطف کے معاصر تھے۔

شیر محمد خاں ۔ ایمان

شیر محمد خاں حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ ایمان تخلص کرتے تھے۔ محمد عاقل خاں کے بیٹے تھے جو سرکار نظام کے ملازم تھے۔ ایمان کو شعر گوئی کے علاوہ تاریخ دانی اور وقائع نگاری میں بڑی مہارت تھی۔ اس دور کے تمام شعراء ایمان کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ اور استادی کے قائل تھے۔ اس زمانے کے مشاعروں کا تصور ایمان کی موجودگی کے بغیر ناممکن تھا۔

ایمان، شاہ تجلّی علی تجلّی کے شاگرد تھے لطف کے معاصر شعراء ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کی عظمت کے معترف تھے۔ چنانچہ شیر محمد خاں ایمان بھی لطف کی حیدرآباد آمد پر ملاقات کے لئے آئے۔ عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں۔

"بندگانِ عالی آصف جاہ ثانی کے زمانے میں حیدرآباد دکن آئے شہر میں آپ کی (لطف) شہرت ہوئی اس وقت کے شعراء مثلاً شیر محمد خاں ایمان آپ سے ملنے کو آئے۔ آپ نہایت خوش اخلاقی سے ملے اور اپنا کلام سنایا۔ سب خوش ہوئے۔"[2]

شیر محمد خاں ایمان کا انتقال ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء حیدرآباد ہی میں ہوا ایمان کے شاگردوں میں مہ لقا بائی چندا اور قیس مشہور ہیں۔ ایمان نے نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا۔

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ دوم ص ۹۷۱

۲۔ محبوب الزمن" حصہ دوم (حیدرآباد دکن ۱۸۱۱ء) ص ۹۷۱

بر روحِ پاک میر نظام علی مدام
زیں مصرعۂ عجیب دو تاریخ را بخوان
خوانند با وضو ہمہ اشخاصِ فاتحہ
مستوجب بہشت و باخلاصِ فاتحہ

ایمان کا نمونہ کلام :-

تعریف دلربا کے سراپا کی کیا کہیں
ایمان ہم کو ایک ہی بس تل نے غش کیا
سرمہ ہو جل کے برقِ تجلّی سے کوہسار
پھبتا ہے اس کو جلوۂ دیدار کا گھمنڈ
رشک تیری دلربائی کا زبس کھاتی ہے شمع
دیکھ تیرے تن کے شعلے کو جل جاتی ہے شمع
ہم کبھو جو تجھ سے کرتے ہیں محبت کا گلہ
دل کو بھاتی ہے تری اے شوخ جھنجلانے کی طرز
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے و گر قدر
مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں
جب کہوں ہیں کہ کہوں جی قربان
ہنس کے کہتا ہے کہ ہاں بہتر ہے[۱]

۱۔ شیر محمد خاں ایمان "دیوان ایمان" (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۲۴۹

شیخ محمد حفیظ، حفیظ

شیخ محمد حفیظ دلّی کے رہنے والے تھے۔ حفیظ تخلص تھا۔ دلّی سے حیدرآباد آئے تھے۔ وہ باکمال شاعر تھے۔ ان کے معاصر شعراء حفیظ کی استادی کو تسلیم کرتے تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ دلّی سے حفیظ اورنگ آباد چلے آئے یہاں پر راجہ ہیبت رائے کے پاس مصاحب رہے۔ پھر اورنگ آباد سے حیدرآباد چلے آئے۔ راجہ چندولعل شاداں نے خلعت اور ایک ہزار روپئے ماہوار سے نوازا۔[1] ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں حفیظ کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا۔ شیخ حفیظ کو دکن میں "شیخ دکن" کہا جاتا تھا۔

حفیظ نے اپنی اکثر غزلوں میں عقیدت مندی کے طور پر لطف کا ذکر کیا ہے۔ حفیظ مہاراجہ چندولعل شاداں کے استاد تھے۔ حیدرآباد کی شعری محفلوں کے روحِ رواں تھے۔ اپنی تازہ غزلوں کو حفیظ خاص طور پر لطف کو سنایا کرتے تھے اگر کسی شعر پر لطف داد دیتے اور اس شعر کو پسند کرتے تو بطورِ خاص اس کا ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر حفیظ کہتے ہیں:

حفیظ الطاف ہے مرزا علی لطف کا مجھ پر
سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جنابِ شاہِ مرداں کا[2]

دوسری جگہ حفیظ، لطف کی داد اور پسندیدگی کو اس طرح اہمیت دیتے ہیں۔

سُن کے یہ مرزا علی لطف فرمانے لگے
داد ہم دیتے نہیں جب تک غزل بہتر نہ ہو[3]

۱۔ غلام حسین جوہر۔ "گلزارِ آصفیہ" (حیدرآباد) ص ۴۴۹ -

۲۔ دیوانِ حفیظ (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ، ص ۱۸ (ا)

۳۔ دیوان حفیظ۔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۷۰ (ب)

حفیظ سپاہی پیشہ تھے ایک موقع پر انھوں نے لطف کو اپنا کلام سنایا۔ لطف نے دل کھول کر حفیظ کے کلام کی داد دی کہ سپاہی پیشہ ہو کر بھی اتنے اچھے اشعار حفیظ لکھتے ہیں۔ حفیظ نے لطف کی اس داد کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

سنا جو لطف نے فرمایا آفریں مجھ کو
حفیظ شعر بھی کہتا ہے اور سپاہی ہے[۱]

حفیظ کا نمونۂ کلام :- دلِ جاناں سے جی اداس آیا
ہم کو آبِ بقا نہ راس آیا

چاک سینہ ہو گیا دل سے صدا آنے لگی
کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی

نہ میں دنیا کے قابل ہوں نہ میں عقبیٰ کا شائق ہوں
گرفتارِ خودی ہوں اور نہ پابند علائق ہوں

آفتِ جان کوئی حفیظ آج دوچار ہو گیا
ہاتھ دھرے دل پہ تم پھرتے ہو جو بیقرار سے

رکھے ہے لطف دے کر شورشِ دل اے حفیظ اپنی
اگرچہ آگ ہوں پر جلوۂ رنگِ شقائق ہوں

میرزو الفقار علی صفا لکھنوی

میرزو الفقار علی خاں لکھنو کے رہنے والے تھے صفا تخلّص کرتے تھے میر تقی میر کے شاگرد تھے ۔ میر عالم مدار المہام کے زمانے میں لکھنو سے حیدرآباد دکن آئے ۔ میر عالم کے

۱۔ دیوان حفیظ (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ ۔ ص ۱۴۳ (الف)

ملازم ہوئے ۔ میر عالم کے بعد مہاراجہ چندو لعل شاداں نے ان کی بڑی قدر دانی کی اور پانچ سو روپئے ماہوار مقرر کی اور اپنا مصاحب بنایا ۔ صفا صاحبِ دیوان ہیں انکی ایک مثنوی "چھومنتر" بہت مشہور ہے ۔ صفا کا حیدر آباد دکن میں ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں انتقال ہوا ۔ "مثنوی چھومنتر" کے آخر میں اپنے استاد میر کو مخاطب کر کے لکھا ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ میر اس وقت لکھنؤ میں زندہ تھے ۔

ہاں اگر کچھ حسرت اُستاد ہے
تو بجا ہے یہ محلِ بہار ہے
مثنوی یہ عشق کی تصویر ہے
قابلِ نذرِ جنابِ میرؔ ہے
سہو یہ باقی فقط افسوس ہے
لکھنو اب ہم سے لاکھوں کوس ہے[۵۱]

صفا کا نمونۂ کلام :-

صبح نالہ جو مرا گنج جنوں چھو نکلا
گُل نے بلبل کو یہ کاٹا کہ نہ لوہو نکلا
اے صفا کیوں نہ کلیجہ کے پرخچے اوڑ جائیں
پر خبردار اگر آنکھ سے آنسو نکلا
دردمندوں کے لئے درماں ہے یہ
دل کی بیماری کو حرزِ جاں ہے یہ
ہو جو والہ چشم کا یا آبروؤں کی آن کا
اپنی آنکھوں پر رکھے مطلع میرے دیوان کا[۵۲]

---

[۵۱] تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد پنجم) مثنوی چھومنتر ص ۲۴

غلام مصطفےٰ سخن

غلام مصطفےٰ حیدر آباد کے مشہور شاعر اور مرزا علی لطف کے ہم عصر تھے۔ سخن تخلّص کرتے تھے۔ ۱۱۴۷ ہجری / ۱۷۳۴ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخِ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ سخن کے ۱۲۴۳ ہجری تک بقیدِ حیات رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔[1]

سخن شاعری میں لالہ لچھمن نارائن شفیق کے شاگرد تھے ہر دور میں شعرائے اردو کی اپنے معاصرین شعراء کے ساتھ چشمکیں رہا کی ہیں چنانچہ لطف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ایک مشاعرے میں لطف اور صفا دونوں موجود تھے۔ سخن غزل سنا رہے تھے۔ جب سخن مقطع پر پہنچے تب لطف اور صفا دونوں محفل سے اٹھ کر باہر نکل گئے اس پر سخن نے مقطع میں دونوں پر چوٹ کی ہے۔ سخن لکھتے ہیں۔

سخن کے شعر سُن کر محفلِ اربابِ معنی میں
خجل ہو لطف نکلا، ایک طرف یک سو صفا نکلا[2]

اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ شاعرانہ چشمکوں کی وجہ سے سخن لطف کی قدر و منزلت نہیں کرتے تھے۔ لطف کے انتقال پر سخن کو بہت رنج وملال ہوا سخن کا یہ قطعہ ان کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

۱۔ دیوانِ سخن (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ۔) ص ۱۲ (ب)

۲۔ دیوانِ سخن (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۱۵ (ا)

لطف ما صد خوبی و لطف تمام
کرد منزل ہائے ہستی را چو طے
گفت سالِ رحلتش پیرِ خرد
رفت آن اہل کمال عصر ہے![1]
۱۲۴۳ھ

سخن کا نمونۂ کلام :۔

لطف اے جوشِ جنوں! ورنہ تیری باتوں میں
شہر کو چھوڑ کے صحرا میں نکل جاؤں گا
منکر محض ہیں جو طرزِ سخن کے سودا
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤنگا
بجائے خویش ہے بشاش ہر صغیر و کبیر
خیالِ خام کو اپنی سمجھ خیالِ اسیر
قیس سے کم ہوں کہ میں جو سے ٹل جاؤں گا
بے ستوں ہوں کہ جو فرہاد سے ہل جاؤنگا
دل اپنا صاف ہے اس سے وہ بدظن ہو تو بدظن ہو
وہ اپنا یارِ جانی ہے جو دشمن ہو تو دشمن ہو[2]

۱۔ دیوانِ سخن ۔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۱۶۳ (ب)

۲۔ دیوانِ سخن ۔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

ماہ لقا بائی چندا

مرزا علی لطف کے ہم عصر شعراء میں ماہ لقابائی چندا بھی ہے۔ ماہ لقا بائی راج کنور بائی کی بیٹی اور نواب بسالت خاں بہادر کے صلب سے تھی جن کا لقب شجاع الملک تھا۔ ماہ لقا بائی چندا ۲۰ رذی قعدہ ۱۱۸۱ھ ہجری م ۱۷۶۸ء کو حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئی[1]۔ یہ فنِ شعر گوئی میں شیر محمد خاں کی شاگرد تھی اور نواب میر عالم بہادر مدار المہام ریاست حیدرآباد سے بھی چندا نے اصلاح لی۔ میر عالم نے مہ لقا کے سراپا کا بیان اپنی ایک مثنوی میں کیا ہے جو "مثنوی میر عالم" کے نام سے مشہور ہے۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی چندا کو اپنی مصاحبت میں رکھتے تھے۔ سفرِ پانگل سے واپسی پر انھوں نے چندا کو ماہ لقابائی کا خطاب دیا اور نوبت د گھڑیال سے سرفراز کیا۔ ۱۲۱۷ ہجری مطابق ۱۸۰۳ عیسوی میں ایک شاندار جشن منایا گیا جس میں چندا کو خطاب اور خلعت عطا کیا گیا۔ عطائے نوبت کی تاریخ ایک شاعر نے لکھی تھی جس سے ۱۲۱۷ھ ہجری (مطابق ۱۸۰۳ء عیسوی) اعداد نکلتے ہیں۔

نوید آمد بعالم مہ لقا را
نوازش کرد از نوبت شہنشاہ

۱۔ غلام صمدانی خاں گوہر "حیاتِ ماہِ لقا" (حیدرآباد ۱۹۰۶ء)

ترانہ ساز نالش گفت ناہید
بلند آوازہ نوبت باد دلخواہ

جب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی نے ۱۲۱۷ہجری چنداکو بطور اعزار نوبت عطا کی اور "مہ لقا بائی" کا خطاب دیا تب مرزا علی لطف نے ایک قطعہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لطف کہتے ہیں۔

نوبت نے جو مہ لقا کے باصد شوکت
زیر و بم آسمان سے چاہی رفعت
ناہید نے ہنس کر مشتری سے یہ کہا
اب لیلیٰ وشیریں کی کہاں ہے نوبت[1]

۱۲۳۶ہجری مطابق ۱۸۲۰عیسوی میں چنداکا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا۔ اور دامن کوہ مولا علی میں دفن ہوئی۔

چنداکا نمونۂ کلام:۔

ثابت قدم ہے جو کوئی چنداکے عشق میں
صف میں وہ عشق بازوں کی سالار ہی رہا
میری نازک مزاجی کی خبر رکھتا نہیں ہرگز
وہ سنگین دل نہیں ممکن کسی کا ہو کبھی عاشق
شاہ و گدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پہ
عاشق ہے نیم جان نئی لَے سے تان بھر

۱۔ دیوانِ لطف۔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۱۲(ب)

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے[1]

مہاراجہ چندولال شاداںؔ

چندولال نام اور تخلّص شاداں تھا۔ قوم کے کھتری تھے۔ راجہ راجایاں اور مہاراجہ بہادر خطابات تھے۔ شہنشاہ اکبر کے وزیر راجہ ٹوڈرمل کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاداں کے دادا رائے لچھمن رام کروڑگیری کے محکمہ میں ملازم تھے۔ شاداں ۱۱۷۵ ہجری میں پیدا ہوئے ان کے والد رائے نارائن داس کا کمسنی ہی میں انتقال ہوگیا ان کے چچا رائے نانک رام نے ان کی پرورش کی۔ اپنی ملازمت کا آغاز بحیثیت محرر کے کیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے نظامت کروڑگیری کی خدمت پر ان کا تقرر ہوا۔ میرعالم مدارالمہام (وزیراعظم) کے زمانے میں یہ خدمت پیشکار سے سرفراز ہوئے۔ میرعالم کے بعد منیرالملک مدارالمہام ہوئے اس وقت چندولال ان کے دستِ راست تھے۔ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۰ء میں نواب سکندرجاہ نے مہاراجہ کا خطاب عطا کیا ایک کروڑ روپے علیحدہ بطورِ انعام دیئے۔ ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں منیرالملک کے انتقال کے بعد مہاراجہ چندولال مدارالمہام (وزیراعظم) بنائے گئے۔ ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں مہاراجہ بہادر نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔ شاہ نصیر دہلوی، میر احمد علی خاں شہید دہلوی اور حفیظ دہلوی ان ہی کی طلب پر حیدرآباد آئے تھے۔ عموماً روزانہ ان کے ہاں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ تین سو سے زائد شعراء کی وہ سرپرستی

۱۔ دیوانِ چندا (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

کرتے تھے ۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے شاداں کی داد و دہش و قدر دانی کا ذکر کیا ہے ۔ شاداں نے اپنے خاندانی حالات کو فارسی زبان میں قلمبند کیا ہے ۔ جو "عشرت کدہ آفاق" کے نام سے موسوم ہے ۔ شاداں صاحبِ دیوان تھے ۔ اردو میں ان کے دو دیوان اور فارسی میں ایک دیوان موجود ہے ۔[1]

شاداں کا نمونۂ کلام :-

شاداں ہوں اس واسطے میں صبح سے تا شام
بندے کو بھروسہ ہے ترے فضل و کرم کا

ہو کسی کو کس طرح معلوم ہو کھوٹا کھرا
جس نے پرکھا نقرۂ خالص کو وہ صراف تھا

کہا ہے مرشدِ کامل نے گوشِ دل میں مرے
تو ڈھونڈتا ہے کہاں اس فکر میں ہے وہ شوخ

ہو کل کی خبر آج کسی کو نہیں ممکن
کیا ہونے کو ہے ہووے گا کیا کچھ نہیں معلوم

ارے شاداں نہ ڈر ہرگز کسی سے
کسی کا کوئی ہے تیرا خدا ہے

پاؤں میں میرے قناعت کی لگی ہے مہندی
تو جو کہتا ہے مجھے دوڑ تو میں جاؤں کہاں[2]

۱۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت "مہاراجہ چندولال شاداں" (مقالہ برائے پی ایچ ڈی) ۱۹۵۹ء

۲۔ مہاراجہ چندولال شاداں "دیوان شاداں" (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

شاہ کمال

شاہ کمال الدین حسین کمال بھی لطف کے ہم عصر تھے۔ شاہ کمال کڑہ مانک پور کے رہنے والے تھے[1]۔ کڑہ مانک پور لکھنو کے قریب واقع ہے۔ شاہ کمال کے والد کا نام نواز خاں تھا[2]۔ لکھنو میں میر۔ سودا کا دور شاہ کمال نے دیکھا۔ لکھنو سے شاہ کمال سیر و سیاحت کرتے ہوئے ۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۰ء میں حیدر آباد پہنچے۔ اسکے ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں مرزا علی لطف حیدر آباد آئے۔ شاہ کمال نے اپنے حیدر آباد آنے کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

> "جس وقت زمانے کی نیرنگی کی وجہ سے فقیر (شاہ کمال) لکھنو چھوڑ کر شہر حیدر آباد آگیا تو یہ بھی (لطف) ایک اتفاق ہے کہ ایک سال بعد اسی شہر حیدر آباد میں وارد ہوئے۔ ان سے (لطف) پہلی ملاقات امجد علی خاں کے مکان پر ہوئی جہاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا فقیر (شاہ کمال) کے ساتھ لطف نہایت لطف اور محبت کیساتھ پیش آئے تھے۔"

شاہ کمال کا انتقال حیدر آباد ہی میں ہوا۔ کمال کا دیوان اور غیر مطبوعہ تذکرہ "مجمع الانتخاب" ان کی یادگار ہے۔

کمال کا نمونۂ کلام:۔

---

[1]۔ شاہ کمال "مجمع الانتخاب" (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۶۱۸ (ب)۔

[2]۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۶۸۰ (و)۔

گرد پھرتے وہ کبھی دیتا نہیں ہرگز کمال

جستجو میں جس کے بت پھرتے ہیں سرگرداں ہم

کمال اوس کا جھکے سر کس کے آگے

جو بندہ ہو علی مرتضیٰ کا

جلوہ ترا تو ہم کو ہر اک سو نظر پڑا

دیکھا جدھر ادھر ہی مجھے تو نظر پڑا

مرنے جینے پر نہیں رکھتے کچھ اپنے دھیان ہم

جان پر کھیلتے تمہارے عشق میں لوجان ہم

میر شمس الدین محمد فیض :-

میر شمس الدین نام تھا فیض تخلص کرتے تھے۔ فیض کے دادا مولوی رحمت اللہ دہلوی نظام الملک آصفجاہ اول کے زمانے میں حیدرآباد آئے۔ سرکار سے منصب عطا ہوئی فیض کے والد میر امیر الدین کو بھی موروثی منصب عطا ہوئی۔ فیض کی ولادت ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء بمقام ایلچ پور برار میں ہوئی۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ حیدرآباد میں اپنے والد کے ساتھ منتقل ہوگئے۔ ایک مدت تک حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی شاگرد خواجہ میر درد سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ بعد میں خود مرتبۂ استادی کو پہنچے۔ فارسی اور اردو کے دیوان کے علاوہ "طریق الفیض شرح عوامل شمس النحو" "شمس التصوف" "شمع منظومہ صرف" "رسالہ ناسخ و منسوخ" "رسالہ عروض و قافیہ" "مفید الاحکام حلت و حرمت" "خزینۃ الامثال" "اصلاحات اردو" "جدول نصف النہار" "فیض جاری" ان کی تصانیف ہیں۔ فیض تاریخ گوئی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں بہت سی تاریخیں موجود ہیں۔ فیض کو حضرت حافظ محمد علی خیرآبادی سے بیعت اور خلافت حاصل تھی۔ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں فیض کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا[۱]۔ حیدرآباد کے اکثر شعراء فیض کے شاگرد تھے۔ "دیوان فیض" ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ دوم (حیدرآباد۔ ۱۱۱۰ء) ص ۹۱۳ تا ۹۱۸

میں طبع ہوا۔ صفحات کی تعداد ۲۲۶ ہے۔

فیض کا نمونۂ کلام :-

صنم ہم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم
کریں پھر کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم!
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم
حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا
نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں
جو بُت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے
غمِ شیریں میں جو جو کوہ کن نے رنج جھیلے ہیں
بہت سے پاپڑ ایسے عاشقی میں ہم نے بیلے ہیں
عہدِ پیری میں ہوئی زائل حرارت عشق کی
دل نکل آیا چراغ اس گھر کا ٹھنڈا ہوگیا
موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے
فیض تو پہلے ہی فنا ہوگیا[1]

محمد صدیق قیس

محمد صدیق حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ قیس تخلّص کرتے تھے۔ محمد عاقل کے نواسے

---

[1] میر شمس الدین محمد فیض "دیوان فیض" (مطبع احمدی۔ حیدرآباد۔ ۱۳۰۰ھ)

اور شیر محمد خاں ایمان کے بھانجے اور ان کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز، موجود ہے۔ قیس صاحبِ دیوان ہیں۔ نواب امیر کبیر شمس الامراء بہادر نے دو روپیہ یومیہ قیس کو مقرر کیا تھا مہاراجہ چندو لال شاداں نے بھی قیس کو دو روپے یومیہ مقرر کئے تھے۔[۱] قیس کا انتقال ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء میں حیدر آباد ہی میں ہوا۔

قیس کا نمونہ کلام:-

کبھو بڑھتے ہیں اور کبھو گھٹتے
یہی اسلوب ہیں زمانے کے

ہستی کو عدم کو کوچ کرنا
اتنا تو بڑا سفر نہیں ہے

قیس کہتا تھا اپنی چھاتی دیکھ
صدقہ ہاتھوں کے اس نشانے کے

کہاں کا جیب کدھر کا رفو کہاں ٹانکا
جنوں کے ہاتھ سے باقی نہ ایک تار رہا

ہے جوشِ جنوں کل سے شاید کہ بہار آئے
ڈھیلے ہوئے جاتے ہیں ٹانکے بھی گریباں کے

دیکھا جو رات شمع نے داغِ جگر کو قیس
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے[۲]

۱۔ غلام حسین خاں جوہر "تاریخ گلزارِ آصفیہ" (حیدر آباد) ص ۴۵۴

۲۔ محمد صدیق قیس "دیوانِ قیس" قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ

شاہ نصیر دہلوی

شاہ نصیر الدین نام تھا۔ نصیر تخلّص کرتے تھے۔ "میاں کلّو" کے نام سے بھی مشہور تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ غریب کے فرزند تھے۔ نصیر، شاہ محمد مائل کے شاگرد تھے۔ شاہ عالم کے زمانے میں دہلی میں نصیر کافی شہرت رکھتے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد شاہ نصیر مہاراجہ چندولال شاداں کے زمانے میں حیدرآباد آئے۔ مہاراجہ بہادر نے شاہ نصیر کو دہلی سے حیدرآباد آنے کے لئے سفر خرچ کے طور پر سات ہزار روپئے دلوائے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ بہادر نے یومیہ پچیس روپئے مقرر کردئے تھے۔ شاہ نصیر اکثر سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہتے تھے۔ حیدرآباد میں سب ہی شعراء ان کی تعظیم کرتے تھے۔ حیدرآباد ہی میں شاہ نصیر کا ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء انتقال ہوا۔ حیدرآباد کے اکثر شعراء ان کے شاگرد تھے۔[۱]

شاہ نصیر کا نمونۂ کلام:۔

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

باغِ دنیا مقیّد نہیں وارستہ مزاج
نکہتِ گُل کو نہ دیکھا کوئی یکجا ٹھہرے

۱۔ غلام حسین جوہر "گلزارِ آصفیہ"

مل بیٹھنے یہ دے ہی فلک ایک دم کہاں
کیا جانے تم کہاں ہو کو دم میں ہم کہاں

آپ کا کون طلب گار نہیں عالم میں
ایک بندہ ہی خطا کار نہیں عالم میں

ہرگز مراجعت نہ عدم رفتگاں نے کی
حیراں ہے چشمِ نقشِ قدم انتظار میں

نہیں ہے فکرِ زادِ راہ کچھ یارانِ محفل کو
یہ اس مہمان سرا میں رہ کے صاحبِ خانہ ہو بیٹھے

عشق بتاں میں ہے لبِ خشک و چشمِ تر
دی ہے خدا نے سلطنتِ بحر و بر مجھے[1]

میر احمد علی خاں شہید

میر احمد علی خاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ شہید تخلّص کرتے تھے۔ سیّد جعفر علیخاں بہادر کے فرزند تھے۔ دہلی کے معزز خاندان سے شہید کا تعلق تھا۔ شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا[2]۔ شاعری کے علاوہ نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ ہر شعر نزاکت و لطافت سے بھرا پڑا ہے۔ دہلی سے شہید حیدر آباد دکن آئے۔ نواب سکندر جاہ نے سرپرستی کی۔

۱۔ شاہ نصیر "دیوانِ نصیر" (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ)

۲۔ شاہ نصیر کے یوں تو کئی شاگرد تھے لیکن ان کا مکمل دیوان خود نصیر کے ہاتھ لکھا ہوا ان کے شاگرد شہید دہلوی کے سوا اور کسی شاگرد کے پاس نہ تھا۔ اس دیوان کو پہلے پہل شہید دہلوی کے نبیرے حکیم الشعراء رعد نے حیدر آباد سے شائع کیا۔ اس دیوان کی اشاعت نئے برسوں بعد

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

دربار سے منصب مقرر ہو گئی۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں جب سکندر جاہ کا انتقال ہوا تب ان کے جانشین نواب ناصر الدولہ بہادر نے شہید کو "امیر الشعراء" کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور منصب میں اضافہ کیا۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۴ء میں میر احمد علی خاں شہید کا حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔[۱]

شہید کا نمونہ کلام:۔

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

بتوں کو کیا کوئی الزام دے کہ ہے معدوم
وفا کی جنس خدائی کے کارخانے میں

کھینچ کر اپنا ہاتھ دنیا سے
پاؤں پھیلا دیا فراغت ہے

کھو چکے سودائے باطل میں سب اپنا نقدِ عمر
پھر بھی یاروں کو ابھی فکرِ زیاں و سود ہے

لاکھ آفت ہو تو انسان نہ ہراساں ہوئے
کام مردوں سے بنے ہے مگر اوسان کیساتھ

خدا شگفتہ کرے میرے کو یا نہ کرے
یہ التجا ہے کہ منت کشِ صبا نہ کرے

نامرد کی ہوئی زن دنیا نہ مرد کی
اس بیوا کا نے گئے دونوں جہاں سے داغ

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۷) لکھنو اور دہلی سے بھی نصیر کا دیوان چھپا۔

۱ عبد الجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ اول (حیدرآباد۔ ۱۹۱۰ء) ص ۶۲۸۔۶۲۳

کیا میں آیا تھا کرنے کو یارب
اور چلا ہوں یہاں سے کیا کر کے
آخر کو ہے ایک دن جدائی
کیا کوئی کسی سے دل لگائے![1]

میر سجاد علیخاں سجاد

میر سجاد علی میر عباس علی خاں بہادر کافی کے حقیقی بھائی تھے سجاد تخلص کرتے تھے حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کا شمار حیدر آباد کے معزز امرا میں تھا۔ کافی کی طرح سجاد بھی حیدر آباد کی ادبی محفلوں کے رُوحِ رواں تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں نے ان کو سو روپئے ماہوار مقرر کی تھی۔ نواب سکندر جاہ کے دربار میں خانی و بہادری کا خطاب ملا۔ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء میں ان کا حیدر آباد ہی میں انتقال ہوا۔[2]

سجاد کا نمونۂ کلام :-

ہے جو مریض خال و خط یار اے مسیح
بہتر ہے اوس کے حق میں تمہاری دوا سے مشک
آوے گر اس کے کوچۂ گیسو کے باغ میں
ٹپکے بجائے دانۂ شبنم قبا سے مشک

۱۔ میر احمد سلیخاں شہید "دیوانِ شہید" (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)
۲۔ عبد الجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" (حصہ اول حیدر آباد ۱۹۱۱ء)

ناصحا مغز خراش تو عبث کرتا ہے
پند سننے کی ترے تاب کہاں ہے مجھکو
گرنہ ہوئے تو بہار میں خزاں ہے مجھکو
نکہتِ تختۂ گل موجِ نہاں ہے مجھکو
ساکنِ کوچۂ جاناں کو چمن سے کیا کام
بابِ جنّت دہن شیریں زباں ہے مجھکو[1]

نواب میر عباس علی خاں کافی

نواب میر عباس علی خاں کافی حیدرآباد کے معزز امراء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانی رئیس ہونے کے باوجود علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں اعلیٰ لیاقت رکھتے تھے۔ کافی نے نواب سکندر جاہ اور مہاراجہ چندو لال شاداں کی مدح میں قصائد لکھے۔ نواب سکندر جاہ نے خانی و بہادری کے خطاب سے سرفراز کیا۔ مہاراجہ چندو لال شاداں نے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کی۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں میں وہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں کافی نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔[2]

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزّمن" حصّہ اوّل حیدرآباد

۲۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزّمن" حصّہ دوم (حیدرآباد ۱۹۱۰ء) صفحہ ۹۴۶

کافی کا نمونۂ کلام:۔

نہیں معلوم لگی کس کے جگر میں شمشیر
آج پھر باندھی ہے قاتل نے کمر میں شمشیر

اس حیا پیشہ کا مفتون ہے دلِ ناداں میرا
دیکھنا آئینہ کا ہے جس کو بھی عارِ نظر

شب جو نقشہ چشم میں اس شعلہ رو کا پھر گیا
اب تلک جیوں موئے آتشِ دیدہ ہے تارِ نظر

لگا دی سوزشِ داغِ جگر نے آگ سب تن میں
ہوا آخر یہ شعلۂ برق سوزاں اپنے خرمن میں

بھرا اس چشم میں کس شوخ کا تھا شوق نظارہ
کہ جیوں سیماب تڑپے ہے مرا ہر اشک دامن میں[1]

میر عباس علی خاں احسان

میر عباس علی خاں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ احسان تخلص کرتے تھے۔ نواب صمصام جنگ کے فرزند تھے۔ کم عمری ہی میں شعر گوئی کا بھی شوق ہوا۔ مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ ہجو گوئی کا بھی شوق تھا۔ سودا کی طرح احسان بھی جب کسی سے ناراض ہو جاتے تب اس کی ہجو کہہ دیتے تھے۔ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے اعظم الامراء ارسطو جاہ کی نسبت چند اشعار لکھے وہ احسان کے نزدیک نامناسب

۱۔ عبدالجبار ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ دوم (حیدر آباد ۱۹۱۰ء) ص ۹۴۷

تھے۔ احسان نے شفیق کی ہجو لکھ دی۔

پر اس پر بھی ارسطو جاہ دانا
بڑی فطرت میں اسکندر سے نکلے
اڑا دوں یاں سے یوں مضمونِ مطلب
حذف جیسے کسی گوہر سے نکلے
ریاست پھر نئے سر سے جو چمکی
چراغِ خضر ہر گھر سے نکلے

سنہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں احسان کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔[۱]

احسان کا نمونۂ کلام:-

آستین سے تری باہر جو کلائی ہوتی
شمع فانوس سے باہر نکل آئی ہوتی
نکل آیا وہ یوں خورشید تاباں
کہ مہ بدلی کے جیسے گھر سے نکلے
تری تضمین پر تحسینِ احسان
محبت حیدرِ صفدر سے نکلے[۲]

۱۔ غلام حسین جوہر "گلزارِ آصفیہ" حیدر آباد، ص ۴۵۵

۲۔ عبدالجبار ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ اوّل حیدر آباد ۱۹۱۰ء ص ۲۳۸

خواجہ احسن اللہ، بیآن

خواجہ احسن اللہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ بیان تخلّص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاں کے شاگرد اور مولانا فخر الدین اورنگ آبادی کے مرید تھے۔ بیان ایک سنجیدہ شاعر تھے۔ دکن میں آنے کے وجوہ انھوں نے ایک طویل قصیدہ میں بیان کئے ہیں۔ دکن کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

سو ایسی دولتِ جاویدیاں دکن میں ملی
کہ ایک شخص کو پایا ہے بے عدیل و نظیر

سنہ ۱۲۶۰ ہجری / ۱۸۴۴ء میں حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔[۱]

بیان کا نمونۂ کلام :-

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی
ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تجھ سے ہم نشیں
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے
مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا کہ کیوں دلگیر ہے

۱۔ عبد الجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصّہ اول۔ ص ۳۰۸

جا کہو کوئے یار میں کوئی ٭ مرگیا انتظار میں کوئی

کیا دیکھتے ہو دل کو مرے تم الٹ پلٹ
آیا ہے گر پسند تو اے مہرباں رہے
مجھے غم سے اس واسطے پیار ہے
کہ مرے بُرے وقت کا یار ہے[1]

شاہ تجلّی علی - تجلّی

شاہ تجلّی علی - حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ تجلّی تخلّص کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ تصویر کشی میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ خطاطی میں بھی استاد تھے۔ شاہ تعین تجلّی کے مرید تھے۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی ایک شاہکار تصویر بنائی جس پر نواب نے ان کو پانچہزار روپئے انعام دئے تھے۔ آصف جاہ ثانی کے علاوہ ان کے قدر دانوں میں اعظم الامراء ارسطو جاہ بھی تھے۔ تاریخ دانی میں بھی شاہ تجلّی ماہر تھے۔ "تزک آصفیہ" شاہ تجلّی ہی کی تالیف ہے ارسطو جاہ نے شاہ تجلی کی اس تالیف پر پچاس ہزار روپئے دلوائے۔ اس تاریخ کی ترتیب ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء میں شاہ تجلّی نے شروع کی اور ۱۲۰۸ھ ۱۷۹۳ء میں مکمل کیا۔ نواب ارسطو جاہ نے اس کو نواب نظام علی نظامِ ثانی کی خدمت میں پیش کیا جنھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ اس تاریخ میں آصف جاہ ثانی کے زمانے میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں اس کے حالات موجود

---

[1] خواجہ احسن اللہ خاں بیانؔ دیوان بیان (قلمی مخزونہ کتب خانۂ آصفیہ)

ہیں۔ بعض معرکوں کی انھوں نے تاریخیں بھی نکالی ہیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شاہ تجلی ان معرکوں میں آصف جاہِ ثانی کے ساتھ شریک تھے۔ شاہی مجلسوں کی بھی تفصیل اس تاریخ میں نظر آتی ہے۔ شاہ تجلی کا ایک اور کارنامہ نواب ارسطو جاہ بہادر کی مداح میں مختلف شعراء کے لکھے ہوئے قصائد کی ترتیب ہے۔ شاہ تجلی نے اس کو "مجموعۂ فصاحت" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ اس کے تین نسخے حیدرآباد میں موجود ہیں۔ سب سے بہتر نسخہ کتب خانہ سالارجنگ میں ہے دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں، تیسرا نامکمل نسخہ "اسٹیٹ آرکیوز" میں ہے۔ یہ مجموعہ ڈیڑھ سو شعراء کے قصائد پر مشتمل ہے۔ شاہ تجلی کی مقبولیت کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ ان کی لڑکی کی شادی میں نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی شریک ہوئے اور پچاس ہزار کا سلوک کیا۔ ۱۲۱۵ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں شاہ تجلی کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا۔[1]

تجلی کا نمونۂ کلام:۔

گر دمل گلبدن دے مجھے ایکبار دست
ہر مو سے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست

ہولی اور نوروز کیا توام مل آئے اب کے سال
جوش سے روئیدگی کے اٹھ گئی ہے اعتدال[2]

اشعار غزل کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:۔

"تلاش کے باوجود ان کی غزلوں کا مجموعہ دستیاب نہ ہوسکا جو دیوان عام طور پر

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ اول (حیدرآباد ۱۹۱۰ء) ص ۳۲۴ تا ۳۲۶
۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری شاہ تجلی علی تجلی "مرقع سخن" (حیدرآباد ۱۹۳۵ء) ص ۵۶، ۵۷

شاہ تجلّی کا مشہور ہو گیا ہے وہ دراصل میر حسن عرف میر حاجی تجلّی کا ہے جو میر تقی کے خواہر زادہ اور شاگرد احمد حسین کلیم کے فرزند تھے[1]۔"

راقم الحروف کو تجلّی کی غزل کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے :۔

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک
پھیلا رہا ہے سرولبِ جوئے بار ہات[2]

اس شعر کو سعادت خاں ناصر نے اس طرح نقل کیا ہے :۔

دامن کا کس کے عکس پڑا ہے کہ چرخ تک
پھیلا رہا ہے سرو لبِ جوئے یار ہاتھ[3]

لچھمی نارائن شفیق

لچھمی نارائن نام، شفیق تخلّص کرتے تھے۔ قوم کے کھتری تھے۔ ان کے والد کا نام منسا رام تھا جو نظام الملک آصفجاہ اول کے ملازم تھے۔ ۱۱۵۸ مطابق ۱۷۴۵ء میں لچھمی نرائن اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ حضرت میر غلام علی آزاد بلگرامی کے لائق شاگرد تھے۔ پہلے "صاحب" تخلّص اختیار کیا تھا مگر آزاد بلگرامی نے شفیق تخلص عطا کیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شفیق کے دیوان موجود ہیں۔ شاعری کے علاوہ شفیق نے نثر نگاری میں بھی مہارت پیدا کی ان کی تالیفات میں ماثر آصفی، ماثر حیدری،

۱۔ عبدالقادر سروری، شاہ تجلی علی تجلی "مرقع سخن" (حیدرآباد ۱۹۳۵ء) ص ۵۵۔
۲۔ باطن حکیم قطب الدین "تذکرہ گلستان بے خزاں" (لکھنو ۱۲۹۱ء) ص ۵۵۔
۳۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (مرتبہ شمیم انہونوی) (لکھنو ۱۹۷۱ء) ص ۶۶۷۔

تذکرہ گل رعنا، تذکرہ چمنستان شعراء، تذکرہ شام غریباں قابلِ ذکر ہیں۔ شفیق اورنگ آباد[1] سے حیدرآباد آگئے تھے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا[51]۔

شفیق کا نمونۂ کلام:-

گلشن تری نگاہ سے میخانہ بن گیا
نرگس کا پھول بادہ کا پیمانہ بن گیا[52]

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت
ہم چلے تم کو تو اب کرکے دعا یا قسمت

آخری ہے ٹک دیکھ بھلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھیں دیکھ میخانے میں دھوم[53]

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری "محبوب الزمن" حصہ اول (حیدرآباد ۱۳۲۹ھ) ص ۵۷۹

۲۔ تمنا اسد علی خاں "گل عجائب" (مرتبہ عبدالحق اورنگ آباد ۱۹۱۸) ص (ج)

۳۔ شفیق، لچھمی نارائن "چمنستان شعراء" (مرتبہ عبدالحق ۱۹۱۸ء)

لطف کی وفات

لطف کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

لطف کے ہمعصر غلام حسین جوہر لکھتے ہیں :۔

"درسنہ یک ہزار و دو صد و بست و ہشت ہجری وفات کرد۔"[۱]

(۱۲۲۸ ہجری مطابق ۱۸۱۲ عیسوی)

عبدالجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرے میں لطف کا سنہ وفات ۱۲۳۸ ہجری مطابق ۱۸۲۲ عیسوی درج کیا ہے۔[۲]

محمد عبداللہ خاں ضیغم نے بھی لکھا ہے کہ لطف ۱۲۳۸ ہجری مطابق ۱۸۲۲ عیسوی میں فوت ہوئے۔[۳] لیکن غلام مصطفیٰ اسخن کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لطف کا صحیح سنہ وفات ۱۲۳۳ ہجری مطابق ۱۸۱۷ عیسوی ہے۔

غلام مصطفےٰ اسخن نے لطف کی وفات پر جو قطعہ تاریخ قلمبند کیا تھا وہ ان کے دیوان میں شامل ہے :۔

۱۔ گلزارِ آصفیہ ۔ (حیدرآباد ۱۸۵۲ء) ص ۴۵۰

۲۔ محبوب الزمن (حصہ دوم) حیدرآباد ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۲

۳۔ یادگارِ ضیغم (قلمی مخزونہ ادارہ ادبیات اردو) ص ۵۵۲

لطف با صد خوبی و لطفِ تمام
کرد منزل ہائے ہستی را چو طے

گفت سال رحلتش پیر خرد
وقت آں اہلِ کمال عصر ہے[1]

۱۲۳۳ ہجری

مرزا علی لطف کی سیرت

مرزا علی لطف کی سیرت اور اخلاق کے بارے میں ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے بہت ہی اچھی رائے دی ہے۔ شاہ کمال جوان کے ہمعصر شاعر اور تذکرہ نگار ہیں لکھتے ہیں:۔

"جوانِ خوش فکر و خوش مزاج و عمدہ
معاش و در نظم و نثر یکتائے روزگار است[2]۔"

لطف کے ہمعصر شاعر و تذکرہ نگار غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ میں لطف کی متانت اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مرزا علی لطف جوانِ خوش فکر دیدمش طبیعتش نسبت دیگر شعرائے اینجا متانتے دارد[3]۔"

ذوالفقار علی مست، لطف کی شرافت اور نکتہ سنجی کے معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا علی لطف مردی بالطافت و شرافت مزاج ممتاز نکتہ سنج یگانہ انیس معنی بیگانہ خوش صحبت و خوش انداز است[4]۔"

۱۔ "دیوان سخن" (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۶۳ (ب)۔
۲۔ "مجمع الانتخاب" (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) ص ۶۷ (ب)۔
۳۔ تذکرۂ ہندی (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق (اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء) ص ۲۰۱۔
۴۔ تذکرۂ ریاض وفاق (مرتبہ سید حسن) (۱۹۶۷ء) ص ۳۷۔

عبدالجبار ملکاپوری نے بھی لطف کی خوش اخلاقی اور بذلہ سنجی کو ان الفاظ میں سراہا ہے :-

"آپ (لطف) خوش اخلاق و پسندیدہ شمایل و حمیدہ نضائل تھے۔ سلیم الطبع و حلیم المزاج۔ ظریف و لطیف تھے۔ بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی میں بے نظیر تھے۔ محفل کی زیب و زینت۔ یاران ہم مشرب کو آپ کی صحبت میں لطف و مزہ آتا تھا۔"[1]

مذہبی عقائد۔

مرزا علی لطف مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ جہاں جہاں موقع ملا ہے لطف نے اپنے شیعہ عقائد کو پیش کرنے کی گنجائش نکال لی ہے۔ ان کے والد کاظم بیگ خاں ہجری ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ ایران میں مذہب امامیہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے۔ لطف کے آبا و اجداد بھی شیعہ ہی تھے۔ لطف نے اپنے عقائد کو کلام میں پیش کرنا ایک مذہبی فریضہ خیال کیا ہے۔ حضرت علیؑ اور پنجتنِ پاک کی مدح اکثر جگھوں پر انھوں نے کی ہے۔ اپنی بے پناہ عقیدت کی بناء پر وہ حضرت علیؑ کی محبت کو شرطِ ایمان خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندو اور مسلمان میں یہی فرق ہے۔ ہندو حضرت علیؑ کو نہیں مانتے جب کہ مسلمان حضرت علیؑ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لطف لکھتے ہیں :-

محبتِ شہِ مرداں ہے شرطِ ایمان لطف
یہی ہے فرق مسلماں اور ہندو میں[2]

لطف ثانی حیدرِ کرار کسی اور کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اپنے ایک شعر میں

۱۔ "محبوب الزمن" حصہ دوم (حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء) ص ۹۲۱

۲۔ "دیوانِ لطف" (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۴ (ب)

وہ کہتے ہیں:۔

چشم اور گوش زمانہ ہیں متواس کے لطف
ثانیِ حیدرؑ کرار نہ دیکھا نہ سنا[1]

لطف نے غزل قصیدہ مثنوی تینوں اصناف میں حضرت علیؑ کی مدح سرائی کی ہے۔ مذکورہ بالا اشعار غزل کے ہیں۔ اسی طرح کئی مقامات پر لطف نے حضرت علیؑ کی مدح کی ہے ایک غزل میں کہتے ہیں۔

ہے لطفِ علیؑ قوت بازوئے ضعیفاں
ہر مور کہے کیوں نہ سلیماں سے گئے ہم[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

لطف تو اور آستانِ علیؑ
واں ملائک جبیں رگڑتے ہیں[3]

ایک قصیدہ میں جو انھوں نے نواب میر عالم کی تعریف میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں۔

تری بھی مدح اے عالی نسب داخل انھوں میں ہے
بحمد اللہ کہ میں مداح ہوں اولادِ حیدرؑ کا[4]

تاہل۔ لطف کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا وہ متاہل تھے اور ان کی اولاد بھی تھی صرف ایک تذکرہ میں ثریا بیگم ثریاؔ کو لطف کی زوجہ لکھا ہے

۱۔ "دیوانِ لطف" (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۴ (ب)
۲۔ "دیوانِ لطف" (قلمی مخزونہ کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی) ص ۹ (ب)
۳۔ "دیوانِ لطف" ص ۱۰ (الف)
۴۔ "دیوانِ لطف" ص ۱۹ (الف)

جو درست نہیں ہے۔

صاحب تذکرہ ماہ درخشاں سید نور الحسن خاں لکھتے ہیں۔

"ثریا تخلّص ثریا بیگم دہلویہ زوجہ مرزا علی خاں لطف" [1] لیکن سید نور الحسن خاں کی تقلید میں کسی بھی تذکرہ نگار نے ثریا کا تعارف مرزا علی لطف کی زوجہ کی حیثیت سے نہیں کرایا ہے۔ صرف مرزا علی خاں لکھا ہے۔ لطف تخلّص نہیں لکھا ہے۔

ثریا کا اصلی نام بنّڑی بیگم تھا۔ ان کے شوہر لطف علی خاں دلّی کے وظیفہ خوار تھے۔ غالباً ناموں کے اشتراک سے یہ اشتباہ ہوا کہ وہ مرزا علی لطف کی زوجہ ہیں۔

درگا پرشاد نادر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"ثریا تخلّص بنّڑی بیگم نام زوجہ مرزا علی خاں مرحوم وظیفہ خوار شاہ دہلی کا ہے۔ جو غدر کے بعد کسی اپنے عزیز کے پاس آگرہ چلی گئی بہ حالت بیوگی شاعری سے بھی تائب ہوگئی۔ نیک بختوں کا ایسا ہی شیوہ ہوتا ہے۔ اور روزِ جزا ایسی ہی باتوں میں منہ اجلا رہتا ہے۔" [2]

درگاہ پرشاد نادر کی طرح محمد جمیل احمد [3] و حکیم فصیح الدین [4] نے بھی ثریا کے شوہر کو مرزا علی خاں وظیفہ خوار شاہ دہلی ہی لکھا ہے۔ جن کا غدر ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا۔ جبکہ مرزا علی لطف کا انتقال ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء بہ مقام حیدرآباد دکن ہوا۔ اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سید نور الحسن خاں کو اشتباہ ہوا ہے جس کی تقلید کسی دوسرے تذکرہ نگار نے نہیں کی ہے۔

۱۔ تذکرہ "ماہِ درخشاں" (بھوپال۔ ۱۲۹۰ ہجری) ص ۱۲

۲۔ "مرات خیال" (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۷۹

۳۔ "تذکرہ شاعرات اردو" (۱۹۴۴ء) ص ۱۶۵

۴۔ "تذکرۂ بہارستانِ ناز" (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۱۰ (ب)

لطف کے تلامذہ

لطف صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں جن شعراء کے نام ملتے ہیں۔ ان میں عشرت بریلوی، عیش دہلوی، حسرت دہلوی اور کرم قابلِ ذکر ہیں۔ میر غلام علی عشرت بریلوی کے والد کا نام میر معظم علی تھا۔[۱] انھوں نے میر ضیاء الدین عبرت کی ناتمام مثنوی شمع و پروانہ یعنی پدماوت کو ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء میں مکمل کیا ان کا دیوان دستیاب نہیں ہوتا۔ تذکروں میں چند اشعار ملتے ہیں۔ عشرت کا انتقال ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء میں ہوا۔ "ہائے میر عشرت" سے وفات کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے شعرائے اردو کے جو انتخابات شائع کئے ہیں ان میں عشرت بریلوی کے دیوان کا انتخاب بھی شامل ہے۔ یہ جملہ ۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔[۲]

نمونۂ کلام یہ ہے:-

اس کی تصویر میں خونریزی کے سب چاؤ نکال
اے مصوّر مری گردن پہ کئی گھاؤ نکال

جن کے گھر دو نتو ہم آپ سے جانے کے نہیں
کیا غضب ہے کہ وہ کہتے ہیں بلانے کے نہیں

۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ (دہلی ۱۹۶۲ء) ص ۱۶۱۔

۲۔ انتخابات شعرائے اردو ص ۶۹، ۷

مطلق نہیں ہے پرواہ سیرِ چمن کی عشرت
ہم داغِ دل کو اپنے گلزار جانتے ہیں
عشرت نہ کیوں کہ کوچۂ جاناں کو جائے دل
ہوتی ہے سب کو اپنے محبت دیار کی

عشرت بریلوی کے شاگردوں میں محمد امیر الدین آزاد[1]۔ مائل لکھنوی[2] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لطف کے دوسرے شاگرد فرحت کا نام فرحت اللہ تھا[3]۔ دہلی کے متوطن تھے[4]۔ سرور نے لکھا ہے کہ اکثر شعراء ان سے اصلاح لیا کرتے تھے[5]۔

فرحت کا نمونۂ کلام:۔

یہ میری لوحِ تربت پر کھدانا
کسی سے کوئی دل کو مت لگانا

منہ دیکھنے کی اس کی مجھ کو ہے اضطرابی
اے جاں بلب رسیدہ کیوں تجھ کو ہے شتابی

اس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے
اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا

۱۔ عبدالغفور نساخ سخن شعراء (لکھنو ۱۸۷۴ء) ص ۲۲
۲۔ غلام ہمدانی مصحفی (ریاض الفصحا) (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق) (دہلی ۱۹۳۴ء) ص ۲۷۴۔
۳۔ سعادت خاں ناصر خوش معرکہ زیبا (مرتبہ شمیم انہونوی) (لکھنو ۱۹۷۱ء) ص ۶۹۵
۴۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ گلشنِ بے خار (مرتبہ محمد احسان الحق فاروقی) کراچی ۱۹۶۲ء) صفحہ ۳۴۹
۵۔ عمدۂ منتخبہ (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) (دہلی ۱۹۶۱ء) ص ۴۵۵

نہ پنپا دل اپنا نہ پنپا یہ فرحت
لگی کیا ہے کافر نظر تجھ کو کی

عیش کا پورا نام مرزا احمد عسکری تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لطف کے علاوہ قدرت سے بھی انھوں نے مشورۂ سخن لیا تھا[1]۔

عیش کا نمونہ کلام:۔

کہنے کو تو ادھر ادھر گئے ہم
تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

کرم کو حسرت موہانی نے لطف کے شاگردوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ تذکرہ آثار الشعراء میں سید محمد ممتاز علی نے کرم کو لطف کا شاگرد قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"شعر و سخن میں مرزا لطف علی خاں لطف دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۶۵ مطابق ۱۸۴۹ء کو ان کا انتقال ہوا[2]۔"

کرم کا نام غلام ضامن تھا۔ ان کا قیام دہلی، حیدرآباد اور بھوپال میں رہا۔ حیدرآباد میں وہ پانسو روپئے ماہوار پاتے تھے۔ بھوپال میں وہ اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہنگامۂ غدر میں ان کے دو دیوان تلف ہوگئے۔

کرم کی ایک غزل کے مقطع سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ وہ لطف کے تلامذہ میں تھے۔

۱۔ حسرت موہانی اُردوئے معلی (کانپور جون ۱۹۲۷ء) ص ۱۰۔

۲۔ تذکرہ آثار الشعراء (بھوپال ۱۳۰۴ ہجری) ص ۱۹۰۔

کرم کو جان غنیمت بقولِ حضرت لطف
کہ ایسے گم شدہ ہوتے ہیں پھر کہاں پیدا[1]

کرم کا نمونۂ کلام :۔

دہن کا اوس کے سر مو نہ ہو بیاں پیدا
برنگ غنچہ اگر ہووے سو زباں پیدا
کہیں ہیں دیکھ کے میری غزل کے شعر بلند
اسی زمین سے ہوتا ہے آسماں پیدا

لطف تخلّص کے دیگر شعراء

تذکروں میں لطف تخلّص کے ایک سے زیادہ شاعروں کا ذکر ملتا ہے ان میں دو لطف بریلوی اور میر امن لطف دہلوی ایسے ہیں جن کے بارے میں بعض اصحاب کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ مرزا علی لطف ہیں ذیل میں ان شعراء کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جن کا تخلّص لطف تھا اور جن کا حال تذکروں میں درج ہے۔

(۱) **لطف** لطف تخلّص میر امن نام دہلی کے رہنے والے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشی تھے۔ اپنی تصانیف " باغ و بہار" اور " گنج خوبی " کے لئے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو مرزا علی لطف اور میر امن لطف کے کلام میں تسامح ہوا ہے۔ انھوں نے میر امن لطف کو مرزا علی لطف سمجھا۔ اپنی انگریزی کتاب " دی اسٹرینجرز ان

۱۔ تذکرۂ آثار الشعراء۔ (بھوپال ۱۳۰۴ ہجری) ص ۱۹۱

ینلیل ایسٹ انڈین گائیڈ" کے صفحہ ۲۸۹ پر انھوں نے میر امن لطف کی ایک غزل انگریزی رسم الخط میں دی۔ مرزا علی لطف کی غزلوں سے اس غزل کا مقابلہ کیا گیا یہ غزل لطف کی نہیں ہے۔

نمونۂ کلام:۔

ہمارا گھر تو ہے حوروں کی آنکھ کی پتلی
گلی میں میکشوں کی کیوں کہ ہو وطن میرا
نہ سمجھا یہ کہ کہاں تھا اب کہاں آیا
ہزار حیف کہ دنیا نہیں وطن میرا
خطا نہیں جو مرے خون دل سے اشک کی بو
ملے تجھے کہ ہے دل نافۂ ختن میرا

(۲) لطف | لطف تخلص لطف علی خاں نام تھا ان کا شمار امرائے ایران میں تھا۔ "مقالات شعراء" مؤلفہ قیام الدین حیرت اکبرآبادی میں ان کا ذکر ہے۔ جس کو نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔

نمونۂ کلام:۔

خانۂ خانم زغم کردی خراب
خوب کردی خانہ ات آباد باد[۱]

(۳) لطف | میر لطف علی خاں نام تھا' لطف تخلص کرتے تھے۔ سیّد سعداللہ خاں ہمشیرہ زادہ سید شہاب الدین خاں مرید جانشیں سید شاہ نور محمد خموی کے پوتے تھے۔ درویش خاں صوبہ دار کے نواسے تھے ان کلام پختہ و پسندیدہ ہے۔ عربی فارسی کے عالم تھے۔ ان کی وفات ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔

---

[۱] ص ۵۷

نمونۂ کلام :-

حاجت بہ فیضِ شعلہ ندارد چراغِ ما
روشن چو لالہ ز آتش خویش است داغِ ما

از فیضِ عشق منتِ صہبا نمی کشم
پُر می شود بہ گردشِ چشمی ایاغِ ما[1]

(۴) لطف لطف تخلّص، لطف علی نام تھا۔ فارس کے رہنے والے تھے۔

نمونۂ کلام :-

کچھ اثر اس کا نہ دیکھا یار کے دل میں تو آہ
ہو جیو خانہ خراب اس آہ بے تاثیر کا

وہ مزہ پایا ہے میں نے یار کی تلوار میں
سرگرانی اس نے میری دُور کی اک وار میں[2]

(۵) لطف لطف تخلّص، حفیظ اللہ نام تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ مطبع عزیزی میں ملازم تھے۔[3]

نمونۂ کلام :-

وہ پڑھ کے سطر کون سی چین بر جبیں ہنسیں
ہر چند خط میں حرفِ شکایت کہیں نہیں

(۶) لطف لکھنوی لطف تخلّص تھا۔ میر لطف علی خاں نام، لکھنو کے رہنے والے تھے۔ لکھنو سے دہلی آکر بود و باش اختیار کرلی تھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے

۱۔ عبدالجبار ملکاپوری "محبوب الزمن" حصّہ دوم (حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء) ص ۹۷۴

۲۔ نواب عنایت حسین خاں "مدایح الشعراء" (قلمی مخزونہ کتب خانہ رام پور) نقل بہ شکریہ اکبر علی خاں عرشی زادہ۔ ص ۳۵ (ب)

۳۔ مرزا قادر بخش صابر "گلستانِ سخن" (لکھنو ۱۲۷۱ھ) ص ۴۰۷

واقعات پر ان کی ایک نظم موجود ہے جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئی تھی۔ اس مجموعہ میں[93] مختلف شعراء نے اپنی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب "فریادِ دہلی" معروف بہ "انقلابِ دہلی" کے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی۔

نمونۂ کلام:-

حیف ہے اٹھ گئے کیا پیر و جوانِ دہلی
خاک باقی نہ رہا نام و نشانِ دہلی
اٹھ گیا لطف محبت نہ رہا دل کو قرار
کون ہے جس کو نہ پہنچا ہے تکانِ دہلی[1]

(۷) لطف لطف تخلّص تھا۔ منشی لطف اللہ نام تھا۔ انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ملازم سرکار ہونے سے قبل نواب میر جعفر علی خاں بہادر کے ملازم تھے۔[2]

نمونۂ کلام:-

خانہ میں عصافیر کے سیمرغ چھپے ہیں
جب کھینچے ہیں ہم تیر کو آہ سحری کے
سرسبز بیاباں ہے تیرے دیدۂ تر سے
یہ لطف تصدق ہیں تیری چشمِ تری کے

(۸) لطف بریلوی لطف تخلّص، لطف علی نام تھا۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔ لطف بریلوی کے دیوان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔[3]

۱۔ ص ۸۶
۲۔ قاضی نورالدین حسین رضوی فائق "مخزن الشعراء" مرتبہ مولوی عبدالحق اورنگ آباد ۱۹۳۳ء ص ۹۵
۳۔ ایم اے نصر نے غلطی سے لطف بریلوی کے دیوان کو مرزا علی لطف کا دیوان سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب میں انھوں نے جس لطف کے دیوان کی تفصیل پیش کی ہے اور نمونۂ کلام دیا ہے وہ لطف بریلوی ہیں نہ کہ مرزا علی لطف (ملاحظہ ہو: لفظ و پیکر صفحہ ۷۶ تا ۷۸)

لطف علی خاں لطف بریلوی کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے[۱]۔ اسکا داخلہ نمبر ۱۴۹ ہے۔

نمونۂ کلام:-

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا
سرِ احمدؐ پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

اس شاعری کو لطف ہمارا سلام ہے
کہتے ہیں جسکو اہلِ شریعت حرام ہے

عاشق ہوں دل سے اُس شہِ عالی وقار کا
اے لطف جو حبیب ہے پروردگار کا

تری دوری ستاتی ہے حبیب کبریا مجھ کو
بہت دل تنگ رہتا ہے مدینے میں بلا مجھ کو

اے لطف فنِ شعر میں تم لاجواب ہو
مضمون لکھو وہ لغت میں جو انتخاب ہو[۲]

(۹) لطف لطف تخلّص، نواب محمد لطف الدین خاں نام تھا۔ لطف جنگ

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب (ملاحظہ ہو: تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول (حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ ہجری) (ص ۱۲ و ۱۳)۔ میں برار کے رہنے والے میر لطف علی خاں لطف کا ذکر کیا ہے جن کی (۷) اشعار کی نعتیہ غزل دی گئی ہے۔ نمونۂ کلام کے موازنہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اشعار لطف براری کے نہیں بلکہ لطف بریلوی کے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "محبوب الزمن" جلد دوم ص ۹۷۳ کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں بھی ڈاکٹر زور کو تسامح ہوا ہے۔ محبوب الزمن کے صفحہ ۹۷۳ و ۹۷۴ پر جس لطف کا ذکر ہے وہ فارسی زبان کے شاعر تھے ان کا ذکر سلسلہ نمبر (۳) میں آچکا ہے۔

لطف الدولہ ان کے خطابات تھے ۔ حیدر آباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ۔ امیر پائیگاہ و صدر المہام عدالت و امور مذہبی سرکار عالی کی حیثیت سے بہت مقبول تھے ۔ ان کی ولادت ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء کو اور وفات ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۱ء کو ہوئی ۔

دیوان نواب لطف الدولہ "لطف" "لطف سخن" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں زیرنگرانی نواب احمد یار جنگ بہادر (فرزند لطف) شایع ہوا ۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبد القادر سروری نے لکھا ہے ۔

نمونۂ کلام :-

ہم نشیں مونس و ہمدم مرے سب نام کے ہیں
میں وہ غمخوار ہوں، میرا کوئی غمخوار نہیں
مقصود ہے یہ مجھے کہ نہ جاگیں عدو کے بخت
اے غمگسار اس لئے لب پر فغاں نہیں
کثرت رنج ہوئی مانع اظہارِ الم
اب تو رونے کی بھی طاقت دلِ ناداں میں نہیں
لب پہ حرفِ مدعا تک بھی نہیں آتا میرے
اس بتِ بے رحم کی شرم و حیا کو دیکھ کر
اب غیر بھی روتے ہیں مرے حالِ زبوں پر
افسوس ابھی تک انھیں باور نہیں ہوتا

دوسرا حصّہ

کارنامے

لطف کی تذکرہ نگاری

تذکرہ نگاری اور اس کا فن

مختلف اصنافِ سخن کی طرح تذکرہ نگاری کا رواج بھی اردو ادب میں عربی اور فارسی کے زیر اثر ہوا۔ عربی لغت میں تذکرہ کے معنی یاد کرنا، پاسپورٹ ٹکٹ اور ضرورت کو یاد دلانے والی چیز کے ہیں[۱]۔ عربی میں تذکرے کی اصطلاح اس مفہوم میں مستعمل نہیں ہے جس مفہوم میں وہ فارسی یا اردو میں مروج ہے۔ عربی میں اس نوع کی تصانیف کے لئے طبقات۔ انساب۔ معجم وغیرہ اصطلاحیں رائج ہیں جیسے طبقات الادبا۔ انساب سمعانی، معجم الادبا وغیرہ۔

فارسی لغات میں تذکرہ کے معنی یاد آوری۔ یادداشت جو کہ یاد آوری کا سبب بننے کے ہیں۔ فرہنگ عمید میں لکھا ہے کہ تذکرہ اصطلاحاً ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں شعراء کے حالات جمع کئے جائیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ ایک اصطلاح بن گیا اور تذکرہ اس تاریخ کو کہا جانے لگا جس میں شعرا کے حالات نمونۂ کلام اور کلام پر تبصرہ شامل ہو[۲]۔

ایک صنف کے لئے تذکرے کی اصطلاح کب سے رائج ہوئی اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فارسی میں قدیم ترین کتاب جسے تذکرے سے موسوم کیا گیا ہے شیخ فریدالدین عطارؒ کی "تذکرۃ الاولیاء" ہے جو ساتویں صدی

۱۔ الاب لوئین معلوف الیوعی المنجد للہ یۃ الکاتولیکتہ (بیروت ۱۹۵۶ء) ص ۲۳۶

۲۔ حسن عمید فرہنگ عمید ساتواں ایڈیشن (ساربان انتشارات جاویدان تہران) ۱۳۵۳ خورشیدی ص ۲۸۷

ہجری میں لکھی گئی۔[1]

شعرائے فارسی کا پہلا تذکرہ جو تا حال دستیاب ہوا ہے محمد عوفی کا "لباب الالباب" (۶۱۸ ہجری) ہے[2]۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کا رواج اس لئے ہوا کہ شعرا کے کلام سے عوام کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ عوام ہر شاعر کے نئے کلام کے منتظر رہتے تھے۔ موجودہ سائنسی دور کے برعکس اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع انتہائی محدود تھے جس کی وجہ سے شعرا کے کلام کو عام قاری تک پہنچانا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے شائقین نے جن میں اکثر شعراء تھے محض اپنے ذوق کی تسکین کیلئے اپنے پسندیدہ شعرا کے کلام کو یکجا کرنا شروع کیا۔ پسندیدہ شعرا کے کلام کا انتخاب مرتب خود ہی اپنے ذوق کے مطابق کرتا تھا۔ اس قسم کے ذوق کو "بیاض نویسی" کا نام دیا گیا یہ تذکرہ نگاری کی ابتدائی منزل تھی۔ بیاض نویسی اور تذکرہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں۔

"تذکرہ نویسی کی طرح بیاض نویسی کو بھی ترقی ہوئی جو لوگ عمدہ تذکرے نہ لکھ سکتے تھے وہ اپنے ذوق کی تشفی کے لئے بیاض مرتب کرلیا کرتے تھے۔ جن میں اپنی پسند کے اشعار اور غزلیں شاعر کے نام اور مختصر حالات کی قید سے جمع کرلیتے تھے لیکن بیاض کے لئے خاص ترتیب مقرر نہ تھی جامع اور مرتب نے جس طرح چاہا مرتب کرلیا۔ اسی طرح شعرا کے کلام کا عمدہ انتخاب بے ترتیب یا کسی خاص ترتیب

۱۔ ڈاکٹر اکبر حیدری "شعرائے اردو کا ایک نایاب تذکرہ "خوش معرکہ زیبا"۔ تحقیقی جائزے جلد اوّل (لکھنو ۱۹۶۸ء) ص ۱۰

۲۔ فرمان فتح پوری "تذکرہ نگاری" (تذکروں کا تذکرہ نمبر) نگار پاکستان سالنامہ (۱۹۶۴ء) ص ۸

کے تحت جمع کرلیا کرتے تھے۔ جس کے ساتھ کبھی کبھی شعرا کے مختصر حالات بھی دئے جاتے تھے مگر عموماً صرف نام دیا جاتا تھا۔"[۱]

تذکرہ نگاری کے محرکات:۔

فرمان فتح پوری نے تذکرہ نگاری کے چھ محرکات بتاتے ہیں۔[۲]

(۱) اس فن کا اولین محرک بھی انسان کا وہی فطری جذبہ ہے جو اپنے بعد اپنی ایسی یادگار چھوڑ جانا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام تا قیامت دعاؤں کے ساتھ لیا جائے وہ زندہ جاوید ہو جائے بقول میر

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

(۲) فنِ تذکرہ نگاری کا دوسرا بڑا محرک انتخاب اشعار یا بیاض نگاری کا ستھرا ذوق بھی رہا ہے انتخاب اشعار کی رسم اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود شعرگوئی کی انتخاب شعر دراصل تخلیقی عمل کا ایک جز ہے جسے شعری تنقید کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیئے۔

(۳) فنِ تذکرہ نگاری کو ترقی دینے میں شعرا کی معاصرانہ چشمک باہم رقابت گروہ بندی اور علاقائی تعصب کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ ولی کے عہد کے بعد سودا و میر کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک اس کے اثرات ادبی تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تذکرہ نگاری کے محرکات میں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی اس شاعرانہ فضا کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے جس میں شاعری عوام و خواص دونوں کا اوڑھنا اور بچھونا بن گئی تھی۔

(۵) فنِ تذکرہ نگاری کو ترقی دینے میں شاعروں نے بھی اہم رول انجام دیا ہے مشاعروں کا رواج بھی اردو شاعری کی تاریخ میں ابتداء سے ملتا ہے اور اس رواج نے تذکرہ

---

[۱] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۹۔ [۲] تذکروں کا تذکرہ نمبر "نگار" (پاکستان ۱۹۶۴ء) ص ۷ تا ۲۲

نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے۔ دہلی تو ان مشاعروں یا مراختوں کا مرکز تھی اور خان آرزو ہی کے زمانے سے وہاں جگہ جگہ شعری محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں۔

(٦) جب فارسی کی مقبولیت میں کمی واقع ہونے لگی اور ریختہ گو شعرا کو قبول عام نصیب ہوا تو فارسی کے مقابلے میں بھی انھیں بھی تذکروں کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ گویا فارسی کی تقلید نے اردو میں تذکرہ نگاری کو جنم دیا اور کچھ دنوں بعد ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جنھوں نے تصنیف و تالیف کے فطری جذبے کے تحت اردو شعرا کے تذکرے مرتب کرنے شروع کئے اور ان کی کوششوں سے اس باب میں اتنا مواد جمع ہو گیا کہ اسے ایک مستقل فن کی صورت حاصل ہو گئی۔

فارسی اور اردو کے نمائندہ تذکروں کو سامنے رکھ کر تذکرہ نگاری کے بنیادی لوازم اور شرائط کا تعیّن کیا جا سکتا ہے اور اس کو معیار بنا کر کسی تذکرے کی وقعت اور اہمیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ کسی اچھے اور معیاری تذکرے سے ہم یہ توقع رکھیں گے کہ وہ شاعروں کی حیات اور شخصیت کے بارے میں تشفی بخش معلومات مہیا کرے مثلاً یہ کہ جس کسی شاعر کا حال لکھا جا رہا ہے وہ کہاں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کس طور پر اور کہاں ہوئی تھی۔ اس کے خصائل اور اخلاق و عادات کیسے تھے شاعر کا ماحول، اس کی صحبت اور اس کی زندگی کس طریقے سے گزری اس نے ادب کو اپنے دورِ حیات میں کیا کیا عطا کیا۔ شاعر کے دور میں سیاسی حالات کیا تھے۔ اس کا ذہنی ارتقاء کس شخصیت کے زیر اثر ہوا۔ اس کے دور کے اخلاقی، مذہبی انقلابات کیا تھے۔ جس سے وہ متاثر ہوا۔ شاعر کے کلام میں اور اس کی حیات میں کیا محاسن معائب ہیں۔ اسکے معاصر کی رائے اس کے بارے میں کیا تھی۔ تذکرہ جس دور میں لکھے گئے اس زمانے میں کسی زبان کے ادب کی تاریخ اور ملک کی ادبی تاریخ کا تصور یا وجود نہیں تھا۔ یہ تصوّر زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ اس لئے قدیم تذکروں کو ان معیاروں پر پرکھنا

مناسب نہیں ہوگا جس معیار پر ہم کسی زبان کے ادب کی تاریخ یا کسی ملک کی ادبی تاریخ کو پرکھتے ہیں پھر بھی اپنی تمام کوتاہیوں اور نقائص کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تذکرے موجود نہ ہوتے تو آج ہمارے ادب کی تاریخ ناقص اور تشنہ رہ جاتی۔ تذکروں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہمارے ادب کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان سے ہمارے قدیم تمدن اور معاشرت پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ تذکروں کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تذکروں ہی میں ادبی و علمی حلقوں کے مشاغل اور تفریحوں کا حال ان علمی مجلسوں، مشاعروں اور مراختوں کی سرگذشت مل جاتی ہے ان کے اخلاق اور کمزوریاں، ان کی رقابتیں اور کشمکش، وضع داریاں اور پاس داریاں، ان کے توہمات و تکلفات اور دید وادید کے طریقے، باہمی سلوک و مراعات ان کے رد و قبول اور پسند و ناپسند کے معیار، غرض سارے نظام معاشرت کا روشن تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلاشبہ یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی قابلِ قدر یادگاریں ہیں ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"[1]

جب اردو تذکروں کی عام خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا جاتا ہے تو ہم کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرے رواج کے مطابق فارسی میں لکھے گئے قدیم تذکروں میں شعرا کے حالاتِ زندگی و نمونۂ کلام دیتے وقت حروفِ تہجی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر بعد کے دور میں حروفِ تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر کیا جانے لگا۔

۱۔ شعرائے اردو کے تذکرے ۔ ص ۱۱۰ و ۱۱۱

قدیم تذکروں کی اہم خصوصیات بیان کرتے ہوئے ایم۔ کے فاطمی لکھتے ہیں :۔

"قدیم تذکروں میں عام طور پر تین چار خصوصیات مشترکہ ہوتی ہیں شاعر کے حالاتِ زندگی شاعر کی شخصیت اور اس کے ماحول کا بیان، کلام پر رائے اور تنقید اور آخر میں ان کا انتخاب کلام"[1]

فارسی میں تذکرہ نگاری نے باضابطہ فن کی حیثیت اختیار کرلی۔ فارسی شعرا کے بے شمار تذکرے لکھے گئے۔ چند قابلِ ذکر تذکروں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) لباب الالباب ۔ نورالدین محمد عوفی (۶۱۸ھ)

(۲) تذکرۃ الشعرا ۔ دولت شاہ سمرقندی (۸۹۲ھ م ۱۴۸۷ء)

(۳) خلاصۃ الشعار و زبدۃ الافکار ۔ تقی کاشی (۹۷۳ھ تا ۹۸۲ھ م ۱۵۶۵ء تا ۱۵۷۴ء)

(۴) کلمات الشعرا ۔ محمد افضل سرخوش (۱۰۹۳ھ م ۱۶۸۲ء)

(۵) ریاض الشعرا ۔ علی قلی خاں والہ داغستانی (۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۹ء)

(۶) مجمع النفائس ۔ سراج الدین علی خاں آرزو (۱۱۶۴ھ م ۱۷۵۲ء)

(۷) خزانۂ عامرہ ۔ غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۷۶ھ م ۱۷۶۲ء)

(۸) سفینۃ المحمود ۔ محمود مرزا (۱۲۳۵ھ م ۱۸۱۹ء)

(۹) نغمۂ عندلیب محمد رضا بن ابوالقاسم (۱۲۶۱ھ م ۱۷۴۵ء)

(۱۰) روضۃ السلاطین فخری بن امیری ہروی (نامعلوم)

(۱۱) مجمع الفصحا رضا قلی خاں ہدایت (۱۲۵۸ - ۸۸ھ م ۱۷۷۱ء - ۱۷۴۱ء)

(۱۲) ریاض العارفین رضا قلی خاں ہدایت (۱۲۶۰ھ م ۱۷۴۴ء)

---

[1] اردو تذکروں میں نکات الشعرا کی اہمیت (لکھنو ۱۹۶۲) ص ۳۷

اگرچہ اردو میں شعر گوئی کا باضابطہ رواج پندرھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ لیکن طویل مدت تک اردو شعرا کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب شمالی ہند کے شعرا اردو میں شعر کہنے لگے اور شمالی ہند کے اردو شاعروں کی تعداد اتنی کثیر ہو گئی کہ ان کا تذکرہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شمالی ہند کے شاعر اور تذکرہ نگار دکن کے قدیم شعرا سے کم ہی واقف تھے۔ وجہی، نصرتی، ولی، سراج ایسے ہی چند نام تھے جن کے نام اور کلام سے وہ آشنا تھے۔

اردو میں ابتداً جو تذکرے لکھے گئے ان میں ہر لحاظ سے فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی تھی اور چوں کہ اس وقت تک شمالی ہند میں اردو میں نثر نگاری کا رواج نہیں ہوا تھا اور فارسی کو درباری زبان ہونے کے علاوہ علمی زبان کا مرتبہ حاصل تھا اس لئے دیگر علمی تصانیف کی طرح تذکرے بھی فارسی میں لکھے جانے لگے۔ یہ اردو میں تذکرہ نگاری کا آغاز اٹھارویں صدی کے نصف سے ہوتا ہے۔

اردو تذکرہ نگاری کا آغاز فارسی کی تقلید میں ہونے کے اسباب جو بھی ہوں لیکن اس کا انداز تقریباً وہی رکھا گیا۔

عام طور پر میر تقی میر کے تذکرے "نکات الشعرا" کو اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مانا جاتا ہے۔ خود میر نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے:۔

> "فنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بہ زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد دہلی کتابے تاحال تصنیف نہ شد کہ احوال شاعراں ایں فن بہ صفحۂ روزگار بماند۔"[1]

اردو میں قدیم ترین تذکرے جو دستیاب ہوتے ہیں وہ میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا (۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۱ء) خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" (۱۱۶۵ء مطابق

---

[1] نکات الشعرا (مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی) (بدایون) ص ۱

۱۷۵۱ء) خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشنِ گفتار" (۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۱ء) افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی کا تذکرہ تحفۃ الشعرا (۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۱ء) ہیں۔ گارساں دتاسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے قبل بھی اردو تذکرے لکھے گئے تھے[1]۔ ان میں دو تذکروں کے نام ہم تک پہنچتے ہیں۔

۱۔ سید امام الدین کا تذکرہ[2]۔

۲۔ محمد یار خاں خاکسار کا تذکرہ[3]۔

۳۔ معشوق چہل سالہ۔

ان تذکروں کی عدم موجودگی میں "نکات الشعرا" "گلشن گفتار" اور "تحفۃ الشعرا" ہی اردو کے قدیم ترین تذکرے قرار پاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں تذکروں میں بہ اعتبار زمانہ تحریر کس کو اوّلیت حاصل ہے۔ تینوں تذکرے ایک ہی سال میں لکھے گئے ہیں۔ اسی زمانہ میں گردیزی اور قایم بھی اپنے تذکرے لکھ رہے تھے۔ گردیزی نے ۱۱۵۶ھ م ۱۷۴۳ء میں تکمیل کو پہنچایا اور قایم نے "مخزنِ نکات" کا کام ۱۱۵۷ھ م ۱۷۴۴ء میں شروع کیا تھا۔ یہ تذکرہ (۱۱۶۸ھ م ۱۷۵۵ء) میں مکمل ہوا۔ اگرچہ میر نے اپنا تذکرہ (۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء) میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل گردیزی اور قایم کے تذکروں سے پہلے ہوئی۔ اس وجہ سے "نکات الشعرا" دوسرے تذکروں پر سبقت لے گیا۔ سالِ آغاز کے اعتبار سے امتیاز علی خاں عرشی نے گردیزی اور قایم کے تذکروں کو میر کے تذکرے سے قدیم مانا ہے[4]۔ جو درست نہیں ہے۔ اوّلیت کا تعین تاریخ تکمیل کے لحاظ سے کیا جائے گا

۱۔ خطبات دتاسی ۔ ص ۴۳، ۷۴

۲۔ میر حسن ۔ تذکرۂ شعرائے اردو ۔ ص ۱۷۳

۳۔ میر تقی میر ۔ نکات الشعرا (ذکر خاکسار) ص ۱۲۴

۴۔ مقدمہ دستور الفصاحت ۔ (مصنفہ احمد علی یکتا) (رامپور ۱۹۴۳ء)

نہ کہ تاریخ آغاز سے ! ۔

نکات الشعرا ، گلشنِ گفتار اور تحفتہ الشعرا کے بعد اردو میں تذکرہ نگاری کی باضابطہ روایت قایم ہوئی اور صرف تیس برس کی مدّت میں کوئی سترہ اٹھارہ تذکرے مزید لکھے گئے ۔

ذیل میں ان تذکروں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے :۔

	نام تذکرہ		ہجری	عیسوی	زبان
۱	نکات الشعرا	میر تقی میر	۱۱۶۵	۱۷۵۲	فارسی
۲	گلشنِ گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	۱۱۶۵	۱۷۵۲	"
۳	تحفتہ الشعرا	افضل بیگ قاقشال	۱۱۶۵	۱۷۵۲	"
۴	تذکرہ ریختہ گویاں	سیّد فتح علی گردیزی	۱۱۶۶	۱۷۵۳	"
۵	مخزنِ نکات	قیام الدین قایم	۱۱۶۸	۱۷۵۵	"
۶	ریاضِ حسینی	عنایت اللہ فتوت	۱۱۶۸	۱۷۵۵	"
۷	تذکرہ مقالات الشعرا	قیام الدین حیرت اکبر آبادی	۱۱۷۳	۱۷۶۰	"
۸	چمنستانِ شعرا	لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی	۱۱۷۵	۱۷۶۲	"
۹	طبقات الشعرا .	قدرت اللہ شوق	۱۱۸۸	۱۷۷۴	"
۱۰	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	۱۸۸-۹۴	۱۷۷۴-۸۰	"
۱۱	گلِ عجائب	اسد علی خاں تمنّا	۱۱۹۲	۱۷۷۸	"
۱۲	تذکرہ شورش	سید غلام حسین شورش	۱۱۹۳	۱۷۷۹	"
۱۳	مسرّت افزا	ابوالحسن امیرالدین	۱۱۹۴	۱۷۸۰	"
۱۴	گلشنِ سخن	مرزا کاظم مبتلا	۱۱۹۴	۱۷۸۰	"
۱۵	گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیل	۱۱۹۸	۱۷۸۴	"

١٦ عقدِ ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	١١٩٩	١٧٨٥	فارسی
١٧ تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	١٢٠٩	١٧٩٤	"
١٨ تذکرۂ عشقی	وجیہہ الدین عشقی	١٢١٥	١٨٠١	"

یہ تمام تذکرے لطف کے گلشنِ ہند سے قبل لکھے گئے اور سب کے سب فارسی میں ہیں "گلشنِ ہند" اردو شعرا کا پہلا باضابطہ تذکرہ ہے جو اردو میں لکھا گیا۔ اس کا سنہ تصنیف ١٢١٥ھ م ١٨٠١ء ہے۔ اس سے ایک سال قبل یعنی ١٢١٤ھ م ١٨٠٠ء میں حیدر بخش حیدری نے بھی "گلشنِ ہند" ہی کے نام سے گلزارِ ابراہیم کی اردو میں تلخیص کی تھی اس میں حیدری کی تحقیق و تدوین کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جب کہ لطف نے "گلزارِ ابراہیم" سے استفادہ کیا ہے لیکن اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافے کئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ اس کی اپنی تالیف کہلائی جانے کی مستحق ہے۔

گلشنِ ہند کا ماخذ۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم اور اس کا مصنف

مرزا علی لطف کے تذکرے گلشنِ ہند کا ماخذ تذکرہ گلزارِ ابراہیم ہے۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم کے مؤلف علی ابراہیم خاں موضع شیخو پورہ عظیم آباد (پٹنہ) بہار میں ١١٤٨ھ مطابق ١٧٣٥ء میں پیدا ہوئے۔[1]

علی ابراہیم خاں شاعر بھی تھے خلیل تخلص کیا کرتے تھے۔ نواب امین الدولہ عزیز جنگ خان بہادر نصیر جنگ ان کے خطابات تھے۔ خلیل کے آبا و اجداد ایران سے ہندوستان آ کر بس گئے تھے۔ خلیل کے والد کا نام خواجہ عبدالحکیم تھا۔ ابھی وہ سات سال ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت داؤد علی خاں

١۔ غلام حسین، سیر المتاخرین (لکھنؤ) ص ٦١١

نے کی۔ ۱۱۶۱ھ مطابق ۴۹-۱۷۴۸ء میں داؤد علی خاں حج و زیارت کے لئے روانہ ہونے کے ارادے سے کلکتے آئے خلیل بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ ناظم بنگال کے مراسم داؤد علی خاں کے ساتھ گہرے تھے۔ ان ہی تعلقات[1] کی بنا پر انھوں نے خلیل کو نواب کے حوالے کیا اور خود حج و زیارت کے لئے روانہ ہوئے۔

بنگال ہی میں خلیل کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ نواب عالیجاہ میر محمد قاسم خاں کے زمانے میں علی ابراہیم خاں خلیل اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ نواب مظفر جنگ ناظم بنگال کے زمانے میں خلیل مختار اور مدارالمہام ہو گئے[2]۔ کچھ مدت تک علی ابراہیم خاں خلیل گوشہ نشیں بھی ہو گئے۔ اس گوشہ نشینی میں خلیل اپنا تمام تر وقت تصنیف و تالیف میں گزارا۔

وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل سے علی ابراہیم خاں خلیل کے دیرینہ مراسم تھے۔ وارن ہیسٹنگز ہی کے ہمراہ خلیل لکھنو چلے آئے۔ نواب آصف الدولہ نے خلعت فاخرہ عطا کی۔ شاہ عالم نے ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں خلیل کو امین الدولہ، عزیز الملک، خاں بہادر نصیر جنگ کے خطابات سے نوازا۔ ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے علی ابراہیم خاں خلیل کو ناظم ضلع بنارس مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی تنخواہ دو ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔ بنارس ہی میں علی ابراہیم خاں خلیل نے ۲۶ جمادی الاوّل ۱۲۰۸ھ مطابق یکم دسمبر ۱۷۹۳ء کو انتقال کیا[3]۔

جرأت کے ایک قطعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل نے ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں وفات پائی قطعہ کے اشعار یہ ہیں:۔

۱۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی۔ تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان (تہران) ص ۴۵۷

۲۔ امیر الدین احمد۔ "مسرت افزا" (مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی) دلی ۱۹۶۸ء ص ۹۵

۳۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی' تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان (تہران) ص ۴۵۹

افسوس صد افسوس گیا برجِ فنا میں
خورشید عدالت معہ تابانِ عدالت
کیا ظلم ہے یوں گلشنِ ہستی سے وہ اٹھ جائے
تھا جس سے کہ سر سبز گلستانِ عدالت
جو شمع سے پروانے کو دلوائے چراغی
ہو جائے وہ گل شمع شبستانِ عدالت
صد حیف کہ خاموش پڑا ہے وہ تہہ خاک
تھا گرمِ سخن جو کہ یہ ایوانِ عدالت
ہو گرمئی بازارِ سخن کیوں نہ پھر اب سرد
منصف نہ رہا تھا جو سخندانِ عدالت
جرأت نے بس افسوس کناں یہ کہی تاریخ
لو آہ مٹا مطلع ایوانِ عدالت[1]

افسر امروہی اور سرفراز علی رضوی جرأت کے اس قطعہ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہیں:۔

"اس قطعہ میں اگرچہ علی ابراہیم خاں خلیل کا نام نہیں آیا ہے لیکن دیوانِ جرأت کے مخطوطے میں جو انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے لکھا ہے"

"قطعہ تاریخ رحلت علی ابراہیم خاں کہ در بنارس از طرف صاحبانِ انگریز مختار عدالت بودند۔"

لیکن امتیاز علی خاں عرشی کو یہ تسلیم کرنے میں تامّل ہے کہ یہ قطعہ خلیل کی تاریخ وفات ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] ۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اوّل (کراچی ۱۹۶۵ء) ص ۱۲۱

"صاحبِ گلزار کی تاریخ وفات" ڈاکٹر اشپرنگر (ص ۱۸۰) اور بلوم ہارٹ نے جرأت کے مصرع تاریخ کی بنیاد پر :۔

"لو آہ مٹا مطلع ایوانِ عدالت" ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) بتائی ہے مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گلشنِ ہند کے مقدمہ میں اسی سنہ کو دھرایا ہے اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو نسخہ رامپور کے اس اضافے کو کسی بعد کے شخص کی طرف منسوب کرنا پڑے گا کیونکہ اس میں محیط الاسرار محیطِ معرفت اور محیط اعظم کے اقتباسات پائے جاتے ہیں جو علی الترتیب (۱۲۱۶ھ ۔ ۱۸۰۱ء) (۱۲۱۸ھ ۔ ۱۸۰۳ء) اور ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) کی تصنیف ہیں چوں کہ بالعموم متن کے اندر مصنّف کے سوا کوئی شخص اضافے کرنے کی جرأت نہیں کرتا یا کم از کم میرے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے کہ مابعد کے کسی عالم نے اپنا نام ظاہر کئے بغیر ایسا کیا ہو۔ اس لئے میں مصنّف کے ۱۲۰۸ ہجری میں فوت ہو جانے کی طرف سے مشتبہ ہو جاتا اگر لطف نے گلشنِ ہند مصنفہ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں علی ابراہیم خاں کو مرحوم نہ لکھا ہوتا۔ چونکہ تاریخ وفات یقینی معلوم ہوتی ہے اس لئے مجھے اس اضافے کرنے والے پر افسوس اور حیرت کا اظہار کرنا پڑتا ہے"۔[۱]

علی ابراہیم خاں خلیل کی حسب ذیل تصانیف کا اب تک پتہ چلا ہے۔

۱۔ گلزارِ ابراہیم :۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ۱۱۰۸ھ م ۱۷۸۴ء میں لکھا گیا۔ دلّی میں اس وقت شاہ عالم اور لکھنؤ میں آصف الدولہ کی حکمرانی تھی اس میں ۳۱۹ شعرا کے

۱۔ مقدمہ ۔ "دستور الفصاحت" (مصنفہ حکیم سید احمد علی خاں یکتا) رامپور ۱۹۴۳ء ص ۵۔

حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام موجود ہے

۲۔ تاریخ ابراہیم خاں :۔ اس زمانے کی مشہور تاریخ ہے جس میں خاص طور پر مرہٹوں کے حالاتِ زندگی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کے عہد میں لکھی گئی۔

۳۔ صحفِ ابراہیم :۔ فارسی زبان میں لکھا گیا تذکرہ ہے بقول قاضی عبدالودود صحفِ ابراہیم و گلزارِ ابراہیم میری رائے میں ایک ہی تذکرے کے دو نام ہیں (معارف نومبر ۱۹۲۲ء) ص ۳۹۶"

۴۔ تاریخ چیت سنگھ :۔ راجہ چیت سنگھ والئی بنارس کی انگریزوں کے خلاف بغاوت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ خلیل خود اس کے چشم دید گواہ ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) میں لکھی گئی

۵۔ رقعات :۔ علی ابراہیم خاں خلیل کے لکھے ہوئے خطوط ہیں جو انھوں نے بنارس سے کلکتے کو کرنل مورے کے نام لکھے تھے۔

علی ابراہیم خاں خلیل تذکرہ نگار ہونے کے علاوہ اردو اور فارسی کے ایک اچھے شاعر بھی تھے مگر انھوں نے اپنے تذکرہ گلزارِ ابراہیم میں اپنے کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا۔

نمونۂ کلام :۔

خلش رکھتا ہے جی سے دل مرا چوں خار پہلو میں
ہو ار کھتا اب اس دشمن کا کیا دشوار پہلو میں

لوگوں نے کہا خلیل ہو گا
بولا کہ وہ اب تلک یہاں ہے

لوگ آ گئے دو ہیں وہ اکیلا جو ملا
ملنے کو ملا یہ دم کی فرصت نہ ملی

۱۔ ابوالحسن امیرالدین، صسرت افزا (مترجم ڈاکٹر حبیب قریشی) ص ۹۶

لہو رونے سے میرے تر ہوا جیب و کنار آخر
خلیل آنکھوں کے آگے ہوگیا گلزار پہلو میں[1]

دل پُر درد ہو جس کا اُسے آرام کیا ہوئے
یہ سچ ہے کیوں کہ سو دے جسکے ہو بیمار پہلو میں

اڑ گئے کچھ حواس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے[2]

گلزارِ ابراہیم کے ترجمے اور ان کا موازنہ

مرزا علی لطف نے اپنا تذکرہ "گلشنِ ہند" ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۱ء میں لکھا۔ اس سے ایک سال قبل ۱۲۱۴ھ م ۱۸۰۰ء سید حیدر بخش حیدری اسی نام سے "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ اور تلخیص کر چکے تھے۔ حیدری فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منشی تھے۔ کالج کے لئے انھوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں "قصہ مہر و ماہ"، "لیلیٰ مجنوں"، "طوطا کہانی"، "آرائشِ محفل"، "ہفت پیکر"، "تاریخ نادری"، "گلِ مغفرت"، "گلزارِ دانش" اور "گلدستۂ حیدری" قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں "گلشن ہند" شامل نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ "گلدستۂ حیدری" کے بعض نسخوں میں "گلشن ہند" شامل تھا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ حیدری نے گلدستہ کا جو نسخہ پیش کیا اس میں تذکرہ "گلشنِ ہند" موجود تھا یا نہیں۔ یہ بات قطعی ہے کہ "گلشنِ ہند" نہ تو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوا نہ ہی

۱۔ قاضی عبدالودود، معارف (نومبر سنہ ۱۹۴۳ء) ص ۳۹۶

۲۔ ڈاکٹر اختر اورینوی "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" پٹنہ ۱۹۵۷ء ص ۳۲۶

"گلدستۂ حیدری" کے ساتھ طبع ہوا۔

تذکرۂ "گلشنِ ہند" جس کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ۱۹۶۷ء میں مرتب کیا ہے اس کو علمی مجلس دلی نے شایع کیا۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے گلشنِ ہند کے حسب ذیل چار نسخوں کی تفصیل دی ہے:۔

۱۔ پہلا نسخہ "انڈین انسٹی ٹیوٹ اسکفوڈ کا ہے[۱]۔ یہ نسخہ "گلدستۂ حیدری" میں شامل ہے۔ اس میں تذکرۂ حیدری (گلشنِ ہند) مکمل موجود ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ سے یہ نسخہ "باڈلین لائبریری" کو منتقل کر دیا گیا[۲]۔

۲۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے یہ نامکمل نسخہ ہے جو حرف ا (آفتاب) سے شروع ہو کر حرف س (سوز) کے حالات اور نمونہ کلام پر ختم ہو جاتا ہے حیدری کا دیباچہ اس میں شامل نہیں ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے اس نسخہ کا آغاز ہوتا ہے صفحہ اوّل پر "دی برٹش لائبریری" کی مہر ہے یہ تذکرہ گلدستۂ حیدری" سے علیحدہ کتابی شکل میں موجود ہے اور ۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ جس کا آغاز ورق ۲۱۴ سے اور اختتام ورق ۲۳۳ پر ہوتا ہے۔ اس کے جملہ صفحات ۳۹ ہیں آخر میں "احوالِ مؤلف" پر یہ تذکرہ ختم ہوتا ہے[۳]۔

۳۔ تیسرا نسخہ گارساں دتاسی کے ذاتی کتب خانہ میں تھا۔ جس کے صفحات کی تعداد ۴۶۳ ہے۔ اس گلدستہ میں یہ تذکرہ بھی نامکمل حالت میں ہے یہ نسخہ اب کہاں موجود ہے اسکا پتہ نہیں چلتا[۴]۔

۱۔ گلدستۂ حیدری (قلمی مخزونہ انڈین انسٹی ٹیوٹ اردو) نمبر ۵

۲۔ گلشنِ ھند (تمہید) (دلّی ۱۹۶۷ء) ص ۱۹

۳۔ (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم لائبریری) داخلہ نمبر ۲۱۶۱

۴۔ گلشنِ ھند (تمہید) دلّی ۱۹۶۷ء) ص ۱۰

۴۔ چوتھا نسخہ شیخ چاند مرحوم کی نظر سے گزرا تھا۔ یہ کھنبایت میں کسی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ شیخ محمد چاند مرحوم کے مطابق یہ بھی ناقص الآخر ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کی تلاش کے باوجود کھنبایت کا یہ نسخہ نہیں مل سکا اور نہ اس نسخے کے چھپنے کی ان کو اطلاع ملی[۱]۔

ان چاروں نسخوں میں سے اول الذکر دو نسخے ڈاکٹر مختار الدین احمد کی نظر سے گزرے ہیں۔ انھوں نے اوکسفوڈ کے نسخے کو بنیاد بنا کر اُس کا مقابلہ برٹش میوزیم کے نسخے سے کیا اور یہ تذکرہ ترتیب دیا ہے۔ اوکسفوڈ کا نسخہ ۱۲۱۴ھ (م ۱۸۰۰ء) کا لکھا ہوا ہے جب کہ برٹش میوزیم کا نامکمل نسخہ ۱۲۱۶ھ (م ۱۸۰۲ء) میں تحریر کیا گیا۔

ان چاروں نسخوں کے علاوہ ایک اور نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے۔ "برٹش میوزیم" کے نسخے کی طرح یہ نسخہ بھی "گلدستۂ حیدری" میں شامل نہیں بلکہ بالکل علیحدہ کتابی شکل میں موجود ہے جس پر واضح طور پر "گلشن ہند" لکھا ہے[۲]۔

تذکرہ کے آغاز سے قبل حیدر بخش حیدری کا ایک صفحہ کا دیباچہ موجود ہے۔ یہ ۱۲۱۴ ہجری مطابق ۱۸۰۰ء کا تالیف کردہ ہے اس میں (۲۸۹) شعر کے حالات اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مطبوعہ نسخے کی ترتیب اور اس مخلوطہ کی ترتیب حروف تہجی میں اکثر جگہ فرق ہے۔ اصل نسخہ "گلشنِ ہند" صفحہ (۱) (ب) سے صفحہ ۴۳ (الف) پر مشتمل ہے جملہ صفحات ۸۴ ہیں۔ تذکرہ کے اختتام پر قطعۂ تاریخ ہے اس قطعۂ تاریخ کے بعد "دو صرہ ہائے ضرب المثل" کے عنوان سے ۲۴ مشہور اشعار نقل کئے گئے ہیں ان اشعار کے بعد "چند نقلیات ضرب المثل" کے عنوان سے سات "قصے" بیان کئے گئے ہیں۔ ساتویں نقل کے بعد

۱۔ گلشن ہند (تمہید) (دلی ۱۹۶۷ء) ص ۱۹

۲۔ قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ اردو گلشن III داخلہ نمبر ۵۴۔

"تمام شد" لکھا ہے۔ ترقیمہ میں لکھا ہے روز چہارشنبہ ۱۲۵۶ ہجری۔

اس تذکرہ کی تاریخ تالیف حیدری کے "قطعہ تاریخ" سے واضح طور پر تعین کی جاسکتی ہے۔ حیدری لکھتے ہیں۔

مرتب کرچکا جب تذکرہ میں
زروئے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب
اسے کہتا ہے ہر اک گلشنِ ہند[1]
۱۲۱۴ = ۸ - ۱۲۰۶

ڈاکٹر مختارالدین احمد کا خیال ہے کہ "کم از کم ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۳ء) تک وہ (حیدری) اس پر (تذکرہ گلشنِ ہند پر) نظر ثانی کرتے رہے"[3]۔

حقیقت یہ ہے کہ حیدری نے ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں یہ تذکرہ لکھا اور نسخے اس کی نقل ہیں۔ بعد ازاں ۱۲۱۶ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں اس نے تذکرہ پر نظر ثانی کی لیکن یہ کام ادھورا رہ گیا۔ یہ نامکمل نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس تذکرے کے جو مخطوطے موجود ہیں وہ مختلف سنین کے ہیں اور مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب ۱۲۱۶ ہجری مطابق ۱۸۰۲ء میں انھوں نے نظر ثانی کی ہے۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی سنین میں تبدیلی کردی۔ مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور برٹش میوزیم کے نسخوں میں "آفتاب" کے بارے میں جو عبارت درج ہے برٹش میوزیم کے نسخے میں عبارت تو وہی ہے لیکن سنہ تبدیل کردیا گیا ہے۔ چنانچہ حیدری لکھتے ہیں:۔

مہر سپہر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی کہ بیالیس برس سے

۱۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد کے مطبوعہ نسخے میں "یک کے بجائے "ایک" چھپا ہے اور اسکے مطابق "ہر ایک گلشنِ ہند" نے اعداد ۱۲۰۷ نکالے گئے ہیں جب کہ وزن کے اعتبار سے "ایک" نہیں آسکتا۔ "اک" یا "یک" ہونا چاہیے۔
۲۔ گلشنِ ہند (قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) ص ۴۳ (۱)
۳۔ تمہید "گلشن ہند" (دلی ۱۹۶۷ء) ص ۱۷

"تاحال ۱۲۱۶ ہجری بارہ سو سولہ ہجری اوپر سریر سلطنت کے" مانند مہر سپہر کے جلوہ گر ہیں[1]"۔

وجہ تالیف :-

حیدری نے تذکرے کے دیباچہ میں وجہ تالیف کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے:-

"سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلف سید ابوالحسن نجفی ساکن دلّی شاگرد قبلہ کونین مولوی غلام حسین غازی پوری تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب ابراہیم علی خاں بہادر مرحوم سنہ بارہ سو چودہ ہجری میں اکیسویں رجب کو تری کی راہ بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا بعد قطع منازل غازی پور کے قریب پہنچا وہاں مرزا محمد علی مرزا محمد فاضل کے بیٹے دلّی کے رہنے والے سے کہ وہ بھی ایک کشتی پر سوار ہوئے اسی سمت کو آتے تھے ملاقات ہوئی صاحب سلامت پیدا کی یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جا بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مہربانی فرماتے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے۔ اس سبب سے ذکر شعر و سخن باہم ہوا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں ان کی سیر کرو اور اچھے اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کر کے ایک نسخہ بطور تذکرے کے ترتیب دو جو تمہاری یادگار رہے اگرچہ اس فقیر کی طبیعت صعوبات سفر اور تکالیف زمانے سے ہر آن مشوش رہتی تھی لیکن ان کی خاطر ازبسکہ عزیز تھی۔ وے دیوان دیکھے موافق اپنے حوصلے اشعار چنے اور نام ان مصنّفوں کے بقدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لاکر تذکرے

۱۔ "گلشن ہند" (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم) ص ۲۱۴ (الف)

" کا نام " گلشنِ ہند " رکھا ۔ اب التماس صاحبانِ سخن و نقادانِ عالی طبع سے یہ ہے کہ سیر کے وقت اگر غلطی عبارت یا نامربوطی محاورہ نظر سے گذرے تو لطف و مہربانی سے اصلاح فرمائیں اور ذیل عبارت سے چھپائیں جو یہ نہ ہو سکے تو جی ہی میں رکھیں ظاہر نہ کریں المسؤل من اللہ حسن القبول[1]"

برٹش میوزیم کے نامکمل نسخے میں یہ دیباچہ غائب ہے ۔ تذکرہ کے آخر میں " احوالِ مؤلف " کے عنوان کے تحت حیدری نے اس تذکرے کی تالیف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے دیباچہ کے بیانات کی نفی ہوتی ہے :۔

" اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام معہ اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جزو بخوبی تمام لکھے ۔ افسوس یہ ہے کہ دو جزو حرف شین سے لے کر تا حرف ی خدا جانے کیا ہوئے اس واسطے نوبت تحریر حرف یا تک نہ پہنچی انشا اللہ تعالےٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے احوال ان شعراء کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد دو چار جزو کی جو کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی قبلہ دام اقبالہ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامی بیکساں ہیں ۔ اللہ تعالےٰ دنیا میں خوش و خرّم رکھے اسے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بحق محمدؐ و آلہ الامجاد[2] "

حیدری کے بیان کا یہ تضاد حیرت انگیز ہے اور اس تالیف کے بارے میں مختلف

۱۔ " گلشنِ ہند " (قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) ص ۲ الف و ب

۲۔ " گلشنِ ہند " (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم لائبریری لندن) ص ۲۳۲ الف و ب

شکوک ذہن میں ابھارتی ہے۔

جیسا کہ حیدری نے دیباچے میں تحریر کیا ہے اسے نواب علی ابراہیم خاں صاحبِ تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" سے قرب حاصل تھا وہ خود کو ان کی مجلس خاص کا تعلیم یافتہ لکھتا ہے۔ نواب علی ابراہیم خاں اپنا تذکرہ ۱۱۹۸ھ م ۱۷۸۴ء میں مکمل کر چکے تھے اور جو روابط حیدری کے نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے ساتھ تھے ان کے پیشِ نظر یہ ناممکن تھا کہ حیدری ان کے تذکرے سے ناواقف ہو۔ لیکن حیدری نے دیباچے میں سرے سے اس تذکرے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے اور یہ التباس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ "گلزارِ ابراہیم" سے اس نے کوئی استفادہ نہیں کیا بلکہ محض مرزا محمد علی کے فراہم کردہ دواوین اور اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر اس نے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ لیکن جب ہم "گلشنِ ہند" کا موازنہ "گلزارِ ابراہیم" سے کرتے ہیں تو ساری حقیقت کھل جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ حیدری نے "گلشنِ ہند" کے نام سے صرف "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ اور تلخیص کر دی ہے۔ مرزا محمد علی کا دواوین مہیا کرنا اور حیدری کا اُن کی فرمائش پر شعرا کے حالات اکٹھا کر کے تذکرہ مرتب کرنا سراسر دروغ بیانی ہے۔ پھر نہ جانے کس مصلحت اور ضرورت کی بناء پر دو سال بعد وہ اسی تذکرے کی ادھوری نقل تیار کرتا ہے اور اس میں سے دیباچہ غائب کر کے "احوالِ مؤلف" کے تحت تالیف کتاب کے بارے میں ایک دوسرا ہی بیان تحریر کرتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تالیف کا کام اس نے ۱۲۰۹ھ یا ۱۲۱۰ھ میں شروع کیا تھا اور ۱۲۱۶ھ تک وہ صرف حرفِ سین تک پہنچ سکا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۲۱۴ھ میں حرف "ی" تک وہ مکمل تذکرہ لکھ چکا تھا۔

حیدری کی ان غلط بیانیوں پر غور کرنے اور اس کے تذکرے کے "گلزارِ ابراہیم" سے تقابلی مطالعے کے بعد "گلشن ہند" کی تالیف کی ساری حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ حیدری نے جیسا کہ دیباچے اور قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۴ ہجری میں مکمل کر لیا تھا۔ اسکا

منشا یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مطبوعات میں شامل کرائے۔ غالباً اس نے تذکرہ گلکرسٹ کے ملاحظے میں یہی ظاہر کرتے ہوئے پیش کیا تھا کہ وہ اس کی اپنی تحقیق وکاوش کا نتیجہ ہے۔ گلکرسٹ کی نظر سے "گلزار ابراہیم" گزر چکا تھا[۱]۔ گلکرسٹ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ حیدری "گلزار ابراہیم" کے ترجمے اور تلخیص کو اپنی تالیف ظاہر کر رہا ہے اسے رد کر دیا ہوگا۔ ایک سال بعد جب لطف وہاں پہنچے ہیں تو گلکرسٹ ان سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ کریں۔ لطف "گلزارِ ابراہیم" کو بنیاد بنا کر ایک زیادہ مبسوط تذکرے کا نام بھی "گلشنِ ہند" رکھتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنی ریشہ دوانیوں یا پھر خوشامد کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ "لطف کی "گلشنِ ہند" بھی شایع نہ ہو سکی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں گلکرسٹ کے تعلقات اربابِ مقتدر سے بگڑتے چلے گئے۔ کتابوں کی طباعت کے تعلق سے گلکرسٹ کی پیش کردہ اکثر تجاویز مسترد کی جانے لگی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیچھے گلکرسٹ کے مخالفین کی کوئی سازش بھی ہو۔

ان بدلے ہوئے حالات میں حیدری کو امید بندھی کہ کسی اور توسط سے اس کا تذکرہ طباعت کے لئے منظور کروایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دو سال بعد ۱۲۱۶ھ میں وہ اپنے تذکرے کا ایک حصہ نقل کرتا ہے اور اس عنوان کے ساتھ بہادر علی حسین (میر منشی) کے توسط سے اربابِ متعلقہ تک پہنچانا چاہتا ہے کہ یہ تالیف ابھی زیرِ تکمیل ہے اور اگر اربابِ کالج مالی اعانت دیں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں تو وہ اسے مکمل کر سکے گا[۵۲]۔

۱۔ ملاحظہ ہو:۔ مرزا علی لطف گلشن ہند (مرتبہ مولوی عبدالحق) لاہور ۱۹۰۶ء ص ۲۔

۱۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے "گلشنِ ہند" کو مرتب کرتے ہوئے اس کا موازنہ مختلف تذکروں کے علاوہ "گلزار ابراہیم" سے بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حقیقت ان سے چھپی ہوئی نہ ہوگی کہ یہ تمام تر "گلزار ابراہیم" کا چربہ ہے لیکن اپنے "پیش لفظ" میں یا کسی جگہ وہ اس حقیقت کو

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲۰ پر)

حیدری کا "گلشنِ ہند" علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرۂ "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ اور تلخیص ہے۔ صرف کہیں کہیں برائے نام کوئی تبدیلی یا اضافہ ملتا ہے مندرجہ ذیل چند شعرا کے حالات و نمونۂ کلام کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حیدری نے اپنے تذکرہ میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ ہو بہو "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ کیا ہے:۔

گلزارِ ابراہیم	گلشنِ ہند
۱۔ افضل محمد افضل ۔ از قدماست بر گوپال نامی عشق درزیدہ۔ حسب حال خود بارہ ماسہ مشہور ببکٹھ کہانی منظوم نمودہ ایں بیت از اینجاست" — مسافر سے جنھوں نے دل لگایا انھوں نے سب جنم روتے گنوایا[۱]	۱۔ افضل تخلّص۔ نام محمد افضل ۔ گوپال نامی ایک لڑکے پر عاشق تھے۔ اور بکٹ کہانی اپنے حسب حال کی کہہ کر مشہور ہوئے۔ یہ انسے ہے" مسافر سے جنھوں نے دل لگایا انھوں نے سب جنم روتے گنوایا[۲]

(بسلسلہ صفحہ نمبر ۱۱۹)
آشکار نہیں کرتے اپنے پیش لفظ کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ "حواشی کے کچھ حصے اور تمہید کا کچھ حصہ جس میں تذکرۂ حیدری پر گفتگو کی گئی تھی بوجوہ نکال دینا پڑا" صرف کنایتاً یہ بات لکھ دی ہے کہ "حیدری کی مسامحات کی طرف ذیلی حاشیوں میں اشارے کر دیئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوسکے گا کہ بحیثیت تذکرہ نگار اس نے اپنے فرائض کہاں تک انجام دئے ہیں" (ملاحظہ ہو: صفحہ ۲۰)

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ان بیانات سے ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے کسی مصلحت کی بنا پر ان حقائق کو منظر عام پر لانا مناسب نہ سمجھا۔

۱۔ قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی (کلکتہ) ص ۱۴۳ (ب)
۲۔ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (دہلی ۱۹۶۷ء) ص ۲۵

گلزارِ ابراہیم

۲۔ احمد ۔ گجراتی معاصر ولی دکھنی بود۔ بہارت بزبانِ سنسکرت و بھاکا داشت وگاہے ریختہ می گفت ۔ از وست ۔

احمد بتا میں کیا کروں اب راہ عشق میں
سر پر توسا بجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے[1]

گلشنِ ہند

۲۔ احمد ۔ نام گجراتی معاصر ولی دکنی تھے ۔ زبانِ سنسکرت اور برج بھاکا میں مہارت رکھتے تھے اور کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے تھے۔ یہ ان سے ہے": ۔

احمد بتا تو کیا کروں اب راہِ عشق میں
سر پر تو سا بجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے[2]

گلزارِ ابراہیم

۳۔ "انصاف ۔ احوالش معلوم نیست ۔ بعہدِ محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود از وست "

واقف تھے ہم کہ عشق کے شیون میں جس نہیں
پر کیا کریں کہ دیدۂ ودل اپنے بس نہیں[3]

گلشنِ ہند

۳۔ انصاف ۔ تخلص احوال معلوم نہ ہوا لیکن بعہد محمد شا فردوس آرام گاہ کے تھے ۔ یہ ان سے ہے"

واقف تھے ہم کہ عشق کے شیون میں حس نہیں
پر کیا کریں کہ دیدہ و دل اپنے بس نہیں[4]

گلزارِ ابراہیم

۴۔ آزاد ۔ اسمش ۔ خواجہ زین العابدین ۔ بعہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ بُود از دست ۔"

گلشنِ ہند

۴۔ آزاد ۔ تخلص ۔ نام خواجہ زین العابدین محمد شاہ فردوس آرام کے وقت میں تھے ۔

۱۔ قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۔ ص ۱۳ (ب)

۲۔ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (دلّی ۱۹۶۷ء) ص ۲۵

۳۔ ص ۱۳ (ب) ۔ (۴) ص ۲۶ ۔

جبھی بلبل نے چھوڑی شعلۂ آواز کی چٹکی
تبھی گلشن میں سارے جل اٹھے گل اور کنول دھکے[1]

گلزارِ ابراہیم

۵۔ "آشنا۔ دہلوی۔ اسمش میر زین العابدین معاصر و معاشر سراج الدین علی خاں آرزو بود۔ از دست۔"

گر ہم سے دیوانوں کو تم آزاد کرو گے
ویرانے میاں کتنے ہی آباد کرو گے[3]

گلزارِ ابراہیم

۶۔ "آگاہ۔ دہلوی۔ نامش محمد اصلاح بہ عہدِ محمد شاہ فردوس آرام گاہ در دہلی میگزرانید۔ از وست۔"

پیری میں کروں سیر جہاں کی تو بجا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا[5]

گلزارِ ابراہیم

۷۔ "آگاہ۔ اسمش نور خاں۔ جوانے ست قصہ خواں۔ نسبت شاگردی در فنِ قصہ خوانی با میر احمد قصہ خواں مشہور و در شعر با میر ضیاء الدین ضیاؔ دارد از وست۔"

یہ ان سے ہے"

جبھی بلبل نے چھوڑے شعلۂ آواز کے چھلکے
تبھی گلشن میں سارے جل اٹھے گل اور کنول دھکے[2]

گلشنِ ہند

۵۔ "آشنا تخلص۔ دہلوی۔ نام میر زین العابدین سراج الدین علی کے ہمعصر تھے یہ ان سے ہے"

گر ہم سے دوانوں کو تم آزاد کرو گے
ویرانے میاں کتنے ہی آباد کرو گے[4]

گلشنِ ہند

۶۔ "آگاہ تخلص۔ نام محمد صلاح۔ محمد شاہ بادشاہ فردوس آرام گاہ کے عہد دلی میں تھے۔ یہ اُن سے ہے"

پیری میں کیا کروں سیر جہاں کی تو بجا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا[6]

گلشنِ ہند

۷۔ "آگاہ تخلص۔ نام نور خاں کہ فن قصہ خوانی میں احمد قصہ خواں کے شاگرد تھے اور شعر گوئی میں میر ضیاء الدین ضیاء کے۔ یہ اُن سے ہے۔

---

[1] ص ۱۵ (ب) [2] ص ۲۹ - [3] ص ۱۳ (ب) [4] ص ۲۶ - [5] ص ۱۵ (ب) [6] ص ۲۹ -

حلقہ چشم میں کیوں آج ہے دم پا بہ رکاب
ہے کہاں کا ہمیں درپیش سفر دیکھیں تو [1]

گلزارِ ابراہیم

۸۔ "افگار۔ اسمش میر جیون۔ شنیدہ شد کہ بشوق مشہد مقدس بطوس رفت در روضۂ مبارک مجاور ست۔ از دست"

علیؑ کا بیاہ ایسا جگمگا تھا
شبِ معراج جس کا رت جگا تھا [3]

گلزارِ ابراہیم

۹۔ "اکرم دہلوی۔ اسمش خواجہ محمد اکرم در تاریخ گوئی مہارت بسیار بہم داشتہ۔ از دست"

اک بار میرے دیر میں زاہد اگر آوے
میں جانوں جو مسجد کی طرف پھر نظر آوے [5]

گلزارِ ابراہیم

۱۰۔ "اولی تخلص۔ اسمش میر اولاد علی اصلش از سادات بارہہ است۔ از دست۔"

حلقہ چشم میں کیوں آج ہے دم پا بہ رکاب
ہے کہاں کا ہمیں درپیش سفر دیکھیں تو [2]

گلشنِ ہند

۸۔ افگار تخلص۔ میر جیون معلوم ہوا کہ مشہد مقدس کی زیارت حاصل کرکے مجاور ہوئے۔ یہ ان سے ہے:"

علیؑ کا بیاہ کیسا جگمگا تھا
شبِ معراج جس کا رت جگا تھا [4]

گلشنِ ہند

۹۔ "اکرم دہلوی۔ نام۔ محمد اکرم۔ تاریخ کے کہنے میں نہایت مہارت رکھتے تھے۔ یہ ان سے ہے"

اک بار میرے دیر میں زاہد اگر آوے
میں جانوں جو مسجد کی طرف پھر نظر آوے [6]

گلشنِ ہند

۱۰۔ "اولی تخلص۔ نام میر اولاد علی سید تھے۔ یہ ان سے ہے"

۱۔ ص ۲۶ (الف)
۲۔ ص ۲۹، ۳۰
۳۔ ص ۱۶ (الف)
۴۔ ص ۲۹۔
۵۔ ص ۱۶ (الف)
۶۔ ص ۲۹۔ ۳۱

بتاں ہر چند بھلاتے ہیں میرے دل کو اولی
ادا کس طرح مجھکو اُس پری رخسار کی بھولے[1]

گلزارِ ابراہیم

۱۱۔ "انور۔ غلام علی از سکنۂ کالپی بودہ۔ از دست

سوہنی دھن پہ تیرے جو شرط ہے مسی کی
تیرے لبوں کا بوسہ مصری ہے کالپی کی[3]

گلزارِ ابراہیم

۱۲۔ "بیرنگ۔ نامش۔ دلاور خاں معاصر محمد رفیع سودا بود۔ گویند در دہلی رحلت نمود از دست۔"

دل کو تجھ عشق میں قرار نہیں
اب تلک تجھ کو اعتبار نہیں[5]

گلزارِ ابراہیم

۱۳۔ جان۔ جانِ عالم خاں۔ برادر زادہ نواب روشن الدولہ از تلامذہ میر سید محمد سوز ست۔ از دست۔"

بتاں ہر چند بھلاتے ہیں میرے دل کو پر اولی
ادا کس طرح مجھکو اس پری رخسار کی بھولے[2]

گلشنِ ہند

۱۱۔ "انور تخلص۔ نام غلام علی کالپی کے تھے۔ یہ ان سے ہے۔"

سوہنی دھن پہ تیرے جو شرط ہے مسی کی
تیرے لبوں کا بوسہ مصری ہے کالپی کی[4]

گلشنِ ہند

۱۲۔ "بیرنگ تخلص۔ نام دلاور خاں ہمعصر مرزا رفیع سودا کے تھے۔ دلّی میں مرے یہ ان سے ہے۔"

دل کو تجھ عشق میں قرار نہیں
اب تلک تجھ کو اعتبار نہیں[6]

گلشنِ ہند

۱۳۔ جان تخلص۔ نام جانِ عالم خاں نواب روشن الدولہ کے بھائی۔ شاگرد تھے میر سید محمد سوز کے۔ یہ ان کا شعر ہے۔"

۱۔ ص ۱۶ (ب)

۲۔ ص ۱۰۱ (مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۲۱۸ (الف) "پراولاد" لکھا ہے)

۳۔ ص ۱۷ (ب)

۴۔ ص ۳۲

۵۔ ص ۳۲ (ب)

۶۔ ص ۴۱

گلزارِ ابراہیم	گلشنِ ہند
چھوڑ عارض دل نے گھیرا زلفِ مشکیں نام کو	چھوڑ عارض نے جو گھیرا زلفِ مشکین نام کو
صبح کا بھولا غنیمت ہے جو پہنچے شام کو[۱]	صبح کا بھولا غنیمت ہے پہنچے شام کو[۲]
۱۴۔ "ذاکر تخلص مرادآبادی۔ اسمش حسین دوست۔ از سادات مرادآباد بود۔ از وست۔"	۱۴۔ ذاکر تخلص۔ نام حسین دوست مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ ان سے ہے۔"
جو چاہو سو کہو مختار ہو عدد کے دلے	جو چاہو سو کہو مختار ہو عدو کے دلے
حسین دوست کے دشمن کے تئیں یزید کہو[۳]	حسین دوست کے دشمن کے تئیں یزید کہو[۴]
۱۵۔ "عاشق۔ میر یحیٰی مخاطب بہ عاشق علیخاں از مردم دکھن بود۔ از وست۔"	۱۵۔ "عاشق۔ نام میر یحیٰی عرف عاشق علی خاں دکھن کے رہنے والے تھے۔ یہ ان سے ہے۔"
ہیں شہید کربلا سب سُرخ پوش	ہیں شہید کربلا سب سرخ پوش
مصطفےٰ کی آلؑ کا کیا رنگ ہے[۵]	مصطفےٰ کی آل کا کیا رنگ ہے[۶]

مندرجہ ذیل شعرا کے حالاتِ زندگی یا نمونۂ کلام میں حیدری نے برائے نام اضافہ یا تبدیلی کی ہے:۔

(۱) آفتاب۔ شاہ عالم بادشاہ۔ حیدری نے حالات کے ضمن میں ایک جملے کا اضافہ کیا ہے جو گلزار میں نہیں ہے:۔

"بیالیس برس سے تا حال سنہ بارہ سو چودہ ہجری اوپر سریرِ سلطنت کے مانند مہر

۱۔ ص ۵۵ (الف)   ۲۔ ص ۵۰

۳۔ ص ۹۸ (الف)   ۴۔ ص ۶۱

۵۔ ۱۸۹ (ب)   ۶۔ ص ۷۵

سپر کے جلوہ گر ہیں۔"[1]

۲۔ حیدری۔ شیخ غلام علی۔ حیدری نے نمونۂ کلام میں ایک شعر ایسا بھی دیا ہے جو گلزار میں نہیں ہے:۔

سو بار تار تار گریباں کو کیا
تو بھی جنوں ہمارا گلو گیر ہی رہا[2]

۳۔ زند۔ مہربان خاں۔ حیدری نے نمونۂ کلام کے طور پر یہ شعر دیا ہے جو گلزار میں نہیں۔

الٰہی داغ کو دل سے جلائے
برہ کی آگ مجھ تن میں لگا دے[3]

۴۔ جواںؔ کاظم علی کے بیان میں حیدری نے ایک جملے کا اضافہ کیا ہے:۔
"اس فقیر کو ان کی خدمت میں نہایت بندگی ہے"[4]

۵۔ قبولؔ: عبدالغنی بیگ۔ حیدری نے حالات تو گلزار ہی سے لئے ہیں مگر دو شعر نمونۂ کلام کے طور پر دئے ہیں جو گلزار میں موجود نہیں

دیکھو حال مرا اٹھا کے سو سو حیلے
ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفن میں نہ چھوڑوں گی قدم
سو اس کے بھی ہو چلے ہیں گنے ڈھیلے[5]

۱۔ گلشنِ ہند (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) ص ۲۲
۲۔ ایضاً ص ۵۴
۳۔ ایضاً ص ۶۴
۴۔ ایضاً ص ۴۸
۵۔ ایضاً (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) ص ۸۸

۶۔ مخلص ۔ بدیع الزماں خاں ۔ گلزارِ ابراہیم سے ہی حیدری نے مخلص کے حالات لئے ہیں نمونۂ کلام کے طور پر ایک شعر دیا ہے جو گلزار میں نہیں ہے ۔

لے جا تو دل کو یوں تو ترا اعتبار ہے
پر شرط اس زمانے میں قول و قرار ہے[۱]

۷۔ مجروح ۔ منشی کشن چند ۔ حیدری نے حالاتِ زندگی گلزار ہی سے لئے ہیں مگر ایک شعر نمونۂ کلام کے طور پر دیا ہے جو گلزار میں موجود نہیں ۔

نہ سیر باغ نہ گل گشت لالہ زار کروں
یہ آرزو ہے تماشائے روئے یار کروں[۲]

۸ ۔ مروّت ۔ علی ابراہیم خاں اور حیدری دونوں نے مروّت کے نام نہیں دیا ہے۔ حیدری نے حالات گلزار ہی سے لئے ہیں ایک شعر نمونۂ کلام کے طور پر دیا ہے جو گلزار میں نہیں ہے ۔

مہندی سیاہ کی تئیں تو نے لگا لگا
کسی دل جلے کا خون ترے ہاتھ جا لگا[۳]

تذکرہ گلزارِ ابراہیم میں علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے حیدری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حیدری اپنے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" حیدری تخلص ۔ نام سیّد حیدر بخش شاہ جہاں آبادی یہ غزل اس فقیر کی ہے اور یہ قطعہ بھی اسی کا ہے " :۔

۱۔ گلشن ہند (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) ص ۸۷

۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۸۸

۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۸۶

نہ پوچھو کیا بنا احوال میرا تیری یاری میں
ہوا ہر اک مرا دشمن تمہاری دوستداری میں

سحر آہ و فغاں کرتے ہی کرتے شام ہوتی ہے
یوں ہی پھر شام ہوتی ہے سحر فریاد و زاری میں

نہ نکلا وہ مہ بے مہر گھر سے اور شب ساری
کٹی ہیہات اے بخت سیہ اختر شماری میں

دلِ بے تاب کو مرے بھلا کس طرح تاب آوے
قرار آتا ہے اے ناصح کہیں بھی بیقراری میں

نہیں کرتا ہوں از خود رازِ الفت فاش میں لیکن
نکل آتا ہے آنسو آنکھ سے بے اختیاری میں

قرار و طاقت و صبر و شکیب و ہوش و دیں و دل
بھلائے ہم نے شب کے سب تمہاری یادگاری میں

یہ چشم خوں فشاں نے تار جو رونے کا باندھا ہے
جھڑی لگتے نہ دیکھی یوں کبھی ابرِ بہاری میں

چمن میں تو نظر آئے جو زار و زار اے نرگس
ہوئی بیمار کس کی چشم کی بیمار داری میں

تبسم غیر سے اتنا نہ اے لب بستہ دہاں کم ہے
نمک کتنا بھرے گا تو جگر کے زخم کاری میں

یہ صید جاں تری قربان گہ میں صدقے ہوتا ہے
نہ رکھ اس سے زیادہ قتل کی امیدواری میں

تمہے قربان اے جان جہاں تک سوچ تو دل میں
ملے گا حیدری سا کوئی تجھ کو جانثاری میں

قطعہ

جو اشک گرے بہر جگر گوشۂ زہراؑ
ہے لاکھ عبادات سے بہتر یہ عبادت
اے حیدری آنسو نہ کہہ اس کو سنا ہے
کہتے ہیں اسے اہلِ نظر بحر شفاعت[۱]

ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اپنے مرتب کردہ گلشن ہند میں حیدر بخش حیدری کی بعض غلطیوں کی نشان دہی کی ہے :۔

"حیدری نے سراج الدین علی خاں آرزو کو صاحب دیوان ہندی لکھا ہے۔ آرزو کے چند متفرق اردو اشعار ہم کو دستیاب ہوئے ہیں۔ کسی بھی تذکرہ نگار نے آرزو کو اردو کا صاحب دیوان شاعر نہیں لکھا ہے[۲]"

"میر انشاء اللہ خاں انشاؔ کو حیدری نے فن حکمت میں ثانی بو علی سینا لکھا ہے۔ انشاء طب سے واقف تھے۔ ان کے والد ماشاء اللہ خاں مشہور طبیب تھے۔ ان کے متعلق بھی "ثانی بو علی سینا" نہیں لکھ سکتے تو انشاء کے متعلق ایسا لکھنا مبالغہ آرائی ہے[۳]"

"میر کرم اللہ دردؔ نامی دو شعراء کا ذکر حیدری نے کیا ہے۔ دونوں شاعر ایک ہی ہیں[۴]"

"حیدری نے سوزؔ تخلص والے دو شعرا کا ذکر کیا ہے حقیقت میں ایک ہی شاعر

۱۔ "گلشنِ ہند" (مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد) ص ۵۱

۲۔ "گلشنِ ہند" (دہلی ۱۹۶۷ء) ص ۶۴

۳۔ "گلشنِ ہند" ص ۳۳

۴۔ "گلشنِ ہند" ص ۵۸

کو دو شاعر بنا کر پیش کیا ہے۔"[۱]

تذکرۂ گلشن ہند کے قلمی نسخے

تذکرہ گلشن ہند کے بارہ قلمی نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے۔ ان بارہ نسخوں کے منجملہ چار نسخے انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) میں ہیں۔ دیگر آٹھ نسخے ہندوستان اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ذیل میں ان قلمی نسخوں کی فہرست اور تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

الف	۔ گلشن ہند	۔ مخزونہ انجمن ترقی اردو، کراچی	(پاکستان)
ب	۔ ایضاً	ایضاً	
ج	۔ ایضاً	ایضاً	
د	۔ ایضاً	ایضاً	
ھ	۔ ایضاً	کتب خانہ سالار جنگ میوزیم	(حیدرآباد)
و	۔ ایضاً	اسٹاٹ سی بیلیو تھک	(جرمنی)
ز	۔ ایضاً	نیشنل لائبریری پیرس	(فرانس)
ح	۔ ایضاً	انڈیا آفس لائبریری لندن	(انگلینڈ)
ط	۔ ایضاً	کورس کرسٹی کالج، کیمبرج	(انگلینڈ)
ی	۔ ایضاً	کاپر کالج	(انگلینڈ)
ک	۔ ایضاً	اورنٹیل ریسرچ سنٹر	(بمبئی)

۱۔ "گلشن ہند" (دہلی، ۱۹۶۷ء) ص ۲۴

ل ۔ گلشن ہند ۔ رضا لائبریری ۔ رام پور

افسر صدیقی امروھوی اور سید سرفراز علی رضوی نے "مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول) میں انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) کے مملوکہ نسخوں کے بارے میں حسب ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

"الف۔ گلشن ہند سائز ۱۰ × ۷ صفحات ۱۹۵ سطور ۱۳ سنہ تصنیف ۱۲۱۵ھ سنہ کتابت ۱۲۴۳ ہجری۔

گلشن ہند اردو کے مشہور مصنف مرزا علی لطف کا معروف تذکرہ ہے پہلا تذکرہ ۱۹۰۶ء میں عبداللہ خاں حیدرآبادی نے مطبع رفاع عام لاہور میں چھپوا کر شایع کر دیا تھا۔ جس میں بابائے اردو مرحوم کا بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ مطبوعہ گلشن ہند میں ان مشہور شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے جن کے دواوین دستیاب ہوتے ہیں اور غیر مشہور شعرا کا کلام بجنسہٖ شامل ہے لیکن اس مخطوطے میں مشاہیر کا کلام بھی کثرت سے ہے۔ میر تقی کا کلام ۲۳ صفحات میں مرزا سودا کا ۴۰ صفحات اور خواجہ میر درد کا کلام ۳۶ صفحات میں پھیلا ہوا ہے خود اپنے کلام کے لئے مصنف نے ۶۰ صفحات وقف کئے ہیں۔ اس میں غزلیات کے علاوہ قصائد بھی ہیں اور ایک پوری مثنوی بھی ہے۔ مثنوی کے اشعار چار سو سے زائد ہیں۔ زیر تبصرہ مخطوطہ کا خط نستعلیق ہے شعرا کے تخلص سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ نثر کے ہر فقرے کے بعد سرخی سے چھوٹا سا دائرہ بنایا گیا ہے۔ یہ صورت مصرعوں کے آخر میں بھی ہے۔ اشعار یک سطری نہیں لکھے گئے بلکہ نثر کے انداز میں لکھے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصرع ٹکڑے ہوکر دو سطروں میں بٹ گئے کتابت:۔ کاتب نے احتیاط سے نہیں کی ہے اس لئے جگہ جگہ اغلاط ہیں۔ مثلاً آرزو کا سنہ وفات عبارت میں گیارہ سو انہتر ہجری دیا ہے لیکن ہندسوں میں ۱۱۷۹ھ لکھا ہے اسی طرح آبرو کے آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں "کچھ" زیادہ لکھ دیا ہے جس سے مصرعہ وزن سے ساقط ہوگیا ہے۔ مطلع یہ ہے

اوٹھ چیت کیوں جنوں مستی خاطر پختنت کی
آئی دکچھ) بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

انشاء کے حال میں ہے کہ "بالفعل کہ سنہ بارہ سو ہجری ہیں۔ اس میں بارہ سو کے بعد پندرہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ امانی کے لئے لکھتے ہیں "امانی تخلص میرامانی نام شاہجہاں آباد خلف ہیں" ان میں کے "یہ" ان میں "آثمی کی جگہ لکھا گیا ہے۔ شیخ محمد عابد عظیم آبادی شیخ محمد روشن جوشش کے بھائی تھے اور دل تخلص کرتے تھے لیکن ان کا تخلص دیوانہ لکھ دیا ہے۔ غالباً یہ غلطی اس وجہ سے واقع ہوی کہ اس کے معاً بعد رائے سرپ سنگھ دیوانہ کا بیان تھا۔ روا روی میں دونوں جگہ دیوانہ درج ہوگیا۔ مرزا علی لطف نے گلشن ہند کے بارے میں جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے۔

حیراں پھرے ہیں بے سرو پا بہن اور دے
تاریخ اس کی جب سنے کہ "رشکِ بہشت" ہے

رشک بہشت کے اعداد ۱۲۲۷ میں سے (۱۲) کا تخرجہ کیا گیا ہے اور یہ تخرجہ بہن اور دے کو بے سرو پا کردینے سے حاصل ہوا ہے۔ لیکن یہاں یہ دونوں لفظ بے سرو پا نہیں ہوتے۔ بہن بے سر ہوتا ہے۔ اور دے بے پا یعنی بے کے (۲) اور ی کے (۱۰) ملا کر (۱۲) کا تخرجہ ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک کو بے سرو پا کیا جاتا تو "دے" بالکل ہی ختم ہوجاتا کیوں کہ اس میں سرو پا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ نیز بہن و دے کے سرو پا (ب' ن' د' ے) کے (٦٦) ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ۱۲۲۷ میں سے ٦٦ منہا کرنے کے بعد ۱۱٦۱ باقی رہتے ہیں جو گلشن ہند کا سنہ تصنیف نہیں ہے۔ پہلے مصرعہ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ بہن بے سر اور دے کو بے پا کر تاریخ برآمد ہوئی ہے۔

زیرِ نظر مخطوطے میں آصف الدولہ کا قطعۂ تاریخِ وفات بھی غلط کتابت ہوا ہے۔

اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے۔

بولے یوں دور کر کے حب و عناد

آج گُل ہند کا چراغ ہوا

دوسرے مصرعے کے اعداد (۱۳۵۰) ہوتے ہیں اگر ان میں سے "حب وعناد" کے عدد (۱۴۴) خارج کردیں تو ۱۲۰۶ باقی بچتے ہیں۔

مخطوطے کا رسم الخط بہت قدیم ہے جس میں کئی وگ میں امتیاز نہیں ہے یائے مجہول عام طور پر نہیں لکھی ہے۔ دونوں مقامات پر یائے معروف سے کام لیا ہے اور اس کے نقطے قایم ہیں۔ چرا کو چورا، اس کو اوس تحریر کیا ہے۔ حروف جار بیشتر مقامات پر مجرور کے ساتھ ملا کر لکھے گئے ہیں مثلاً سے

یمن قدم سے اس کے جہاں میں خوشی کے ساتھ

زائل ہوی ہے اس قدر اب صورتِ ملال

آغاز:۔ سر صفحہ "یا علی ادرکنی" لکھا ہے اس کے نیچے "رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر" ہے۔ اس کے بعد تذکرے کا آغاز ان الفاظ سے ہے:۔

"رعنائی اور زیبائی دلبرانِ سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے معشوقان زباں ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔

اختتام:۔

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ

ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

ترقیمہ:۔ بتاریخ شانزدھم شہر جمادی الثانی ۱۲۱۳[1] ہجری بہ اختتام رسید

ترقیمے کے بعد دو صفحے سادہ ہیں۔ تیسرے صفحے پر فارسی کی چہار

۱۔ یہاں فاضل مرتبیں کو سہو ہوا ہے یا کاتب نے غلط تحریر کیا۔ لطف نے اپنا تذکرہ ۱۲۱۵ء میں لکھا تھا

رباعیاں ہیں۔

دو صفحات پھر خالی ہیں۔ چھٹے صفحہ پر ایک فارسی غزل کے چار شعر نقل کئے گئے ہیں۔ دو صفحے پھر سادہ ہیں اور ان کے بعد سات شعر کی ایک اردو غزل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غزل ساقی تخلص کے کسی شاعر کی ہو۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہے:۔

آپ کل شب سے جو یہ چین بہ جبیں باندھ رہے
دل کے تھے جتنے مقاصد وہ وہیں باندھ رہے

ترک چشم صنم عربدہ جو اے ساقی
ایک پر ایک زحد رہ کیں باندھ رہے[1]

ب۔ گلشن ہند

"سائز ۱۰" × ۶ ۳/۴" صفحات ۲۲۴ سطور ۱۵ سنہ تصنیف ۱۲۱۵ھ سنہ کتابت۔

گلشن ہند کا یہ مخطوطہ پہلے مخطوطے کے مقابلے میں زیادہ ضخیم ہے۔ شعرا اگرچہ وہی ہیں جو پہلے مخطوطے میں آئے ہیں۔ لیکن کلام کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ جدولیں اور شعر کے تخلص اور ردیف کے عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق ہے۔ لکھنے کا انداز قدیم ہے جس میں یائے معروف کا استعمال عام طور پر اور یائے مجہول کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ک کی طرح گ کا بھی ایک ہی مرکز ہے۔ ہائے ہوز اور ہائے دوچشمی ایک دوسرے کی جگہ لکھی گئی ہے مثلاً

غم نے لیا ہے گھیر مجھی یہاں تلک کہ اب
دیتا ہی ساتھ دینی سی جہہ کو جواب دل

لفظوں کو ملا کر لکھنے کا نمونہ ان ابیات میں دیکھئے۔

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول) ص ۱۲۳ تا ۱۲۷

وہ مرغِ ناتواں ہوں کہ صحنِ چمن سے میں

بے نزدیاں نہ پہنچ سکوں آشیاں تلک

رکھئے قلم کو مدح میں ایبون کی سرنگوں

سجدہ کریں جنہوں کو زمین و زماں تلک

"سورت" کو صورت" کی صورت میں تحریر کیا ہے اور چاند نگینہ کو چاند پور

ندینہ لکھا ہے۔ عالی نسب کو عالی نصب بنا دیا ہے۔

آغاز:۔ تذکرہ شروع کرنے سے قبل ایک صفحہ پر یہ شعر درج ہے۔

شاعر کا نام درج نہیں ہے۔

غالب ہے دیکھیں رونے میں تو ابر تر کہ ہم

برساتا تو ہے چشموں سے لختِ جگر کہ ہم

اس کی پشت پر بابو ولد مارو کی چھوٹی سی مربع دو مہریں جن میں ۱۳۰۵ ہجری

درج ہے۔ اس کے بعد اس طرح آغاز کیا ہے۔

تذکرہ گلشن ہند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی دلبرانِ سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے

معشوقانِ زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں پہنایا۔

اختتام:۔ مخطوطہ یک۔ رنگ کے اس شعر پر ختم ہوا ہے جو نسخۂ اوّل کے آخر

میں ہے فن کتابت اور اسم کاتب درج نہیں ہے"[۱]

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اوّل) ص ۱۲۷ تا ۱۲۹

ج ۔ گلشن ہند

"سائز ۹ ۱/۲" × ۶" صفحات ۲۳۲ ، سطور ۱۲ سنہ تصنیف 1215ھ سنہ کتابت

گلشن ہند کا یہ مخطوطہ ناقص الآخر بھی ہے اور ناقص الوسط بھی شیخ محمد روشن جوشش تک ۲۶ شعرا کے حالات موجود ہیں اس میں جوشش کے (۱۹۳) اشعار لکھنے کے بعد اگلے شعر کا جزاول "یوں پاس" لکھ کر چھوڑ دیا ہے صفحہ کی باقی جگہ سادہ ہے۔ شیخ ظہور الدین حاتم سے سید عبدالولی عزلت تک ۱۹ شعرا کے نہ حالات ہیں نہ کلام ہے۔ البتہ عزلت کے (۱۹) آخری اشعار موجود ہیں۔ شاہ رکن الدین عشق سے مصنف تک (۱۰) شاعروں کے حالات وکلام پر مخطوطہ ختم ہوگیا ہے۔ لطف کے حالات کے بعد ۶ صفحات سادہ چھوڑ کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ان کا کلام شروع کیا ہے۔ تخلص کی جگہ خالی چھوڑی ہے۔ شاید بعد میں سرخی سے لکھنے کا ارادہ ہو۔ بعد کے پندرہ شعرا اندارد ہیں۔ رب یسر وتمم بالخیر اور شعرا کے تمام سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ خط پاکیزہ نستعلیق ہے۔ شاہ عالم آفتاب کے حال میں انکی فارسی غزل کو حاشیہ پر درج کر دیا ہے۔ چند صفحات تک کسی صاحب نے پنسل سے ان لفظوں کی تصحیح کی ہے جو اصل مخطوطے میں غلط تھے پہلے دونوں مخطوطوں کے خلاف زیر تبصرہ مخطوطہ میں آصف الدولہ کی تاریخ وفات کا شعر آخر بالکل صحیح درج کیا ہے یعنی ؎

بولے یوں دور کر کے حجب عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا

اس سے صحیح سنہ وفات برآمد ہوتا ہے۔

آغاز:۔ رعنائی وزیبائی دلبران سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔

اختتام:۔ مخطوطے کا اختتام لطف کے اس شعر پر ہوا ہے ؎

ہوا آوارہ ہندوستان سے ..... آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا الگن کے گوروں نے

سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ صرف تمت تمام شد کارمن نظام شد لکھا ہے۔[۱]

د۔ گلشن ہند

سائز ۱۱½" × ۷" صفحات ۲۵۵ سطور ۱۷ سنہ تصنیف ۱۲۱۵ھ سنہ کتابت ۱۲۵۴ھ۔

زیر تبصرہ مخطوطے کا خط نستعلیق تو ہے مگر کسی قدر شکستگی لئے ہوئے۔ بین السطور کافی ہیں۔ شاعروں کے تخلص اور دوسرے عنوانات تک دوسطری ہیں اور سرخ روشنائی سے ہیں۔ نثر کے دوران بھی تخلص کو سرخی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ انتخاب کلام کا عنوان ہر مقام پر نظم ہے۔ املا کے لحاظ سے یہ نسخہ باقی تین نسخوں سے بہتر ہے۔ مصنف نے اپنا کلام ۱۷ صفحات میں درج کیا ہے اور پہلے کے تین مخطوطوں سے زیادہ ہے۔ اشعار میں جہاں شاعر کا تخلص آیا ہے وہاں سرخی کی ایک لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ تاکہ تخلص نمایاں رہے۔ تیسرے نسخے کی طرح آصف الدولہ کا قطعۂ تاریخ اس میں بھی صحیح درج ہے۔ بعض مقامات پر سہو کاتب نظر آتا ہے۔ مثلاً محمد شاکر ناجی کے سلسلہ میں ان کے استاد کا نام شاہ نجم الدین تو ضرور لکھا ہے مگر تخلص آبرو کی جگہ آرزو لکھا گیا ہے۔ میر غلام حیدر مجذوب کا تخلص محبوب ظاہر کیا ہے۔

مخطوطے کے پہلے صفحے پر تحریر ہے کہ "یہ کتاب تذکرہ الشعرائے ہندی ملکیت منشی میر قادر علی کرمانی کی ہے" اس کی ذیل میں گلشن ہند (تالیف مرزا علی لطف) ترجمہ گلزار ابراہیم (علی ابراہیم خاں) ۱۱۹۸ھ لکھا ہے۔

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول) ص ۱۲۹ و ۱۳۰

عام مخطوطات کی طرح رب یسر و تمم بالخیر اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد آغاز تذکرہ ہے۔

آغاز :۔ "رعنائی و زیبائی سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے معشوقانِ زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا"

اختتام :۔ یکرنگ کے اس شعر پر ہے جو دوسرے مکمل نسخوں میں بھی ہے۔

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ

ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

ترقیمہ :۔ تمت الکتاب بعون ملک الوھاب بتاریخ پانزدھم محرم الحرام ۱۲۵۴ ہجری روز چہارشنبہ بوقت صبح بمقام چھاونی سکندرآباد تعلقہ حیدرآباد بندہ احقر عبدالقادر متوطن امتیاز گڑھ عرف ادھونی صوبہ دارالظفر بیجاپور بخط صورت اختتام بر قوع پیوست"[1]

۵۔ گلشن ہند۔ کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں ہے[2]۔ یہ خطِ نستعلیق میں ہے۔ اس کے اوراق ۲۶۳ اور صفحات ۵۲۶ ہیں۔ کتاب کا سائز ۹" × ۶" ہے۔ ترقیمہ نہیں ہے جس کی وجہ سے کتابت کا سنہ اور کاتب کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس نسخے کا آغاز آفتاب کے ذکر سے ہوتا ہے اور اختتام یکرنگ پر ہوتا ہے۔ مطبوعہ کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات درج ہیں نمونۂ کلام کے طور پر جو اشعار دیے گئے ہیں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ پہلے اور آخری صفحے پر نواب سالار جنگ سوم کی مہر ہے۔ پہلے صفحہ پر کسی نے پنسل سے لکھا ہے "تذکرہ گلشن ہند حسبِ فرمائش گلکرسٹ انگریز مرزا علی لطف نے تالیف کیا۔"

۶۔ گلشن ہند۔ یہ نسخہ اسٹاٹسی بیلیوتھک (جرمنی) میں ہے[3]۔ اس میں اوراق ۱۲۲۵

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول) ص ۱۳۰ و ۱۳۱

۲۔ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم داخلہ نمبر ۱۰۶۰

۳۔ قلمی مخزونہ کتب خانہ اسٹاٹ بیلیوتھک (جرمنی) داخلہ نمبر ایم۔ ایس اورنٹل اسپرنگر۔ ۲۴۵

صفحات ۵۰۴ ہیں خط نستعلیق میں ہے اور بہت ہی عمدہ لکھا گیا ہے۔ یہ اسپرنگر کی ملکیت تھا یہ نسخہ ٹوبن گن لائبریری سے یہاں منتقل ہوا ہے۔ آغاز آفتاب کے تذکرہ سے ہوتا ہے اور یکرنگ پر ختم کیا ہے۔ اس میں ترقیمہ نہیں ہے۔ لائبریری کی مہر پہلے حصے پر موجود ہے۔

ز۔ گلشن ہند۔ نیشنل لائبریری پیرس (فرانس)[1] کا یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے اسپرنگر نے اپنی کتاب[2] میں اس نسخہ کا ذکر سلسلہ نمبر ۴۱ پر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ مسٹر حال کے پاس یہ نسخہ بڑی تقطیع پر موجود ہے جس میں تقریباً ۶۰۰ صفحات ہیں ہر صفحے پر ۱۷ سطریں ہیں۔ اسپرنگر کا نسخہ مسٹر حال کے نسخے کی نقل ہے۔ اس نسخے کے بارے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں:۔

"آصف جاہ اول کے کتب خانہ میں لطف کے تذکرہ کا صرف حصّہ اول ہی ملتا ہے اور یہ وہی نسخہ ہے جو میرے ذخیرے میں ہے یہ نسخہ ۴۰۰ صفحات کا ہے جس کو سید ذوالفقار علی تجلّی نے ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں تحریر کیا۔[3]

گارساں دتاسی کے اس بیان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیشنل لائبریری پیرس (فرانس) کا نسخہ گلشن ہند گارساں دتاسی ہی کی ملکیت تھا۔ آصف جاہ اوّل کے کتب خانہ کے نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا۔ آصف جاہ اول کے کتب خانے میں لطف کے تذکرہ کی موجودگی کی اطلاع دینے میں گارساں دتاسی سے سہو ہوا ہے۔ آصف جاہ اوّل کے زمانے لطف کے تذکرہ کی تالیف ہی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے زمانے میں لطف نے گلشنِ ہند کی تالیف کی ہے۔ اسی طرح کا سہو کریم الدین اور فیلن کو بھی ہوا ہے وہ بھی گارساں دتاسی

۱۔ قلمی مخزونہ نیشنل لائبریری پیرس فرانس) داخلہ نمبر ۸۵۷ (ایم ایس)

۲۔ اودھ کیٹلاگ۔ ص ۱۸

۳۔ تاریخ ادب ہندوستانی جلد دوم (پیرس ۱۸۷۰ء) ص ۲۴۷

کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ کتاب نظام الملک وزیر اول کے کتب خانہ میں جلد اول ہے"[۱]

ڈاکٹر زور نے اس نسخے کے بارے میں لکھا ہے :۔

"گلشن ہند از مرزا علی لطف مورخہ ۱۲۱۵ کا سید ذوالفقار علی تجلی بتاریخ ۱۲۴۳ ہجری غالباً کرنل اسٹوارڈ نے وزیر نظام کے نسخے سے نقل کرایا اور دتاسی کو بطور تحفہ پیش کیا۔ ۹۴ صفحات (۲۸۰۷)"[۲]

ح۔ گلشن ہند :۔ انڈیا آفس لائبریری لندن (انگلینڈ)[۳] کا مخزونہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے شکستہ تحریر ہے۔ اس کے اوراق ۱۹۶ ہیں سائز (۷-۱۱ نمونہ $\frac{1}{4}$ ۶ × $\frac{1}{8}$ ۱۱) جیمس بلوم ہارٹ نے اس نسخے کا ذکر کیا ہے[۴] وہ لکھتے ہیں کہ اس تذکرہ میں ۶۰ شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام حروف تہجی کے لحاظ سے لطف نے لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لطف نے ۷۰ شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام اس میں دیا ہے۔

ط۔ گلشن ہند :۔ تذکرہ گلشن ہند کا جو نسخہ کورس کرسٹی کالج کیمبرج (انگلینڈ) میں ہے۔ قاضی عبدالودود نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں اس نسخے کی نشان دہی کی ہے[۵] لیکن تفصیل نہیں دی ہے۔ راقم الحروف نے ارباب کورس کرسٹی کالج کیمبرج (انگلینڈ) سے استفسار کیا مگر اس نسخے کا پتہ نہ چل سکا۔

ی۔ گلشن ہند :۔ تذکرہ گلشن ہند کا نسخہ کا پرکالج انگلینڈ میں موجود ہے اس کا داخلہ نمبر ۱۰

۱۔ طبقات الشعرائے ہند (۱۸۴۷ء) ص ۳۱۸

۲۔ گارساں دتاسی (حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء) ص ۴۳

۳۔ قلمی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری داخلہ نمبر ۶۰

۴۔ کیٹلاگ آف ہندوستانی مینوسکرپٹ ان لائبریری آف دی انڈیا آفس (انگلینڈ ۱۹۲۶ء) ص ۲۰۹

۵۔ شخصی مکتوب بنام راقم الحروف بتاریخ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء۔

اور سلسلہ نمبر ۲۴ ہے ۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنے تحقیقی مقالے "کیمبرج کی اردو قلمی کتابوں پر ایک سرسری نظر" میں اس نسخے کا ذکر کیا ہے[۱]۔

ک ۔ گلشن ہند :۔ انجمن اسلام اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، بمبئی میں گلشن ہند کے ایک مخطوطے کی موجودگی کی اطلاع قاضی عبدالودود نے راقم الحروف کو ایک خط میں دی تھی (مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء) راقم الحروف نے انجمن اسلام اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، بمبئی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو موصوف نے اطلاع دی کہ یہ نسخہ ان کے سنٹر میں موجود نہیں ہے شاید کوئی اڑا لے گیا یا قاضی عبدالودود صاحب کو تسامح ہوا ہے[۲]۔

ل ۔ ایک اور قلمی نسخے کی رامپور رضا لائبریری، رام پور (اتر پردیش) میں موجودگی کی اطلاع اکبر علی خاں عرشی زادہ نے راقم الحروف کو ایک خط مورخہ (۱۴ مئی ۱۹۷۳ء) میں دی ہے۔

تذکرہ گلشن ہند کے مطبوعہ نسخے

تذکرہ گلشن ہند کے تاحال دو نسخے شایع ہوئے ہیں ۔ پہلے نسخے کو عبداللہ خاں نے ۱۹۰۶ء میں شایع کیا ۔ اس نسخے کے دستیاب ہونے کی داستان بڑی دلچسپ ہے حیدرآباد دکن کی مشہور "موسیٰ ندی" میں ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں زبردست سیلاب آیا ۔ اس سیلاب میں ہزاروں آدمی ہلاک اور عمارتیں منہدم ہوگئیں ۔ اسی سیلاب نے اپنے ساتھ کسی آفت زدہ کا ایک پورا کتب خانہ بھی بہا لایا جس میں یہ تذکرہ گلشن ہند بھی تھا۔

۱۔ معارف (علی گڑھ اگست ۱۹۲۶ء)، ص ۱۲۶
و (مقالات ہاشمی (لاہور ۱۳۳۶ھ) ص ۲۵۴
۲۔ شخصی مکتوب (مورخہ ۱۵۔ مارچ ۱۹۷۴ء)

حسن اتفاق سے یہ تذکرہ مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھوں میں پہنچا۔ انھوں نے اس نایاب وکمیاب تذکرہ کو شمس العلماء شبلی نعمانی کو دکھایا۔ علامہ شبلی نے اس تذکرہ کو مطالعے کے بعد بہت پسند کیا۔ مولوی غلام محمد کی درخواست پر علامہ شبلی نعمانی نے اس تذکرے کو تصحیح وحواشی کے ساتھ ترتیب دیا۔ بعد ازاں عبداللہ خاں نے مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھوا کر اس کو ۱۹۰۶ء میں رفاہِ عام پریس' لاہور سے چھپوا کر شایع کیا۔

یہ تذکرہ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے میں بشمول مرزا علی لطف (۷۰) شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ شعرا کے حالاتِ زندگی قلمی نسخے کے مطابق ہیں۔ بعض مقامات پر کچھ ردو بدل کیا گیا ہے جب کہ نمونۂ کلام بہت زیادہ حذف کر دیا گیا ہے۔ ترتیب حروفِ تہجی میں ہے۔ مطبوعہ نسخے کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے جو لطف کا دیباچہ ہے:۔

"رعنائی اور زیبائی دلبران سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے معشوقانِ زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔"

پہلے شاعر آفتاب (شاہ عالم) ہیں اور اختتام یکرنگ (مصطفیٰ علی خاں) پر ہوتا ہے۔ تذکرے کے آخر میں ترقیمہ میں یہ عبارت درج ہے:۔

"بعون اللہ تعالےٰ کتاب تذکرہ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف بتاریخ بست وششم ماہ ربیع الثانی ۱۲۳۵ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گزشتہ بہ اتمام رسید"

گلشن ہند مرتبہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی اشاعت کے اٹھائیس برس بعد انجمن ترقی اردو ہند نے تذکرہ گلزار ابراہیم کو تذکرہ گلشن ہند کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے مرتب کروا کر شایع کیا۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کا مرتب کردہ تذکرہ (مع حواشی) مولوی عبدالحق کے مقدمہ اور عبداللہ خاں کی تحریر (بعنوان پبلشر کی التماس) شامل کر دئے گئے

ہیں لیکن تذکرۂ گلزار ابراہیم کو مکمل طور پر اڈٹ نہیں کیا گیا۔ صرف ان شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام دیئے ہیں جو تذکرہ گلشن ہند میں نہیں ہیں تذکرہ گلزار ابراہیم کی تحریر فارسی زبان میں ہے جب کہ لطف نے تذکرہ گلشن ہند اردو میں لکھا ہے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم میں ۳۱۹ شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ خود علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے اس تذکرے میں اپنے حالات زندگی اور نمونۂ کلام نہیں دیا ہے تذکرہ گلشن ہند میں بشمول لطف ۷۰ شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم کی ترتیب حروف تہجی میں ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے تذکرہ گلزار ابراہیم کی عبارت پر گلشن ہند میں جو اضافہ ہے اس کو درج کیا ہے اگر اس کا ذکر صرف گلزار ابراہیم میں ہے گلشن ہند میں نہیں ہے تو گلزار ابراہیم کی عبارت نقل کر دی ہے اور جہاں کوئی اضافہ نہیں ہے لکھ دیا گیا ہے کہ کوئی اضافہ نہیں ہے۔ گلزار ابراہیم میں شعرا کے جو منتخب اشعار تھے ان کی تعداد لکھ کر اکثر مقامات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ اشعار بھی شامل کئے جاتے تو وضاحت ہوتی اور گلزار ابراہیم و گلشن ہند کے موازنے میں مدد ملتی۔ اس سے کتاب کے حجم میں اضافے کا امکان تو ضرور تھا۔ مگر یہ مفید بات تھی۔ جہاں کہیں گلزار ابراہیم کا گلشن ہند سے موازنہ کیا گیا ہے نہایت سرسری ہے مثلاً سودا کے سلسلے میں یہ نوٹ دیا ہے کہ:۔

"بالکل لفظی ترجمہ ہے لیکن لطف نے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر نواب آصف الدولہ کی تعریف کے قصیدے اور سودا کے مدفن کا ذکر اپنی طرف سے بڑھایا ہے[۵۱]"

لطف کی عبارت کے اکثر حصے ترجمہ ضرور ہیں لیکن اصل اور ترجمے میں ایسے اختلافات بھی ہیں جن کی موجودگی میں اسے بالکل لفظی ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ گلزار ابراہیم میں سودا کی وفات پر قمرالدین منت کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ درج ہے یہ قطعہ گلشن ہند میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے لطف نے وہ قطعہ درج کیا ہے جو سودا کے سنگ مزار پر کندہ ہے کہ یہ قطعہ کس شاعر نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر زور نے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کا موازنہ کرتے ہوئے اس اختلاف کا

۱۔ تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند (علی گڑھ ۱۹۳۴ء) ص ۱۸۱

تذکرہ نہیں کیا ہے۔ دیگر شعرا کے سلسلے میں بھی جو موازنہ کیا گیا ہے وہ اسی طرح تشنہ اور ادھورا ہے
ڈاکٹر زورؔ کی مرتب کردہ گلزار ابراہیم ایک انوکھے طرز کی ایڈیٹنگ کو پیش کرتی ہے
جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جب اس کتاب کو تذکرہ گلزار ابراہیم معہ تذکرہ گلشن ہند کا نام دیا گیا
ہے تو چاہیے تھا کہ تذکرہ گلزار ابراہیم کو مکمل صورت میں پیش کیا جاتا۔ ڈاکٹر زور نے جو کتاب
ترتیب دی ہے اس پر تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا اطلاق ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ دراصل تذکرہ گلشن ہند
ہے جسے علامہ شبلی نعمانی نے مرتب کیا تھا۔ اس میں صرف ان شعرا کے حالات اور نمونہ کلام کا اضافہ
کیا ہے جنھیں لطف نے جلد اول میں نظر انداز کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں سرسری طور پر دونوں تذکروں
کا موازنہ کر کے بعض اختلافات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لطف نے جن شاعروں کے بارے میں
گلزار ابراہیم کی فراہم کردہ معلومات کے علاوہ اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کیا۔ ڈاکٹر زور نے
گلزار ابراہیم کی عبارت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نوٹ کے ساتھ کہ مترجم نے اضافہ کیا ہے
صرف لطف کی عبارت درج کر دی ہے لیکن ہر جگہ وہ اس طریقے پر کاربند نہیں رہے۔ چنانچہ
تاباں کے ذکر میں پہلے انھوں نے گلزار ابراہیم کی عبارت نقل کر دی ہے اور پھر گلشن ہند کی عبارت
جوں کی توں درج کی ہے۔ جب کہ گلزار ابراہیم میں تاباں کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ لطف
نے اپنے بیان میں شامل کرتے ہوئے اس پر مزید معلومات کا اضافہ کیا ہے۔

اردو تذکروں میں گلشن ہند کا مرتبہ

اردو میں مرزا علی لطف کے تذکرے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس
وقت ہوگا جب ہم لطف کے تذکرے کا موازنہ پیش رو تذکروں سے کریں اور اس غرض
سے ہم آئندہ اوراق میں "گلشن ہند" سے قبل لکھے گئے تذکروں میں مندرج چند اہم شعرائے

اردو کے حالات زندگی کا تقابلی جائزہ لیں گے۔ لطف نے ان تذکروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے چند نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے اور بعض جگہ پیش رو تذکروں کی فراہم کردہ معلومات ہی کو دوہرا دیا ہے یا صرف ان کا اقتباس پیش کر دیا ہے۔

ذیل میں چند منتخب شعرا کے بارے میں مختلف تذکروں کے ایسے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو ما قبل تذکروں میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور آخر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ لطف نے اپنے طور پر ان کے حالات زندگی کے تعلق سے کن معلومات کا اضافہ کیا۔

۱۔ سراج الدین علی خاں آرزو

میر تقی میر (نکات الشعراء) :۔

میر نے آرزو کی تصنیفات کی تعداد، دس تا پندرہ بتائی ہے۔ جس میں رسائل، دیوان اور مثنویات شامل ہیں ان کے کمالات کو احاطۂ بیان سے باہر اور فن ریختہ کے تمام استادوں کو ان کا شاگرد ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ "آرزو نے تفریح طبع کے لئے دو تین شعر ریختے میں بھی کہے ہیں۔ اور اس بے اعتبار فن کو جس کو ہم نے اختیار کیا ہے کوئی اہمیت نہیں دی ہے"[۱]

سید فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) :۔

"آرزو، شیخ محمد غوث گوالیاری کے خاندان سے ہیں۔ ابتدائے جوانی ہی سے شاہ جہاں آباد (دہلی) میں مقیم تھے۔ ایک ضخیم دیوان جس میں شاہکار قصائد بھی شامل ہیں جمع کیا ہے۔ فغانی کے تمام دیوان اور سلیم کا جواب لکھا ہے۔ نیز زلالی کی مثنوی "محمود و ایاز"

۱۔ ص ۳

کے جواب میں مثنوی "شورِ عشق" لکھی ہے۔ جس میں بہت جستجو کی ہے اور معنی آفرینی سے کام لیا ہے۔ اکثر معاصرین کے اشعار پر بھی انتقاد کیا ہے۔ مثلاً افضل المتاخرین شیخ محمد علی حزیں پر اعتراضات کئے ہیں۔ دہلی میں وہ اپنا وقت طلباء کے افادہ کے لئے صرف کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تفریح طبع کے طور پر ریختہ بھی کہتے ہیں اور میاں آبرو اور میاں مضمون نے جو ریختہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں آرزو ہی سے ریختہ کا استنباط کیا ہے اور ریختہ کی زبان ان ہی سے سیکھی ہے[۱]"

محمد قیام الدین قائم (مخزن نکات):-

"سراج الدین علی خاں آرزو کے کمالات کا شمار کرنا بارش کے قطروں کو گننے یا آسمان کی بلندی کو ناپنے کے برابر ہے اگرچہ کہ ریختہ کے لئے دماغ سوزی ان کے شایان نہ تھی۔ لیکن وسعتِ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ میاں آبرو کے اشعار کو اصلاح دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کے اشعار میں دو تین شعر زیادہ کیا کرتے تھے[۲]۔"

عنایت اللہ فتوت (ریاض حسینی):- (قلمی)

فتوت نے اپنے تذکرے میں کوئی نئی بات نہیں لکھی ہے[۳]۔

قیام الدین حیرت اکبرآبادی (تذکرہ مقالات الشعرا)

"آرزو کا وطن گوالیار ہے۔ ابتدائی تعلیم اکبرآباد میں ہوئی۔ ختم تعلیم پر شاہجہاں آباد کو اپنا وطن بنایا۔ ارکان دار الخلافہ اور امرائے سلطنت نے ان کی تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن آرزو نے کمال استغنا اور بے پروائی سے اپنی زندگی گزار دی۔ ان کی شہرت اطراف

۱۔ ص ۶
۲۔ ص ۱۴
۳۔ ص ۲۴

واکناف میں پھیل گئی۔ ان کی شاعری کا آوازہ سخن فہموں کے کانوں میں پہنچا ان کی نکتہ سنجی، زبان دانی اور آداب محفل ضرب المثل تھے۔ آرزو کی تصانیف میں غزل کا دیوان، تذکرہ شعرا، بیان اصطلاحات شعر، قدسی پر منیر کے اعتراضات کے جواب کے علاوہ ان کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہوگی۔ آرزو سا شاعر گو بہت کم پیدا ہوا ہے آخر میں نواب اسحق خاں کے بیٹوں کے ساتھ پورب آ گئے اور لکھنو میں رحلت کی"[۵۱]

لچھمی ناراین شفیق (چمنستان شعرا):-

"گلشن ہند" میں آرزو سا بلبل ہزار داستان بہت کم ہے۔ اور مجلس سخن میں ایسا پروانہ چراغ سخن کوئی نہیں۔ آرزو کا سال وفات ماہ جمادی الثانی ۱۱۶۹ھ ہجری ہے۔ چنانچہ میر صاحب قبلہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مدظلہ العالی نے تاریخ رحلت کہی ہے۔

سراج الدین علی خاں نادر عصر
ز مرگ او سخن را آبرو وقت
اگر جوید کسے سال وفاتش
بگو "آں جان معنی آرزو رفت"[۵۲]
۱۱۶۹ ہجری

قدرت اللہ شوق (طبقات الشعرا):-

"فارسی اور ریختہ کے اکثر استاد ان کے شاگرد تھے ان کی لغت "سراج اللغات" بہت مشہور ہوئی"۔[۵۳]

۱۔ ص ۱۵
۲۔ ص ۷۶
۳۔ ص ۶۴

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) :-

"ہندوستان جنت نشان میں امیر خسرو دہلوی کے بعد آرزو جیسا پُرگو اور خوش گو شاعر پیدا نہ ہوا۔ آرزو کے سات دیوان ہیں، ہر دیوان نظیری اور فغانی کی برابری کرتا ہے۔ دیوان کے علاوہ دوسرے تصنیفات بھی ہیں"[1]

اَسد علی خاں تمنّا اورنگ آبادی (گل عجائب) :-

"سراج الدین علی خاں کی تعلیم کا آغاز (۱۴) سال کی عمر میں ہوا۔ چند دنوں بعد ان کی موزونیتِ طبع کا غنچہ کھل گیا۔ اور وہ اشعار کہنے کی جانب مائل ہوئے۔ اپنا ابتدائی کلام میر عبد الصمد سخن کو دکھایا۔ سخن کے انتقال کے بعد میر غلام علی احسنی سے اصلاح لی۔ چنانچہ (۱۶) سال کی عمر میں آرزو نے جو غزل کہی ہے اس کا مطلع ہے:-

تا دیدہ ام بہ زلف پریشاں او گرہ
دارم چو کرد بادِ نفس در گلو گرہ

آرزو کے والد شیخ کمال الدین، شاہ چراغ دہلوی کے ہمشیر زادے تھے اور ان کا سلسلۂ نسب والدہ کی جانب سے شیخ محمد غوث گوالیاری تک پہنچتا ہے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کا سلسلہ فرید الدین عطار پر ختم ہوتا ہے۔ اس بناء پر ان کے فرزند کو عطاری کہتے ہیں خود آرزو نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے۔

جد ست مرا حضرت عطار ازیں رُو
اشعار خود اکنون بہ نیشاپور فرستم[2]

۱۔ ص ۵

۲۔ ص ۱

میر غلام حسین شورش (تذکرہ شورش)

"آرزو کو محمد شاہ بادشاہ غازی کے عہد میں ملک الشعرا کا مقام حاصل تھا"[۱]

ابوالحسن امیر الدین احمد (مسرت افزا):۔

"باپ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے شیخ کمال الدین تک اور والدہ کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری تک پہنچتا ہے۔ ان کی ولادت گیارہ سو ایک ہجری میں ہوئی تھی۔ ابتدا میں علوم متداولہ حاصل کئے اور آغاز عمر ہی میں ذوقِ شعر بھی پیدا ہوگیا۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں ۱۱۶۴ ہجری میں شاعروں کا ایک تذکرہ "مجمع النفائس" مرتب کیا۔ ۱۱۳۲ھ ہجری میں گوالیار سے دارالخلافہ شاہجہاں آباد آئے اور بعض دوستوں کی کوشش سے موتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری سے ملاقات کی۔ خان مذکور نے ان کی کما حقہٗ قدر دانی اور خدمت کی۔ موتمن الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ نجم الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سالار جنگ سے متعلق ہو گئے اور ان کے ساتھ دہلی سے مشرقی علاقے کا سفر کیا اواخر محرم ۱۱۶۸ میں نواب صفدر جنگ ناظم صوبۂ اودھ کے انتقال کے چند روز بعد صوبۂ اودھ میں چلے گئے جو ان کے جد شیخ کمال الدین کا وطن اصلی تھا۔ اودھ میں آنے کے بعد سالار جنگ کی وساطت سے نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا جب انتقال کا وقت قریب آیا تو لکھنو کے علاقے میں چلے آئے۔ ۲۳۔ ربیع الآخر ۱۱۶۹ھ ہجری کو خدا کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ شروع میں ان کی لاش کو لکھنو میں بطورِ امانت

---

[۱] ۔ ص ۱۳

رکھا گیا کچھ دنوں بعد شاہ جہاں آباد لے جاکر دفن کیا گیا میر غلام علی آزاد نے یہ رباعی تاریخ وفات کی۔

خان والا شان سراج الدین علی
شمع رونق بخش بزم گفتگو
زد رقم آزاد سالِ رحلتش
رخصتِ کامل۔ روحِ آرزو[1]

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشن سخن)؛-

"سراج الدین علی خاں آرزو محمد شاہ اور احمد شاہ دونوں کے زمانے میں اپنے معاصرین پر سبقت رکھتے تھے۔ دہلی سے سالار جنگ برادر نجم الدولہ اسحٰق خاں کے ساتھ لکھنو آئے۔ جب تک زندہ رہے۔ ان کی رفاقت نہ چھوڑی اور لکھنو میں داعی اجل کو لبیک کہا"[2]۔

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم)

"آرزو تخلص، نام سراج الدین علی خاں۔ ہندوستان کے مشاہیر شعرا سے ہیں۔ فارسی میں ان کا مبسوط دیوان موجود ہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ۱۱۶۹ ہجری میں ان کا انتقال ہوا کبھی بطور تفننِ طبع ریختہ میں بھی شعر کہے ہیں"[3]

غلام ہمدانی مصحفی (عقد ثریا)

"آرزو کی تاریخ ولادت ۱۱۰۱ ہجری ہے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کے دربار سے آرزو اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے اور جان کندنی کی حالت میں تھے۔ ایک

۱۔ ایضاً: ڈاکٹر جیب قریشی (دہلی ۱۹۶۸ء) ص ۱۳۱ و ۳۲
۲۔ ص ۶۵
۳۔ قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، ص ۳ (ب)

شخص حاضر ہوا اور کہا کہ میں ایک مدت سے آپ کی قدمبوسی کا آرزومند تھا آرزو نے فوراً جواب دیا۔ " امروز آرزوئی شما تمام می شد"

لکھنؤ میں انتقال کے بعد آرزو کی نعش کو اماناً لکھنؤ میں سپردِ خاک کیا گیا اور ایام موعود ختم ہونے کے بعد ان کا جسدِ خاکی لکھنؤ سے شاہجہاں آباد لے جاکر دفن کیا گیا۔"[۱]

محمد وجیہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی):۔

"سراج الدین علی خاں آرزو خلف شیخ حسام الدین حسام"۔ عشقی نے آرزو کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے اور آرزو کے "ساقی نامہ عالم آب" اور مثنوی "جوش وخروش" اور لغت "شرح مختصر معانی"۔ "سراج اللغات" اور شرح "گل گشتی میر نجات" کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ آرزو کی ایک مثنوی حدیقہ حکیم سنائی کی بحر میں ہے ۔

عشقی نے آرزو کے اس شعر پر

رکھے سیپارہ گل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

الطائے جلی کا اعتراض کیا ہے کیوں کہ "شہیدوں اور "عندلیبوں" کے قافیے سے علامت جمع " وں " دور کردی جائے تو عندلیب اور شہید رہ جاتا ہے جو درست قافیہ نہیں ہے"[۲]

مرزا علی لطف (گلشن ہند):۔

" آرزو تخلص، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبرآباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ

۱۔ ص ص ۸۷

۲۔ ص ۱۳

اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے شیخ نصیر الدین محمود کے کہ چراغ دہلوی جن کا لقب تھا ملتا ہے اور ماں کی طرف سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپور کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا۔ فاضلوں سے علم کے جس قدر کہ فائدہ چاہیے تھا اٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور ہوا یعنی اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا۔ سنہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری تھے کہ دار الخلافہ ہندوستان میں آیا اور زور و شور شاعری کا زبان دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمتہ ایران سے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ دگداسب آئے۔ سراج الدین علی خاں نے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت ان سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے اور نام اس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشاق، جوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرہ آفاق اگرچہ سر رشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہاں سے تھا لیکن توسل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خراب ہوتے شاہجہاں آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے لیکن

مطبوعہ نسخے میں ۱۱۳۰ گیارہ سو تیس ہجری لکھا ہے۔

فلک نیرنگ باز نے نیرنگی ہی کے رنگ دکھائے۔ چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے اور لاش کو ان کی بموجب وصیت کے نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہ جہاں آباد کو بھجوا دیا بہت سی کتابیں اوس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں۔ فنِ معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اس کا موہبت عظمیٰ ہے اور فنِ بیان میں ایک رسالہ اوس کی تصنیف سے مشہور ہے عطیۂ کبریٰ ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے کہ نام اوس کا "سراج الغت" ہے بطور برھان قاطع کے اور سوائے اس کے حال کی اصلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے کہ مشہور چراغ ہدایت کرکے۔ شرح اسکندر نامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے اور گلستاں کی شرح کہ نام اس کا خیاباں ہے تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے ۱۱۶۹ گیا سوا نہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسۂ زندگی کے لئے کتاب ہستی کو گردان کے استادِ اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اس کے مشہور ہیں۔"[1]

مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ کی بنیاد سنی سنائی باتوں کی بجائے تحقیق پر رکھی ہے۔ مثلاً دوسرے تذکرہ نگاروں کے برخلاف لطف نے لکھا ہے کہ آرزو نے بہت سے کتابیں تالیف کی ہیں۔ "اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کی گزری ہیں۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اس کا "موہبتِ عظمیٰ ہے اور فنِ بیان میں آرزو کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" اور ایک فرہنگ لکھی ہے "سراج اللغت" اور ایک نسخہ تالیف کیا ہے۔ "چراغِ ہدایت" "سکندر نامہ" اور قصائد عرفی کی شرح لکھی ہے "خیاباں" کے

۱۔ ص ۲۳ و ۲۴ (مطبوعہ) قلمی مخزونہ جرمنی ص ۱۶ و ۱۷

نام سے گلستان کی شرح لکھی ہے۔ فارسی شعرا کا ایک تذکرہ "مجمع النفائس" کا ترجمہ دلچسپ لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔

قیام الدین حیرت اکبرآبادی نے اپنے تذکرے مقامات الشعرا میں آرزو کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار لکھی ہے۔ لطف نے آرزو کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے۔

لطف نے آرزو کے شاہجہاں آباد آنے کا سنہ بھی درج کیا ہے اسی ضمن میں شیخ محمد علی حزیںؔ کی ایران سے ہندوستان کی ہجرت کا بھی ذکر ہے دوسرے تذکرہ نویسوں نے ان سنین کو نظرانداز کر دیا ہے۔

لطف نے علی حزیںؔ پر آرزو کے اعتراضات اور "رسالہ تنبیہ الغافلین" کی تالیف کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رائے حزیںؔ کی تائید میں دی ہے اور قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ اعتراض عوام کو تشویش میں ڈال سکتے ہیں لیکن باریک بینوں کے نزدیک ان اعتراضات کی حقیقت آپس کی نزاع اور پرخاش سے زیادہ نہیں۔

علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے اپنے تذکرہ "گلزار ابراہیم" میں آرزو کے حالاتِ زندگی صرف ڈھائی سطور میں دئے ہیں اور صرف (۴) اشعار نقل کئے ہیں جب کہ لطف نے دو صفحات پر آرزو کے حالاتِ زندگی مفصل بیان کئے ہیں اور آرزو کے نمونۂ کلام کے طور پر (۱۲) اشعار دئے ہیں۔

۲۔ شیخ محمد حاتم۔ حاتمؔ

میر تقی میر (نکات الشعرا) :۔

میر نے حاتم کو شاہجہاں آبادی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے اشعار کی تعداد زیادہ ہے حاتم کا دیوان ردیف "م" تک نظر سے گزر چکا ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔

" با من آشنائے بیگانہ است "آشنائے بیگانہ" کا طنز میر کے مزاج کی غمازی کرتا ہے ۔ میر نے ستم یہ کیا ہے کہ حاتم کے اشعار کو نقل کرتے ہوئے ان پر ایسا ایراد کیا ہے جس کی سرحد ابتذال سے ملتی ہے مثلاً یہ شعر :۔

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

اگر شعر من می بود ایں چنیں می گفتم :

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں
آگے آیا مرے کیا میرا [۱]

خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی (گلشن گفتار)

" محمد حاتم ۔ حاتم دہلی کے باشندے ، صاحبِ ہمت اور طبع عالی رکھتے ہیں حمید نے ضلع جگت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاتم کی رعایت سے "بخل" کے لفظ کو کھینچ تان کر اس طرح لایا ہے

"بخل در دادن شعر ہرگز نہ کرد ۔"

" حمید نے حاتم کی مثنوی " الہام " جو حقّہ کی تعریف میں ہے ۔ کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نقل کیا ہے جو کافی دلچسپ ہے اور الہام کی تعریف اس شعر پر صادق آتی ہے :۔

تمباکو کو نہ جانو کیا سبب ہے
ملا ہے گڑ میں اور کیوں گڑ طلب ہے [۲]

سید فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویان)

" حاتم اسرار معنی کے ملہم ہیں ۔ ان کا وطن شاہجہاں آباد ہے ۔ ان کی طبیعت

---

۱ ۔ میر ، نکات الشعرا ص ۔ ۷۹

۲ ۔ ص ۔ ۲۵

کھوٹے کھرے کی نقاد ہے"[۱]۔

شیخ محمد قیام الدین قائم (مخزن نکات)

"حاتم معمون اور آبرو کے ہم صحبت ہیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں نواب عمدۃ الملک کی ندیمی کے ساتھ ساتھ "خدمت بکاولی" (خوان سالاری) پر مامور تھے۔ نواب عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد توکل اور آزادی کے ساتھ اپنی زندگی گذاری۔ ان کے دیوان میں چار ہزار شعر ہیں جس میں منتخب اشعار قابل لحاظ ہیں"[۲]۔

عنایت اللہ خاں فتوت (تذکرہ ریاض حسینی)

حاتم کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں لکھی ہے[۳]۔

لچھمی نارائن شفیق، (تذکرہ چمنستان شعرا)

حاتم کی مثنوی "حقہ" کی شانِ نزول اس طرح بیان کی ہے کہ محمد شاہ بادشاہ نے جعفر علی خاں ذکی سے مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن جعفر علی خاں دو شعر سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ حاتم نے اس مثنوی کی تکمیل کی[۴]۔

۱۔ گردیزی ص ۴۹

۲۔ ص ۴۴۔

۳۔ ص ۵۸۔

۴ ص ۳۴۔

قدرت اللہ شوق (تذکرہ طبقات الشعرا)

"حاتم کا قدیم دیوان مولف کی نظر سے گزرا۔ آبرو اور ناجی کی طرز میں شعر کہتے ہیں۔ اکثر اشعار لطف سے خالی ہیں۔ حاتم نے مختصر دیوان بھی مرتب کیا ہے جس کا نام "دیوان زادہ رکھا ہے[۱]۔"

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو):۔

"حاتم کے دو دیوان ہیں ایک قدیم زبان میں بطورِ ایہام دوسرا حالیہ زبان میں۔ حاتم کے اشعار کی بہت زیادہ شہرت ہے ان کی اکثر غزلیں اربابِ نشاط گاتے ہیں[۲]۔"

غلام حسین شورش (تذکرہ شورش):۔

"حاتم کی زبان" فصاحت اور روانی سے خالی نہیں ان کی اور ولی کی زبان میں مناسبت پائی جاتی ہے[۳]۔"

ابوالحسن امیر الدین احمد (مسرت افزا):۔

"حاتم، شاہ جہاں آباد کے رہنے والے ہیں۔ میاں آبرو کے ساتھی (ہم ہر طرح) تھے کہتے ہیں کہ قلندر مشرب اور دیر آشنا بہت ہی اچھے شاعر تھے[۴]۔"

۱۔ ص۔ ۳۷

۲۔ ص ۴۶

۳۔ ص ۱۸۹

۴۔ (مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی) (دلی ۱۹۶۸ء) ص ۷۷

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم) :۔

"حاتم تخلص، دہلوی ۔ مشاہیر ریختہ گویوں میں ان کا شمار ہے ۔ شاہ آبرو اور مرزا محمد رفیع سودا کے معاصر تھے ۔ کہتے ہیں کہ ان کے دو دیوان ہیں ایک دیوان قدیم طرز میں ایہام سے بھرا ہوا اور دوسرا متاخرین کے طریقے پر مرتب کیا ہے یہ قدیم اور جدید طرز کے جامع ہیں[1]"

غلام ہمدانی مصحفی (عقدِ ثریا) :۔

"حاتم کی ولادت کا مادّۂ تاریخ لفظ "ظہور" ہے جس سے ۱۱۱۱ھ ہجری بر آمد ہوتے ہیں ۔ حاتم جوانی میں سپاہی پیشہ تھے ۔ ان کا ابتدائی تخلص رمزی تھا ۔ ابتدائی ایام میں امرا اور روسا حاتم کے قدر داں تھے اس لئے ان کی ابتدائی زندگی عیش و طرب میں گزری لیکن آخر میں جب قدر داں باقی نہ رہے توکل اور گوشہ نشینی اختیار کی ۔" مصحفی نے بڑے مزے کی بات لکھی ہے کہ حاتم درازی عمر کی وجہ سے اپنے آپ کو رفتگان میں شمار کرتے تھے اور خود کو "حاتم ثانی" کہا کرتے تھے مصحفی نے حاتم کی رحلت پر قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جس کا آخری شعر جس میں مادہ تاریخ ہے یہ ہے :۔

که بگو مصحفی چو پرسیدت
آہ صد حیف شاہ حاتم مرد[2]
۱۱۹۷ ہجری

غلام ہمدانی مصحفی (تذکرہ ہندی)

"حاتم نے اپنے دیوان کے دو تین اوراق پر اپنے شاگردوں کی طویل فہرست دی ہے

---

[1] ۔ (قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی ۔ کلکتہ ص ۷۶ (ب) ۔ [2] ۔ ص ۶۳

جس میں مرزا رفیع سودا کا بھی نام ہے[۱]

شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی)

"مطربانِ ہند حاتم کی غزلیں حال و قال کی محفلوں میں گاتے ہیں جس پر درویش اور صوفی مشرب لوگ وجد کرتے ہیں[۲]۔"

سید حیدر بخش حیدری (گلشنِ ہند) (قلمی)

"حاتم مرزا رفیع سودا کے ہم جلیس تھے[۳]"

مرزا علی لطف (گلشنِ ہند):-

"حاتم تخلص، شاہجہاں آبادی، مشہور ریختہ گویوں میں دلّی کے تھا۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا۔ شاعر خوش بیان تھا، صاحبِ دو دیوان تھا ایک دیوان میں نہایت خرچ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطورِ متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طورِ متاخرین اور طورِ ایہام کا[۴]"

مرزا علی لطف نے "گلشن ہند" میں آبرو اور سودا کو حاتم کا ہمعصر لکھا ہے۔ استادی شاگردی کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے برخلاف مصحفی نے سودا کو حاتم کا شاگرد بتایا ہے۔

مرزا علی لطف نے حاتم کے (۲۲) اشعار کا جو انتخاب دیا ہے اس میں ایک شعر ہے

۱۔ ص۔ ۸۰

۲۔ ص۔ ۱۹۰

۳۔ ص۔ ۲۲۶

۴۔ ص ۸۱ (مطبوعہ) قلمی مخزونہ جرمنی ص ۶۲و۶۳۔

میر عبدالحی تاباںؔ کا حاتم کا شاگرد ہونا پایا جاتا ہے۔

فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا[1]

قلمی مخزونہ جرمنی میں لطف نے (۲۲) اشعار دیئے ہیں۔ مطبوعہ میں (۲۰) اشعار موجود ہیں۔

۳۔ مرزا مظہر جانِ جاناں۔ مظہرؔ

میر تقی میرؔ (نکات الشعرا):-

"مظہر تخلص، اکبر آباد کے رہنے والے۔ ان کے والد کا نام میر جان جاں تھا اور فرطِ محبت سے بیٹے کو مرزا جانِ جاں کہا کرتے تھے۔ اس لئے اسی نام سے موسوم ہوئے بندہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت حاصل کر چکا ہے۔ جانِ جاں کا اکثر وقت یادِ الٰہی میں صرف ہوتا ہے۔ ایسے خوش تقریر ہیں کہ تحریر میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا مختصر فارسی دیوان فقیر (میر) کی نظر سے گزرا ہے۔ سلیم و کلیم سے ان کا مرتبہ کم نہیں۔ اگرچہ کہ شعر کہنا ان کے شایانِ شان نہیں لیکن کبھی کبھی اس بے حاصل فن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انعام اللہ یقینؔ اور حزیںؔ شعرائے ریختہ گو ان کے شاگرد ہیں۔ میر نے اس جملہ پر مظہر کا بیان ختم کیا ہے۔ غرض کہ مرزا کی عجیب شخصیت ہے[2]"

۱۔ ق ۸۱ و ۸۲ (ذ و ع) قلمی مخزونہ جرمنی ص ۶۲ و ۶۳

۲۔ ص۔ ۵

خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی (گلشنِ گلفتار) :-

"مظہر کے فارسی اور ہندی (ریختہ) اشعار ہندوستان سے دکن تک زبان زد عام اور اظہر من الشمس ہیں۔[۱]"

مرزا افضل بیگ خاں قاقشال (تحفتہ الشعرا) :-

"مرزا جانِ جاناں مظہر تخلص، شاہجہاں آبادی۔ دیوانِ فارسی و ریختہ مختصر ہے لیکن کلام عدیم المثل اور درد وصال سے بھرا ہوا ہے۔[۲]"

سید فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) :-

"مرزا جانِ جاناں مظہر ان کی اصل بخارا ہے لیکن مولد و منشا اکبرآباد ہے۔ جب صوفیانِ خانقاہ اور مستفیدان خدا خواہ کی صحبت سے فرصت ملتی تھی تو اس شغل بے حاصل یعنی شاعری کی جانب توجہ کیا کرتے ہیں۔[۳]"

قیام الدین قائم (مخزن نکات) :-

"مظہر اوائل جوانی میں شعر و شاعری میں مشغول تھے لیکن آخر عمر میں انھوں نے شاعری کو ترک کر کے سجادہ طاعت اور فقر و قناعت کو اختیار کیا۔[۴]"

۱۔ ص ۲۳

۲۔ ص ۱۶۳

۳۔ ص ۱۳۱

۴۔ ص ۳۴

عنایت اللہ فتوت (تذکرہ ریاض حسینی)

"مرزا مظہر جان جاناں کی اصل بخارا اور مولد اکبرآباد ہے۔ ان کا زیادہ وقت مطالعہ حدیث میں گزرتا ہے۔"[1]

قیام الدین حیرت اکبرآبادی (مقالات الشعرا):-

مقفیٰ عبارت میں مظہر کی تعریف کے سوا کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے[2]

لچھمی نارائن شفیق (چمنستان شعرا):-

"شفیق نے اپنا ماخذ بتاتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ مظہر کا مفصّل حال قبلہ برحق حضرت غلام علی آزاد مدظلہ العالی کے تذکرے سے نقل کیا گیا ہے۔ مظہر کے والد کا نام مرزا جان ہے اس مناسبت سے وجہ تسمیہ معلوم کی جا سکتی ہے لیکن ان کا نام اور تخلّص ترجمان اسرار مولانا روم کی عنایت ہے کہ پانچ سو سال پہلے مولانا روم نے اپنی مثنوی کے دفتر ششم میں ارشاد فرمایا ہے۔

جان اول مظہر درگاہ شد

جانِ جاں خود مظہر اللہ شد

شفیق نے لکھا ہے کہ چمنستانِ شعرا کی ترتیب کے وقت انھوں نے مرزا مظہر جانِ جاناں سے اشعار کا انتخاب اور حالات عطا کرنے کی خواہش کی جس پر مظہر نے خود اپنے

۱- ص ۱۸۴

۲- ص ۸۷

حالات اور اشعار لکھ کر ہدیہ احباب کئے مظہر کی اصل عبارت یہ ہے :۔

"فقیر جانِ جاں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان جانی تخلص۔ علوی نسب ہندی مولد، حنفی مذہب، نقشبندی مشرف است در عشرہ اولیٰ مائۃ ثانیہ بعد الف دلادتش اتفاق افتاد نشو و نمائے ظاہری در بلدہ، اکبرآباد یافتہ۔ تربیت باطینش در محروسہ شاہجہاں آباد۔ از جناب حضرت سید محمد بدایونی نقشبندی مجددی واقع شد۔ سلسلہ نسبش بہ نسبت دہشت واسطہ بتوسط محمد بن حنیفہ بہ شیر بیشہ کبریا علی مرتضیٰ کرم اللہ منتہی میشود"[۱]

قدرت اللہ شوق (طبقات الشعرا) :۔

"مرزا مظہر جان جاں کے دادا جباری خاں نے جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں منصب شش ہزاری پر سرفراز تھے۔ گجرات میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کی۔ شاہی افواج نے ان کو گرفتار کر کے اکبر اعظم کے حضور میں پیش کیا اکبر نے جباری خاں کی خطا تو معاف کردی لیکن یہ لکھا کہ میرے بعد جو بھی میرا جانشیں ہو وہ جباری خاں یا اس کی اولاد کو جاہ و اعزاز نہ دے"[۲]

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) :۔

"مظہر سنبھل مراد آباد میں سلسلہ نقشبندیہ میں مریدوں سے بیعت لینے کے علاوہ منبر وعظ پر بھی اپنی خطابت سے عقیدت مندوں کو مستفید کرتے ہیں"[۳]

۱۔ ص ۔ ۲۴۶

۲۔ ص ۶۱ ۔ ۳ ۔ ص ۱۵۵

اسد علی خاں تمنّا اورنگ آبادی (تذکرہ گل عجائب):۔

تمنّا نے مظہر کا صرف فارسی کلام درج کیا ہے۔ اردو کلام اور حالات زندگی کو نظر انداز کر دیا ہے۔[۱]

غلام حسین شورش عظیم آبادی (تذکرہ شورش):۔

"مظہر کا کلام ریختہ جب پہلے پہل عظیم آباد پہنچا تو عظیم آباد میں ریختہ کا رواج ہوا۔"[۲]

ابو الحسن امیر الدین احمد (مسرّت افزا):۔

"مرزا مظہر جان جاناں۔ مظہر تخلص۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن بخارا تھا لیکن مرزا کے وجود کا مظہر خاک اکبر آباد سے ہوا۔ ان کا سالِ ولادت تولد آغاز ماہِ ثانی بعد الف ہجری ہے ان کے والد بزرگوار نے مرزا جان نام رکھا تھا۔ اور فرط محبت میں انھیں جان جاں کہتے تھے۔ اس لئے ہوتے ہوتے جان جاں سے جانجاناں مشہور ہو گئے۔ مرزا کی نشو و نما دار الحکومت دہلی میں ہوئی۔ خدا نے انھیں ہر طرح کے علوم اور ہر قسم کے فنون بے انتہا عنایت کئے تھے۔ خاص طور پر علم حدیث و معرفت سلوک و توحید میں بے نظیر ہو گئے۔ تذکرہ لکھنے کے بعد اس سال ہے کہ ۱۱۹۵ ہجری ہے دہلی کے ایک اوباش نے آٹھ یا نو محرم کو پستول کی گولی سے انھیں شہید کر دیا۔"[۳]

۱۔ ص ۔ ۱۴۷

۲۔ ص ۔ ۱۸۰

۳۔ (مترجم ڈاکٹر نجیب قریشی) (دہلی ۱۹۶۸ء) ص ۲۰۲ و ۲۰۳

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشن سخن):۔

"مظہر لوگوں کو عزاداری سید الشہداء علیہ السلام سے منع کیا کرتے تھے۔ اس بناء پر دہلی کے کسی باشندے نے ان کو قتل کر دیا۔ قتل کے وقت ان کی عمر ۔۔ اسال تھی"[1]

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم):۔

"مظہر تخلص، المعروف مرزا جان جاناں مشاہیر سخن وروں میں ہیں۔ حسن بیان اور انداز گفتگو میں اپنے زمانے میں یکتا تھے۔ وطن اکبرآباد ہے دہلی میں اقامت اختیار کی تھی۔ قناعت، استقامت طبع، مہارت علم فقہ میں شہرت اور حسن پرستی کی رغبت رکھتے تھے! انعام اللہ یقین۔ فقیہ صاحب درد مند اور میر عبدالحی تاباں ان کے شاگردوں میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ تعصب مذہبی کی وجہ سے ماتم سید الشہدا سے منع کرتے تھے اسی وجہ سے دہلی کے کسی باشندے کے ہاتھوں ۱۱۹۴ ہجری میں جب کہ ان کی عمر سو برس کے قریب تھی قتل ہوئے"[2]

غلام ہمدانی مصحفی (عقد ثریا):۔

"مظہر جان جان سادات علویہ سے نہیں تھے۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے جو ان کا سلسلہ سادات علویہ سے بتایا ہے وہ غلط محض ہے کیوں کہ مرزا کا تعلق اتراک توران سے ہے۔

مصحفی کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"والد داغستانی ور ریاض الشعرا مرزا مزلور را از سادات علویہ نوشتہ وایں

۱۔ ص ۔ ۲۱۸ ۔

۲۔ (قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ ۔ ص ۲۱۷ (ب)

غلط محض است چرا کہ مرزا بقول صحیح از اتراک توران است و بعد فوت والد ماجد خود مال و اسباب فراوان کہ بدستش افتادہ بود بذل مجالس و دعوت یاران نمود و در ہیجدہ سالگی ہمہ را پاک فروختہ کلاہ درویشی بر سر گذاشت" شب ہفتم محرم ۱۱۹۵ھ ہجری کو ایک شخص نے طپنچہ سے دل کی جانب مرزا مظہر کو زخمی کیا۔ اگرچہ کہ مظہر کی عمر اس وقت ۱۰.. سال تھی لیکن شدید زخمی ہونے کے باوجود ان کے حواس برقرار تھے۔ جس وقت ذوالفقار الدولہ نے مرزا مظہر کے پاس پیام بھیجا کہ اگر قاتل کو آپ پہچانتے ہیں تو بیان کیجئے تاکہ قصاص لیا جائے اور آپ کا ایما ہو تو علاج کے لئے فرنگی ڈاکٹر کو روانہ کیا جائے۔ مظہر نے جواب دیا۔

قصاص زندہ کے لئے ہوتا ہے میں خود مردہ متحرک تھا اگر کسی نے مردہ کو مار دیا تو اس کا کیا قصاص!

میں اپنا علاج آپ کر رہا ہوں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ زخمی ہونے کے تین دن بعد ۱۰۔ محرم کو مظہر نے جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ مظہر کے انتقال کے بعد انکے کسی نیازمند نے جب ان کا دیوان کھولا تو یہ شعر برآمد ہوا ؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

زخمی ہونے کے بعد یہ شعر مظہر کی زبان پر جاری تھا۔

چہ خوش بودے دل تنگ مادرے وا کرد
خدا دراز کند عمرِ زخم کاری ما

دوسرے تذکرہ نگاروں نے مظہر کی تاریخ وفات ۱۱۹۴ ہجری بتائی ہے۔ لیکن مصحفی نے ۱۱۹۵ ہجری لکھی ہے اور خود قطعہ وفات بھی لکھا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

پس از ساعتے سر ز جیب تامل
برآوردہ گفتت آہ مظہر کجائی [1]
۱۱۹۵ھ

---

[1] ۵۵ : ۵۵ [illegible]

غلام ہمدانی مصحفی (تذکرہ ہندی):-

"شاعری کے ابتدائی شوق کے زمانے میں جب کہ میر و مرزا اس میدان میں ابھی نہ آئے تھے مظہر نے فارسی کی تقلید میں ریختہ کی ابتدا کی اور چند غزلیں ریختہ میں کہیں لیکن میر عبد الحی تاباں نے جن کو مظہر بہت دوست رکھتے تھے ریختہ گوئی سے منع کیا جس کے بعد مظہر نے ریختہ کی بجائے فارسی زبان کو اپنے جذبات دلی کے اظہار کا ذریعہ بنایا"[1]

محمد وجیہہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی):-

"مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر اکثر شعر و سخن کے دقائق مرزا مظہر سے دریافت کرتے اور ان سے استفادہ کیا کرتے تھے"[2]

مرزا علی لطف (گلشن ہند):-

"مظہر تخلص، مشہور سخن وروں میں دلی کے مرزا جان جاناں مشہور تھے[3]۔ نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان اور انداز گفتگو میں نادر زباں تھے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے اور دلی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے۔ قناعت و استغنائے طبیعت کے ساتھ شہود اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دلبستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے۔ اور عشق حقیقی و مجاز سے کام۔ انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب دردمندان کے شاگردان رشید سے کہلاتے ہیں۔ اور میر عبد الحی تاباں تخلص بھی علی ہذا القیاس اس طرح سے گنے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لب بام یہ اپنے گھر میں سر راہ بیٹھے تھے اور کوئی

۱۔ ص ۲۰۴

۲۔ ص ۱۸۱ (دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد)

۳۔ مطبوعہ تذکرے میں "مرزا مظہر جان جانان کر کے مشہور تھے۔ مشہور سخنوروں میں دلی کے"

سردار روہیلوں کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے کہ ناگاہ گزر شدّوں کا ان کے زیر بام سے ہوا۔ اس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی اور موافق سلام سے ہوا اور مرزا مذکور جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے بلکہ متبسّم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمے کو ہو چکے ہوں ہر سال اسے تازہ کرنا بدعت ہے اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفّت ہے۔" یہ گفتگو بجنسہٖ وہ لوگ جو کہ عَلَم اور شدّوں کے ساتھ تھے انھوں نے سنی اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام باڑوں میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی آخر شب شہادت کو کہ عبادت دہم عاشورہ سے ہے، کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا اور ان کو باہر بلوایا۔ جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی' اور کام ان کا پورہ کر کے راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا اور ایسا زخم کاری کھایا لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ ۱۱۹۴ھ ہجری گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اس روشنی ساز مسائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کے منازل سے طریقت پر کیا۔[۱]

لطف نے مرزا مظہر جان جاناں کے بارے میں گلزار ابراہیم کی مکمل عبارت اردو میں منتقل کر دی ہے اس کے علاوہ دوسرے تذکروں کی فراہم کردہ بعض معلومات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے قتل کا واقعہ اتنی تفصیل کے ساتھ لطف سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا۔

۱۔ ص ۔ ۱۵۹ تا ۱۶۰۔ قلمی نخزونہ جرمنی ص ۱۹۹ ، ۲۰۰

۴ - میر تقی میر

میر تقی میر (نکات الشعرا)[1]

"اس کتاب کا مؤلف فقیر حقیر میر تقی میر اکبر آباد کا باشندہ ہے اور گردش لیل و نہار کی وجہ سے چند دنوں سے شاہجہاں آباد میں مقیم ہے"۔

فتح علی گردیزی (ریختہ گویاں)

"میر کی طبع معنی آفرین استعداد کا شعلہ سراج الدین علی خاں آرزو کا بھڑکایا ہوا ہے۔ فقیر (گردیزی) نے میر کے اشعار کی سیر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میر نے معنی "بیگانہ" (اچھوتے مضامین) کی تلاش کی ہے اور "حرف آشنا" (دوست کی بات) بیان کیا ہے"

فتح علی گردیزی نے میر کا صرف ایک ہی شعر نقل کیا ہے۔

بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن گنو اب تو
کبھو کچھ، ہم بھی کریں گے حساب دوستاں در دل[2]

۱۔ ص ۔ ۱٦۳

۲۔ ص ۔ ۱۳۷

محمد قیام الدین قایم (تذکرہ مخزن نکات):-

"میر کا اصلی وطن اکبر آباد ہے۔ چند دنوں خان آرزو کی خدمت میں جو میر کے خالو (ماموں) تھے استفادہ کیا۔ ابتداء میں ظہیر الدولہ بہادر کی خدمت میں رہے لیکن جب ان سے ان بن ہوگئی تو راجہ ناگرمل کے رفیق بن گئے اور اب تک عزت و امتیاز کے ساتھ ان ہی کی رفاقت میں ہیں"[۱]

عنایت اللہ فتوت (تذکرہ ریاض حسینی، قلمی):-

فتوت نے فتح علی گردیزی کی طرح میر کی معنی آفرین طبیعت کو سراج الدین علیخاں آرزو کے تجلی کدہ کا اثر قرار دیا ہے اور گردیزی کی طرح صرف ایک شعر "حساب دوستاں در دل" نقل کیا ہے"[۲]

قیام الدین حیرت اکبر آبادی (تذکرہ "مقالات الشعرا"):-

"میر محمد تقی میر خاں آرزو کے ہمشیرزادے ہیں۔ ہر ہفتہ ان کے مکان پر ریختہ گو شعرا کا اجتماع اور مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ میر کے اکثر اشعار ریختہ میں ہیں لیکن آخری عمر میں انھوں نے فارسی میں بھی مہارت پیدا کی اور چند شعر خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر رائے صاحب خداوند (لچھمی نارائن شفیق) کو دیئے تاکہ وہ تذکرے میں شامل کریں"[۳]

۱۔ ص۔ ۴۰

۲۔ ص۔ ۱۸۹

۳۔ ص۔ ۹۱

لچھمی نارائن شفیقؔ اورنگ آبادی (تذکرہ چمنستان شعرا):۔

"نازک خیالی میں سرتاج شعرائے عصر اور گل سرسبد حرف گیراں (نقّاداں) ہے ان کا تذکرہ نکات الشعرا جس کا گواہ ہے۔"[۱]

قدرت اللہ شوقؔ (طبقات الشعرا):۔

شاعر پرمغز و ہمہ دان ۔ اکثر سخن طرازوں نے زبان کے محاورات ان سے اخذ کئے ہیں ۔ ہر چند سادہ گو ہے لیکن سادہ گوئی میں تہہ داری و پرُکاری ظاہر و نمودار ہے۔"[۲]

میر حسنؔ (تذکرہ شعرائے اردو)

"سراج الدین علیخاں آرزو کے برادر زادہ ہیں اور ان کے شاگرد ہیں ان کی طرز شفائی کی طرز سے مشابہ ہے ۔ رباعی، قصیدہ، ہجو اور غزل ہر صنف میں کہتے ہیں ۔ لیکن غزل کی وجہ سے ان کی گرم بازاری ہے ۔ بہت صاحبِ دماغ ہیں لیکن یہ دماغ اور غرور ان کو زیب دیتا ہے۔"[۳]

سیّد غلام حسین شورشؔ عظیم آبادی (تذکرۂ شورش):۔

"میر خود کو فخرِ شاعرانِ دہلی سمجھتے ہیں اپنے مرتبّہ تذکرے میں شعرائے ہند کے غلط

---

۱ - ص - ۲۶!

۲ - ص - ۲۶

۳ - ص ص و ۱۵۱ و ۱۵۲

اشعار تلاش کر کے جمع کئے ہیں۔ کوئی شعر غلط نہ ملنے کی صورت میں بھی بے جا اعتراض کر کے اصلاح کی ہے۔ زندہ مردہ کسی کو بھی بغیر اعتراض کئے نہ چھوڑا لیکن بعض اعزّہ کو جن سے ربط تھا محفوظ رکھا۔ غرض عجیب شخص ہے۔ اپنے تذکرہ میں خود کو سیّد لکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شیخ ہیں۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے۔

مصرعہ :- شیخ تقی نام ہو اور میر کہا دے

مصرعہ :- دلّی میں اک شیخ زادہ گنجے میر ہے

فتح علی گردیزی نے بھی اپنے تذکرے میں تقی میر کو سیّد نہیں لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ استحکام سیادت کا ذبہ کے لئے میر تخلص اختیار کیا ہے۔

شورش نے میر کے اشعار پر کئی اعتراضات بھی کئے ہیں[1]۔

ابوالحسن امیرالدین احمد (مسرّت افزا) :-

"محمد تقی میر تخلّص۔ اکبرآباد میں پیدا ہوئے لیکن ان کی قدر و قیمت دہلی کے بازار میں بڑھی۔ مشقِ سخن سراج الدین علی خاں آرزو کی خدمت میں کی۔ شاید ان سے خواہرزادگی کا تعلق ہے (بھانجے ہیں) رعونت اور غرور کی وجہ سے جو ان کی فطرت ہے شاعروں سے اعتراضات کا نشانہ بنے اور سخنوروں کی نکتہ چینی کی وجہ سے ان کی زبانوں سے وہ خود نہ بچ سکے۔ لوگوں کے عیب فاش کرنا سب سے بڑا عیب ہے دوسروں کے عیب ڈھونڈنے والا پہلے اپنے عیب کھولتا ہے۔ ہر ایک کو ان کے عیب بیان کرنے کا حوصلہ ہوا۔ مرزا رفیع کہتے ہیں:-

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح

لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے

---

[1] ا۔ ص - ۱۸۹

تذکرہ نکات الشعرا ان کی تالیف ہے اس میں عجیب طرح شعرائے ریختہ کے کلام پر نکتہ چینی کی ہے جس کو یاد کیا ہے حقارت اور لاپروائی کے ساتھ کیا ہے اور ان کے بے رتبہ اور ناپسندیدہ اشعار چن چن کر لکھے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس تذکرہ "مسرت افزا" کی تالیف کا سبب یہی تھا کہ میں نے حاسدوں اور نکتہ چینیوں کے برخلاف ہر ایک کے صحیح حالات لکھے ہیں لیکن چوں کہ اس مسافرت میں کسی کا دیوان میرے پاس نہیں تھا جس سے اس کا کلام انتخاب کیا جاتا۔ ان کے جو شعر مجھے یاد تھے وہ میں نے لکھے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ میر نے چونکہ دوسرے شاعروں کے ناپسندیدہ اشعار منتخب کرنے پر توجہ صرف کی تھی اس لئے ان کی طبیعت اس طرف راغب رہی۔ یہی سبب ہے کہ اپنے جو اشعار انھوں نے تذکرہ میں لکھے ہیں ان میں اکثر بے رتبہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ ان کے دیوان میں اس سے بہتر شعر میری نظر سے گزرے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ محمد تقی میر سیّد نہیں ہے۔ میر درد کے والد ناصر مرحوم ان کی جودتِ طبع دیکھ کر ان کے آغازِ جوانی میں کہتے تھے کہ "محمد تقی میر میدان سخنوری خواہد شد" اس دن سے اپنے آپ کو میر کہنا شروع کر دیا[۱]"

مردان علی مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشنِ سخن):۔

"وہ صنف غزل میں کسی کی مجال نہیں کہ وہ میر کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ مبتلا نے میر کے اشعار کی تعداد تخمینہ چار یا پانچ ہزار بتایا ہے[۲]۔

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم):۔

"میر تخلّص نام میر محمد تقی، وطن اکبر آباد۔ ہمیشہ دار الخلافہ دہلی میں رہے۔ سراج الدین علیخاں

۱۔ (مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی) دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۷ تا ۲۱۹۔

۲۔ ص۔ ۱۰۳

آرزو سے دُور کی عزیزداری رکھتے تھے۔ سراج الدین علی خاں کے فیض نظر کے تربیت یافتہ ہیں۔ یوں تو انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس بات پر سب سخن سنجوں کا اتفاق ہے کہ ان کی غزلوں کا آہنگ بہت زیادہ سامعہ نواز ہے۔ اس وقت جب کہ ۱۱۹۶ ہجری میں یہ تذکرہ لکھا جا رہا ہے معلوم ہوا کہ میر شاہ جہاں آباد میں زندہ اور سلامت ہیں اور انھوں نے ریختہ گو شعرا کے بیان میں ایک تذکرہ تالیف کیا ہے۔"[۱]

غلام ہمدانی مصحفی (عقدِ ثریا) :-

"زمانہ ان کے قدر دانوں سے خالی ہو گیا۔ لیکن انھوں نے عیال داری کے باوجود توکل اختیار کیا اور کسی نو کیسہ (نو دولتی) کی جانب رخ نہیں کیا۔ ابنائے زمانہ میں کسی کو اپنا صحیح مخاطب قرار نہیں دیا۔ ہر ایک سے بات چیت کرنا موقوف کیا اس وجہ سے ان کے اعزہ اور دوست ان کو "کج خلق" "بر خود غلط" اور "انصاف دشمن" سمجھنے لگے۔ میر کے ریختہ سے متاثر ہو کر اکثر فارسی گو شعرا نے فارسی غزل گوئی ترک کر کے ریختہ کو اختیار کیا۔

میر کی فارسی شاعری کے بارے میں مصحفی نے خود میر کا قول نقل کیا ہے :-

"میر کہتے ہیں کہ دو سال تک ریختہ میں شعر کہنا ترک کیا تھا ان ہی دنوں میں تقریباً دو ہزار فارسی شعر کہہ گئے۔"[۲]

غلام ہمدانی مصحفی (تذکرۂ ہندی) :-

"چند سال ہوئے کہ شاہجہاں آباد سے پُورب آ کر آصف الدولہ کی سرکار میں اعتبار

۱۔ قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ ص ۲۰۰ (ل)
۲۔ ص ص ۵۳ و ۵۴۔

وامتیاز حاصل کیا ہے۔ ریختہ کے چار دیوان اب تک مرتب کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مثنویاں اور ان کا "شکار نامہ" اپنی بے نظیر طرز ادا کی وجہ سے یادگار ہے۔ فقیرِ مصحفی، پر بہت مہربانی کرتے ہیں۔ عمر ۸۰ سال کے قریب ہے[۱]۔"

محمد وجیہہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی):۔

"میر آخر عمر میں نواب آصف الدولہ بہادر کی استدعا پر شاہجہاں آباد سے لکھنؤ آکر اعزاز و اکرام کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں[۲]۔"

مرزا علی لطف (گلشن ہند):۔

"میر تخلص، نام نامی اور سُخن آفرین کا میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو کے کچھ رشتہ داروں میں دُور کے تھے۔ ابتدائے سنِ شعور پر ورش انھوں نے دار الخلافہ شاہجہاں میں پائی ہے اور خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائے تازگی مضموں اور علوِ معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال میں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا غرض اس تردد سے زبانِ قلم کی اور اس خراش سے عارض رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدر دانی سے اغنیا کی اور نا سمجھی سے اہل دنیا

۱۔ ص۔ ۲۰۴

۲۔ ص۔ ۱۹۱

کی، اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوا شہرستانِ معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سرکاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا وہ نانِ شبینہ کو محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنو کو گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے مجہول کے مجہول ہوئے اور جوانانِ نومشق مرّبی گری سے قوّتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبعوں سے تو کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہل لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حمّالی ہے کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں کہ آج بھی اس بوڑھے کے سامنے نوجوان غورہ[1] کے میویز ہیں۔ اب بھی جو بوجھ نکتنت معنی کا جرِ ثقیل طبع سے تراز و کرکے وہ دکھلاتا ہے، جوان اگر وہ بوقیں ہے تو تحّل سے اس کے کمر چراتا ہے بہرِ تقدیر غرض جب مرزا محمد رفیع سودا ملدہ لکھنو میں اس دار فانی سے عالم باقی کو سدھارے تو میر مذکور شاہجہاں آباد میں تھے، ۱۱۹۷ گیارہ سوستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحبِ لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنو میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علیخاں ناظر کے سپرد کیا اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ بارہ سوپندرہ ہجری ہیں وہی حال ہے جو اوپر مذکور رہا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشیں بارگاہ سخن دانی ہر قسم چکیدہ خامہ معجز نما رکھتا ہے

۱۔ مطبوعہ تذکرے میں "غور" لکھا ہے۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم و غزل میں ید بیضا رکھتا ہے قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سودا پر ہوا۔ ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے خصوصاً دریائے عشق، جو ان کی مثنوی ہے، اک جہاں کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قوم سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحب چار دیوان، خوش بندش و خوش بیان ہے۔ مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبت جریدہ روزگار ہیں۔[۱]

مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ "گلشن ہند" میں دوسرے تذکرہ نگاروں کے برخلاف میر اور گلزارِ ابراہیم کی متابعت میں میر کو خاں آرزو کا ہمشیر زادہ نہیں بلکہ دور کا رشتہ دار بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ نظم میں ریختہ کی باریکیوں کو میر نے خان آرزو سے سیکھا ہے دوسرے تذکرہ نگاروں نے میر کے اعزاز و اکرام کا ذکر ہے لیکن مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ میر سا شاعر زمانہ کی ناقدر دانی کی وجہ سے نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔

سب سے پہلے مرزا علی لطف نے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو میر کے انٹرویو کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ منتخب نہ ہو سکے اور نو مشق جوانوں کو منتخب کر لیا گیا۔ یہ لکھتے ہوئے مرزا علی لطف جوانوں کے مقابلے میں بوڑھوں کو ترجیح دیتے ہوں اور لکھتے ہیں کہ جوان "غورہ" (کچے اور کھٹے انگور) ہیں اور میران جوانوں کے مقابلے "مویز" (پکے اور خشک انگور) ہیں۔

لطف نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں سودا کے انتقال کے بعد سنہ ۱۱۹۷ ہجری میں میر شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر لکھنو آئے۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں خلعتِ فاخرہ اور تین سو روپیہ تنخواہ مقرر کی۔ اگرچہ میر کی گرفتہ مزاجی سے نواب سے اَن بَن رہی لیکن نواب نے کبھی تنخواہ دینے میں تامّل نہ کیا۔ نواب سعادت علیخاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک ۱۲۱۵ھ میں میر کا وہی حال ہے۔" کسی تذکرہ نگار نے میر کی مثنوی دریائے عشق" کا ذکر

۱۔ ص ص ۱۵۲-۱۵۳

نہیں کیا ہے لیکن لطف نے خصوصیت کے ساتھ "دریائے عشق" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مثنوی خاص و عام میں مرغوب ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تصانیف کی تفصیل بھی دی ہے۔ لطف نے میر کے (۵۳۷)[1] بہترین اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔

---

(۵) خواجہ میر درد

میر تقی میر (نکات الشعرا):-

"میاں صاحب میاں خواجہ میر سلمہ اللہ تعالیٰ، درد تخلص ہے، جوان صالح، مسلک درد مندی سے بہرہ وافی رکھتے ہیں فقیر (میر) کو ان کی خدمت میں بندگی خاص حاصل ہے۔ حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند ہیں۔ حضرت خواجہ ناصر نے فقیر (میر) کو "تو میر مجلس خواہی شد" کہا ہے۔ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو درد کے گھر مشاعرہ منعقد ہوا کرتا ہے۔"[2]

سیّد فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں):-

"معنی یابی میں فرد۔ زمانہ کے مختار شعرا میں شامل سخن گوئی میں ان کی طبیعت رسا اور فکر دل پسند ہے۔"[3]

محمد قیام الدین قائم (تذکرہ مخزن النکات):-

"اُن کا گنجینۂ اسرار الٰہی سینہ خزینہ انوار لامتناہی ہے۔ علم تصرف میں انھوں نے

---

[1] مطبوعہ نسخے میں ڈاکٹر عبدالحق نے صرف (۱۱۲) اشعار ہی دئے ہیں۔
[2] ص ص ۵۲ و ۵۳۔ [3] ص ۵۳۔

"واردات" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ سحابی اور خیام کی طرح انھوں نے رباعیات لکھے ہیں

درد کے مرتبے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ درد کے والد خواجہ محمد ناصر جو مشائخ کبار سے ہیں درد کی فرزندی اور مریدی پر فخر کرتے ہیں۔ دیوان میں قریب قریب سات سو شعر ہیں لیکن سب کے سب منتخب اور لبِ لباب ہیں"[۱]

عنایت اللہ فتوت (تذکرہ ریاض حسینی) (قلمی):۔

فتوت نے کوئی خاص بات نہیں لکھی۔[۲]

قیام الدین حیرت اکبرآبادی (مقالات الشعرا):۔

صرف دو سطر میں درد کا حال لکھا ہے اور ان کی دو فارسی رباعیاں بطور نمونہ نقل کی ہیں۔[۳]

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی (تذکرہ چمنستان شعرا):۔

خواجہ میر درد کے حالات سراج الدین علی خاں آرزو کے تذکرہ مجمع النفائیس اور شاہ عبدالحکیم حاکم کے تذکرے "مردم دیدہ" سے نقل کئے ہیں۔ خواجہ میر درد کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ آرزو نے خواجہ میر درد کے والد کو "عرفان مآب" اور "شمس فلک ہدایت" جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ شاہ عبدالحکیم حاکم تذکرہ "مردم دیدہ" میں انتہائی ارادت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "خواجہ میر درد جیسے لوگوں سے ملاقات عبادت

۱۔ ص ص ۔ ۳۸، ۳۶

۲۔ ص ۔ ۹۹

۳۔ ص ۔ ۵۰

میں شامل ہے۔"[۱]

قدرت اللہ شوقؔ (طبقات الشعرا) :-

"شعر و شاعری جیسی پست چیز ان کے مرتبے کے شایاں نہیں چونکہ ریختہ کی گرمئ بازار ہے اس لئے کبھی کبھی اس فن بے حاصل کی طرف توجہ کرتے ہیں۔"[۲]

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) :-

"درد کا دیوان اگرچہ کہ مختصر ہے لیکن خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کی طرح سب کا سب منتخب ہے۔"[۳]

غلام حسین شورشؔ (تذکرہ شورش) :-

"بزرگ، بزرگ زادے۔ صوفیہ کے مذاق کے شعر کہتے ہیں۔"[۴]

ابوالحسن امیر الدین احمد (مسرّت افزا) :-

"ان کے بزرگ قدیم سے شاہجہاں آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد حضرت میر ناصر خاص و عام کے مقتدا اور مرجعِ عام تھے۔ وہ بھی علم ظاہری اور باطنی میں اور اچھے

۱۔ ص ص ۷۵ و ۷۶

۲۔ ص ص۔ ۱۷۱ و ۱۷۲

۳۔ ص ۱۔ ۶۶

۴۔ ص۔ ۲۵۱

اخلاق و اوصاف میں اپنے والد کے قدم بہ قدم ہیں اور فارسی شعر بھی کہتے ہیں لیکن ان کی زیادہ تر توجہ ریختہ کی طرف ہے ان کا دیوان ہندی سب لوگوں میں مشہور ہے[۱]۔"

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشنِ سخن) :-

"درد کے دیوان میں اگرچہ ایک ہزار اشعار سے زیادہ نہیں لیکن سب کے سب یک دست ہیں اور انتخاب کی ضرورت نہیں[۲]۔"

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم) :-

"درد تخلص، خواجہ میر نام، خواجہ ناصر دہلوی کے فرزند ہیں۔ مشہور ہے کہ جب شاہ جہاں آباد دہلی پر متواتر آفات و حادثات کا نزول ہوا تو چھوٹے بڑے امیر غریب سب دہلی سے نکل کھڑے ہوئے مگر درد دہلی ہی میں مقیم کنجِ عزلت رہے۔ اگرچہ کہ ان کا دیوان مختصر ہے لیکن کلام میں اثر زیادہ ہے اکثر فارسی رباعیات میں مسائل تصوف بہت ہی لطافت کے ساتھ لکھے ہیں مشکل مقامات کی شرح خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہے اس تذکرہ کی تدوین تک یعنی ۱۱۹۶ ہجری تک شاہ جہاں آباد میں گوشہ گیری میں خوش ہیں[۳]۔"

غلام ہمدانی مصحفی (عقدِ ثریا) :-

"خواجہ میر درد ایام جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔ بعد ازاں سپاہ گری کو چھوڑ کر راہ فقر و سلوک اختیار کی اور گوشہ نشیں ہو گئے۔ درد کے تصنیفات کی تفصیل یہ ہے :-

---

۱۔ (مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی) (دلی ۱۹۶۸ء) ص ۱۰۰

۲۔ ص ۸۰-۱۱

۳۔ قلمی، مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ ص۔ ۶۳ (ب)

علم الکتاب، واردات، نالۂ درد، درجواب نالۂ عندلیب (والد بزرگوار خواجہ میر درد) دیوان فارسی و رباعیات[۱]۔"

غلام ہمدانی مصحفیؔ (تذکرہ ہندی):۔

"دردؔ کو فنِ موسیقی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ اگرچہ کہ سلسلہ نقش بندیہ سے تعلق رکھتے تھے اور "حرمتِ غنا" کے قائل تھے اس کے باوجود ہر ماہ ہلالی کی دوسری تاریخ کو اپنے پدر بزرگوار کی مزار پر "مجلس غنّا" منعقد کرتے تھے جس میں خرد و کلاں شہر شریک ہوا کرتے اور چابک دست نغمہ پردازی کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ حضرت ظلِّ سبحانی خواجہ میر درد سے ملنے کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوئے اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اپنے پاؤں کو کسی قدر آگے کی جانب دراز کیا۔ یہ دیکھ کر میر دردؔ منغّض ہو گئے اور اس عمل کو اپنی مجلس کے خلافِ معمول سمجھ کر خود بھی بادشاہ کی جانب پاؤں دراز کر دیا[۲]۔"

محمد وجیہ الدین عشقیؔ (تذکرہ عشقی):۔

خواجہ میر درد کے تعلق سے کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے[۳]۔

مرزا علی لطف (گلشن ہند):۔

"دردؔ تخلص، خواجہ میر نام متوطن شاہجہاں آباد کے۔ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصرؔ دہلوی کے تھے۔ ثابت قدمی میں اس قطب آسمان استقلال کی اور زاویہ گزینی میں اس مرکز دائرۂ فضل و کمال کی نقل مشہور ہے اور زبان زد جمہور ہے کہ جس ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے

۱- ص-۲۷- ۲- ص ۹۲ و ۹۳- ۳- ص-۲۵۲

رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع سکوں کا تنگ اور اس خراب آباد تشبیہہ سے ہفت اقلیم کی تنگ تھا جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرّر ورودِ بلیات کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشیں نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزیں نے اور ہر تونگر مالدار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے ادھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سر کنے کا نہ کیا۔ تحمل پاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہونے اور شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنی کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اس کوہِ تحمّل کو دیکھتا تو چاشنی فقر کا اس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیّر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا تو زین پوش خدمت کا اس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفات طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے ہے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلان خام کے ہے۔

اس شہسوار معرکہ سخنوری کے توسنِ تُند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی اور اس یکہ تاز عرصہ مضمون تراشی کے ست رنگ آسمان سیر خامہ سے بیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی۔ تعجب نہیں ہے اگر اس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحۂ کاغذ کا ہمرنگ برنگ گُل ہو اور نغمۂ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیر بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسائل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے اور شرح بھی اس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے طریقہ فخریہ بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے اور راہِ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنمائے کامل تھے۔

۱۲۰۲ بارہ سو دو ہجری میں اس بلبل گلشن آزاد نے دام ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمن عدم کے آباد کیا ہے[1]۔

مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ "گلشن ہند" میں خواجہ میر درد کے تعلق سے یہ واقعہ نمایاں کر کے لکھا ہے کہ جس وقت دلّی اجڑ گئی اور بہت سے مشاہیر شرفا و اہل کمال دہلی چھوڑ کر ادھر ادھر ہجرت کر گئے اس وقت خواجہ میر درد نے دلّی سے منہ نہ موڑا اور اپنے گوشۂ فقر کو نہ چھوڑا۔ یہ واقعہ ان کی ثابت قدمی، توکل اور خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے۔

لطف نے لکھا ہے اگرچہ کہ درد کا دیوان بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں۔ رباعیات میں مسائل تصوّف بیان کئے ہیں اور مشکل مقامات کی شرح بھی لکھی ہے۔ جب یہ تذکرہ لکھا گیا درد کا انتقال ہو چکا تھا۔ درد کے سال وفات ۱۲۰۲ھ کی اطلاع لطف کے تذکرے ہی میں لکھی ہے۔ لطف نے تذکرے میں (۵۶۴) اشعار درد کے دئے ہیں۔ مطبوعہ نسخے میں صرف (۱۹) اشعار شامل ہیں۔

۱۔ ص ص۔ ۹۸ و ۹۹ (مطبوعہ)، قلمی مخزونہ جرمنی ص ۳ب و ۴ب۔

(۶) مرزا محمد رفیع سوداؔ

میر تقی میرؔ (نکات الشعرا) :-

"مرزا رفیع سودا مولد شاہجہاں آباد نوکر پیشہ ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس، رباعی سب خوب کہتے ہیں۔ یہ ریختہ کے شاعر ہیں ان کو ملک الشعرائے ریختہ کہنا درست ہے۔ "تضحیک روزگار" کے عنوان سے ہجو میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں کئی صنعتیں لائی گئی ہیں"[۱]

خواجہ خان حمید اورنگ آبادی (تذکرہ گلشن گفتار) :-

"مرزا محمد رفیع سودا، منصب دار متوطن شاہجہاں آباد۔ مرد سودا مزاج اور کم سخن"[۲]

سیّد فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) :-

"مرزا محمد رفیع سودا۔ مرد سپاہی پیشہ اور درشت اندیشہ۔ ان کے شعر کا رتبہ بلند اور سخن دردمندانہ ہے"[۳]

۱۔ ص ۔ ۳۲
۲۔ ص ۔ ۴۷
۳۔ ص ۔ ۶۷

محمد قیام الدین قائم (مخزنِ نکات):-

"قصائد "کوہ دوپیکر" ' بہار ' بحرِ بیکراں اور تضحیک روزگار وغیرہ ان کے تصانیف سے ہیں۔ سودا کے والد کا نام مرزا شفیع ہے جو مغل زاد اور تجارت میں مشہور تھے۔ والد کے انتقال کے بعد سودا کو جو مال و زر ترکے میں ملا انھوں نے اپنی شاعر مزاجی کی وجہ سے قلیل مدت میں دونوں ہاتھوں سے لٹا دیا۔ اس وقت ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہیں جو شعرا کا سب سے بڑا اعزاز ہے"[۱]

عنایت اللہ فتوت (ریاضِ حسینی):-

فتوت نے سودا کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں لکھی[۲]۔

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی (چمنستانِ شعرا):-

"سودا کا کلیات، قصائد، مثنوی، مخمس، ترجیع بند، قطعہ و رباعی اور مرثیے پر مشتمل ہے جس میں دو ہزار بیت نظر سے گزرے۔ (۶۰) اشعار کا ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں کہا ہے جس کی تمہید میں بعض شعرائے دہلی کی ہجو کی ہے۔ حکیم غوث کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی ہے جو (۸۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ (۹۰) بیت کا ایک واسوخت لکھا ہے جس کی عوام میں بڑی شہرت ہے۔ خواجہ حافظ ابوطالب کلیم، میر تقی میر اور عبدالحی تاباں کی غزلوں کی تخمیس کی ہے۔ شیخ علی حزیں کی ہجو میں ایک مخمس لکھا ہے"[۳]

۱۔ ص۔ ۳۵

۲۔ ص۔ ۱۲۲

۳۔ ص ص ۳۲۷، ۳۲۸

قدرت اللہ شوق (طبقات الشعرا):۔

"قصائد، مثنویات اور مخمسات، سودا نے بہت زیادہ لکھے ہیں اور ریختہ کو سرحد اعجاز پر پہنچا دیا ہے۔"

قدرت اللہ شوق نے سودا پر چند اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

عاشق تو نامراد ہے پر کس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ گئے صبر کر کے ہم

پہلے مصرعے کی ردیف میں (کہ) کاف بیانیہ ہے اور دوسرے مصرعے کی ردیف میں کاف اضافت جو غلط ہے۔[1]"

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو):۔

"سودا کی عمر اس وقت (۷۰) سال کی ہے۔ نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں بہ وسیلہ فن شاعری سرفراز ہیں علم موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔ ان کے تصانیف بہت زیادہ ہیں۔[2]"

اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی (گلِ عجائب):۔

تمنا نے مقفیٰ عبارت میں سودا کی تعریف کی ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے[3]

---

[1] ۔ ص ص ۱۱۹ تا ۱۷۱

[2] ۔ ص ۔ ۸۲

[3] ۔ ص ۵۷

غلام حسین شورش (تذکرہ شورش):۔

"سودا کے کلیات میں تقریباً (۵) ہزار شعر میری نظر سے گزرے ہیں۔[1]

ابوالحسن امیرالدین احمد (مسرت افزا):۔

"مرزا رفیع، سودا تخلص ان کا وطن دہلی ہے زبان آوران کامل انھیں استاد مانتے ہیں اور اپنے قاعدے کے مطابق شعرائے ہند نے انھیں ملک الشعرا قرار دیا ہے۔ قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس اور رباعی میں ید بیضا رکھتے ہیں۔ ان کے دیوان کو اتنی مقبولیت ملی کہ مشرق سے مغرب تک پہنچا ہے اور صاحبان انگریز سخن شناسانہ ہونے کے باوجود بڑے شوق سے ان کا دیوان لکھوا کر ولایت بھیجتے ہیں۔ آج کل لکھنؤ میں وزیرالملک نواب آصف الدولہ بہادر عزیز جنگ کی رفاقت میں رہتے ہیں۔ سنہ ۱۱۹۲ میں جب مؤلف سیر کرنے اور تحصیل علم کے لئے لکھنؤ پہنچا جیسا سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔[2]"

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشن سخن):۔

"آغاز شباب سے (۶۰) سال تک دہلی میں وزیروں اور امیروں کے ساتھ عزت وحرمت سے بسر کی۔ دلّی کی ویرانی کے بعد چند دن فرخ آباد میں نواب احمد خاں کے پاس رہے۔ احمد خاں کی وفات کے بعد لکھنؤ آئے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے شفقت اور مروت

۱۔ ص۔ ۳۷۹

۲۔ (مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی، دلّی ۱۹۶۸ء) ص۔ ۱۱۹ و ۱۲۰

کے ساتھ مرزا کا استقبال کیا۔ اس وقت یعنی ۱۲۹۴ھ ہجری تک لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ ان کے کلیات میں چھ سات ہزار اشعار ہیں[۱]۔

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم):-

"سودا تخلص، مرزا محمد رفیع نام مولد اور وطن شاہجہاں آباد دہلی ہے۔ اسی شہر میں پیدائش سے لیکر ساٹھ سال کی عمر تک سکونت پذیر رہے اور اپنی موزونیت طبع کی وجہ سے شاہ اور وزیر اور امرا کے مصاحب رہے۔ جملہ اصناف سخن خصوصاً قصیدے میں تلاش معانی کی داد دی ہے۔ شاہ جہاں آباد کی ویرانی کے بعد وہاں سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں مقیم ہوئے اور تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا[۲]۔"

غلام ہمدانی مصحفی (عقد ثریا):-

"شوق شعر ہندی کی ابتدا میں سلیمان قلی خاں کے شاگرد تھے اور شاہ حاتم سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ حاتم نے اپنی کلیات کے دوسرے صفحہ پر جن شاگردوں کے نام لئے ہیں ان میں فخریہ طور پر سودا کا نام بھی درج کیا ہے۔ سودا اگرچہ مرد کم علم تھے لیکن ذکاوت و روانی طبع ان کے کلام سے پیدا ہے۔ ہمیشہ امرا کی صحبت میں رہے۔ بعض عربی قصاید کے جواب میں قصائد لکھے ہیں لیکن ہجو لکھنے میں اپنی شاعری کی قوت کا اظہار کیا۔ ان کی شہرت ہندوستان کے بازاروں میں اور ان کی غزلوں کا دیوان ہر طرف جہلا کی زبان پر ہے[۳]۔"

---

[۱] ص ۱۳۹ [۲] قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ص ۹۰ (ا) [۳] ص ۳۲ - ۳۳

غلام ہمدانی مصحفیؔ (تذکرۂ ہندی) :-

"مرزا رفیع سودا پسر مرزا محمد شفیع کابلی۔ بعض لوگ صریح اغلاط اور توارد کی وجہ سے ان کے بعض اشعار کو جہل اور سرقہ سے نسبت دیتے ہیں۔ ریختہ میں قصیدہ کے نقاشِ اوّل سودا ہیں۔ فقیر (مصحفی) نواب شجاع الدّولہ کے عہد میں ایک دن سودا سے ملنے کے لئے گیا۔ دیکھا کہ ان کو ریشمی بال والے کتوں کی پرورش کا بہت شوق ہے۔ علم موسیقی کی آگاہی کی وجہ سے اپنے کہے ہوئے سلام اور مرثیہ کو پُرسوز انداز میں پڑھنے پر قادر ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی رحلت ہوئی اور آغا باقر کے امام باڑے میں مدفون ہوئے"[1]

محمد وجیہہ الدین عشقیؔ (تذکرۂ عشقی) :-

"تمام اصنافِ سخن میں اور خاص طور پر مدح و قدح میں کہ عبارت قصیدہ گوئی سے استاد تھے۔ علم موسیقی اور ستار نوازی میں دست گاہ رکھتے تھے"[2]

سید حیدر بخش حیدری (گلشنِ ہند) (قلمی) :-

حیدری کے اس تذکرے میں کوئی خاص بات نہیں ہے[3]

مرزا علی لطف (گلشنِ ہند) :-

"سودا تخلص، نام نامی اور اسم گرامی اس شاہ باز عرش پرداز معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن دار الخلافہ شاہ جہاں آباد کے۔ بیشک مقام ان کی طبیعت فلک فرسا کا موافق ان کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دلّی میں کمال

---

[1] ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔ [2] ص ۳۸۔ [3] ص ۲۳۲۔

عزووقار کے رہے۔ اور طبع رسائی کی مربّی گری سے انیس وجلیس سلاطین نامدار اور وزرائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ ذات اس یگانۂ روزگار کی کثرت اشتہار کے باعث مستغنی ہے، تکلف سے خامہ مداح نگار کی لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصّفات کا لکھنا چاہیئے۔ اور تذکرے سے اس شاہ بیت کلیّات معانی کے بیان کو ان اوراق پریشاں کے زیب و زینت دیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرزائے مذکور سرحلقہ سخنوراں اور سرآمد معنیٰ گستراں تھے۔ آشنائے معنیِ بے گانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسام نظم سے دیوان اس مطلع دیوانِ سحر بیان کا بھرا اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرز قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کرکے اس طاق بلند پر رکھا کہ دست وہم نازک خیالانِ ہندوستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ گویا دیں اس آتش زباں کے ہجوم شرار سے جوش فطرت عرق انفعال ہے اور پانی کو خجالت سے اس طبع رواں کی خاک میں چھپنے کا خیال زبان ہندی شرف ہمزبانی سے اس کی سرفراز اور نظم ریختہ کو طبع معنی آفریں پر اس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہجہاں آباد کے نقل وحرکت کا اتفاق مرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدہ میں طور سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار روپئے سالیانہ کی جاگیر مقرر کردی۔ چنانچہ سات قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں اور کیا کیا تر و تازگی کے ساتھ مضامین عالی باندھے ہیں جب کہ سنِ شریف اس فقیر راہ سخن دانی کا ستّر برس کو پہنچا تو داعی اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزل عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اس رفیع قدر محفلِ نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے لیکن یہ تاریخ اس فرہاد بے ستون مضمون تراشی کے سنگ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے:۔

خلد کو جب حضرت سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماھر ہوا
بولے منصف دور کر یائے عناد
شاعرانِ ہند کا سرور گیا
۱۱۹۵ہجری

آغا باقر کا امام باڑا اس محب امام علیہ السلام کا مدفن ہے ۔ سایہ قدوم امام کے باعث بیشک رنگ مکافات کے واسطے مامن ہے ۔ یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں اور یہ اوراق پریشاں اس سے کہ زینت پاتے ہیں[۱] ۔

مرزا علی لطف نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ سودا کے حالات زندگی بیان کئے ہیں:

دہلی کی تباہی کے بعد سودا کا لکھنؤ آنا ۔ نواب آصف الدولہ کی سرپرستی ۔ چھ ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کرنے کی تفصیلات لطف ہی نے دی ہیں لطف کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے لکھنؤ آمد کے وقت سودا کی عمر ساٹھ سال اور لکھنؤ میں انتقال کے وقت سودا کی عمر ۷۰ سال تھی ۔

(۷) محمد قیام الدین قایم

میر تقی میر (نکات الشعرا) :۔

"محمد قایم ۔ قایم ۔ جوانِ حسن پرست نوکر پیشہ ۔ ایک مدت تک میاں خواجہ میر صاحب

۱۔ ص ۔ ۱۰۳ تا ۱۰۵ ۔ ص ۱۹۳ تا ص ۲۰۸

کے ساتھ رہے ۔ اب مرزا رفیع کے ساتھ فقیر (میر) سے بھی آشنائی ہے[۱]"۔

خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی (گلشن گفتار):۔

"قایم میر محمد قایم ۔ برہان پور کے باشندے اور بدیہہ گو تھے[۲]"۔

سیّد فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں):۔

تذکرہ ریختہ گویاں میں کوئی خاص بات نہیں لکھی گئی ہے[۳]۔

قیام الدین قایم (مخزن نکات):۔

قایم نے خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر مؤلف قیام الدین قایم اگرچہ باشندگانِ قصبہ چاند پور سے ہے ۔ لیکن آغاز جوانی سے اب تک بہ سلسلۂ ملازمت دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں مقیم ہے[۴]"۔

عنایت اللہ فتوت (ریاض حسینی) (قلمی):۔

قایم کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں لکھی گئی ہے[۵]۔

لچھمی نارا‌ین شفیق اورنگ آبادی (چمنستان شعرا):۔

"ذہن سلیم اور فکر مستقل رکھتے ہیں[۶]"۔

قدرت اللہ شوق (طبقات الشعرا):۔

---

(۱) ص ۱۳۰ (۲) ص ۵۳ (۳) ص ۱۲۲ (۴) ص ۷۷ (۵) ص ۱۸۶ (۶) ص ۵۰۱ ۔

"متوطن قصبہ چاند پور۔ اہلِ درد اور خلیق۔ اکثر سخن گو ان کے فیضِ صحبت سے مرتبۂ عالی پر پہنچے ہیں۔ چند دنوں سے نواب محمد یار خاں امیر کی رفاقت میں ہیں۔ نواب صاحبان سے مشقِ سخن کر کے قلیل مدت میں مرتبۂ عالی پر پہنچ چکے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں مثنوی "شدتِ سرما"، "ہجوِ طفلِ پتنگ باز"، "حجام"، "سامانِ ہولی" اور "مثنوی شاہ لدھا" منتخب مثنویاں ہیں[۱]۔"

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) :۔

"ابتدا میں خواجہ میر درد سے متوسّل رہے اور آخر میں مرزا محمد رفیع کے شاگرد ہوئے۔ چوں کہ ابتدائے جوانی سے شاہجہاں آباد آگئے اس لئے ان کا محاورہ بہت ہی درست ہو گیا۔ ان کی طرز طالب آملی سے ملتی ہے۔ انھوں نے کئی مثنویاں کہی ہیں۔ فقیر میر حسن نے کبھی قایم کو نہ دیکھا لیکن ان کی خوبیاں سنی ہیں سنبھل، مراد آباد میں ہیں[۲]۔"

غلام حسین شورش (تذکرہ شورش) :۔

"محمد قایم۔ قایم ساکن دہلی ہے شاگرد خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا۔ مردِ حسن پرست و نوکر پیشہ۔ ان کے اشعار ایک مدت سے عظیم آباد وغیرہ میں مشہور اور مروّج ہوئے ہیں[۳]۔"

ابوالحسن امیر الدین (مسرّت افزا) :۔

"محمد قایم۔ قایم تخلص۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے ہیں۔ ابتدا میں خواجہ میر درد صاحب سے مشقِ سخن کی اس کے بعد مرزا رفیع سلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوئے اور ان کے شاگرد ہوئے[۴]۔"

---

(۱)۔ ص ص ۱۸۲ تا ۲۰۶ (۲) ص ۱۲۸ (۳) ص ۱۹۸ (۴)۔ مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی، (دلّی ۱۹۶۸ء) ص ۱۹۲

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشنِ سخن) :-

"شیخ محمد قایم۔ چاند پور وطن۔ وطن سے نکل کر دہلی آگئے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کی۔ سخن سنجی میں ان سے استفادہ کیا اور بالآخر مرزا محمد رفیع کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے۔ انھوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں"[1]۔

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم) :-

"قایم تخلّص، نام شیخ محمد قایم، وطن چاند پور۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں خواجہ میر درد کی صحبت سے استفادہ کیا اور آخر میں مرزا رفیع کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں لیکن میری نظر سے کوئی مثنوی نہیں گذری۔ اس وقت سال ۱۱۹۴ھ ہجری ہیں اپنے وطن میں زندگی گزار رہے ہیں"[2]۔

غلام ہمدانی مصحفی (عقدِ ثریا) :-

"محمد قایم، قایم متوطن چاند پور۔ شاعر ریختہ گو، مرزا محمد رفیع کے شاگرد اور بہت شہرت رکھتے ہیں عمر (۶۰) سال سے زیادہ ہے۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہا کرتے ہیں"[3]۔

غلام ہمدانی مصحفی (تذکرہ ہندی) :-

"قیام الدین علی قایم۔ وطن اگرچہ کہ چاند پور ہے لیکن ملازمت کی وجہ سے اکثر شاہ جہاں آباد میں رہے اور اس زمانے میں توپ خانہ میں معمور ہے۔ فقیر (مصحفی) نے ان کو ابتدائی ایام میں نواب محمد یار خاں کی سرکار میں لباس درویشی میں بھی دیکھا۔ اس زمانے

---

(۱) ص ۱۴۴ (۲) قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ ص ۱۸۹ (ب) (۳) ص ۴۶

میں نواب موصوف کی سرکار میں قصیدہ پڑھنے اور مؤلف (مصحفی) کی ملازمت کا باعث بھی یہی بزرگ (قایم) ہوئے۔ فقیر (مصحفی) سے بہت ہی کم عرصے میں گھل مل گئے تھے۔ یہانتک کہ ہم دوپہر اور رات کا کھانا ایک ہی دستر خوان پر کھایا کرتے تھے۔ جب نواب محمد یار خاں کا عمل دخل اٹھ گیا اور ان کے بیٹے احمد یار خاں برسر اقتدار آئے تو قایم کی فراغت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ مجبوراً وہ اپنے قدیم دیہات، ملکیت اور یومیہ وغیرہ کے فیصلے کے لئے لکھنو آئے۔ اور راجہ ٹیکٹ رائے بہادر سے عامل کے نام وثیقہ اور پروانہ لے کر رام پور جارہے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔ ان کی وفات کی خبر شہر بہ شہر مشہور ہوئی[۱]"

محمد وجیہہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی)

"قایم۔ مشاہیر غزل سرایوں میں سے تھے۔ ان کی کئی مثنویات سلاست اور روانی کے اعتبار سے شہرت رکھتی ہیں[۲]"

مرزا علی لطف (گلشن ہند) :-

"قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام متوطن چاندپور، نظم ریختہ میں استاد مسلّم الثبوت تھے۔ ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف مضمون تراشی معنوی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انھوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو مرزا رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گوئی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال کے خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اس کی آئینے

(۱) ص ۱۷۹ (۲) ص ۱۴۵ -

کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اس کلام رنگین کے دل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اس نظم صفا پرور کی رشک افزا آبِ گوہر کی اور موجزنی اس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمہ کوثر کی افسوس ہے کہ ایسے شخص کا اس جہاں فانی سے اٹھ جانا اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید ۱۲۱۰ ہجری بارہ سو دس ہجری میں ادھر ہی نواح وطن میں اپنے اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی اور عجیب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم شیریں کلام سے نہیں رہی ہے۔ لیکن رغبت طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر اس کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے[1]۔

لطف قایم کو مسلم الثبوت استاد بتاتے ہیں ان کے طبع بلند، ذہن رسا، مضمون تراشی اور معنی بندی کی تعریف کرتے ہیں۔ لطف کے خیال میں میر اور سودا شاعری کے بعد قایم کا مقام متعیّن کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی نے قایم کے انتقال پانے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تاریخ وفات نہیں لکھی۔ لطف کے تذکرے ہی سے ان کی وفات کی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔

قایم نے تذکرۂ مخزن نکات میں اپنا نام قیام الدین لکھا ہے۔ لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا نام غلطی سے محمد قایم لکھا ہے۔ صاحب گلزارِ ابراہیم سے بھی سہو ہوا ہے اور ان کی تقلید لطف نے بھی کی ہے۔

(۸) میر حسن

میر تقی میر (نکات الشعرا):-

"حسن تخلص، جوان، صاحب اہلیت، نوکر پیشہ، اکثر غریب خانہ (میر کا مکان)

---

(۱)۔ ص ص ۱۳۳-۱۳۴۔

میں مجلس کے سلسلے میں آتے ہیں مردانہ وضع رکھتے ہیں مرزا محمد رفیع سے مشورۂ سخن کرتے ہیں"[1]

لچھمی نارائن شفیق (چمنستان شعرا) :۔

" میر محمد حسن، حسن تخلص۔ دہلی کے متوطن اور میر ضیاء کے شاگرد رشید آج کل لکھنو میں ان کی بہت شہرت ہے"[2]

قدرت اللہ، شوق (طبقات الشعرا) :۔

"میر حسن، حسن تخلص۔ دہلی کے متوطن اور میر ضیاء کے شاگرد رشید آجکل لکھنو میں ان کی بہت شہرت ہے"[3]

میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) :۔

حسن نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے :۔

"یہ فقیر (حسن) غلام حسین کا بیٹا، میر عزیز اللہ کا پوتا اور میر امامی ہروی کا پڑپوتا ہے۔ میر امامی نور اللہ مرقدہ ہفت قلم اور فاضل تبحر تھے۔ بہ سببِ فضیلت شاہ جہاں آباد میں آئے اور معاصرین میں ممتاز ہوئے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے شاعری سے میرا رشتہ اجدادی ہے نہ کہ "امروزی" نو عمری ہی سے میری طبیعت شعر وسخن کی جانب مائل تھی۔ ابتدا میں میں نے میر ضیاء سے اصلاح لی لیکن ان کی طرز کا سرانجام مجھ سے نہ ہو سکا۔ اس لئے دیگر اساتذہ مثلاً خواجہ میر درد، مرزا سودا، اور میر تقی کی پیروی کی۔ ابتدائے جوانی میں زمانے کے ہاتھوں پریشان ہو کر لکھنو اور فیض آباد پہنچا۔ نواب سالار جنگ بہادر کی قدردانی سے فکر آب و نان سے بے نیاز ہوا۔ ان کے فرزند مرزا نوازش علی خاں بہادر کی صحبت میں

(۱)۔ ص۔ ۱۲۵۔ (۲)۔ ص۔ ۱۲۷ (۳)۔ ص۔ ۳۲۹

زندگی گزر رہی ہے۔ اکثر نواب صاحب کی فرمائش پر مرثیہ امام علیہ السلام کہتا ہوں۔ نواب صاحب کی طبیعت بھی جملہ فنون میں بلند ہے خصوصاً علم موسیقی پر ان کا عبور حد بیان سے باہر ہے۔ مرثیے کے سوز (طرز) معین کرتے ہیں اور یہی اجرِ آخرت ہے۔ اس طرح سردار جنگ بھی اس فن میں ذہن رسا اور گوشِ شنوا رکھتے ہیں۔ فقیر (میر حسن) نے اب تک سات آٹھ ہزار اشعار کہے ہیں اور ایک مثنوی "رموز العارفین" لکھی ہے جو مقبول اور مشہور ہوئی ہے۔"[۱]

غلام حسین شورش (تذکرہ شورش) :۔

"میر غلام حسن، شورش تخلص شاگرد میاں ضیاء۔ آج کل لکھنؤ میں قیام ہے سودا سے اصلاح لیتے ہیں۔"[۲]

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (تذکرہ گلشنِ سخن) :۔

"میر غلام حسن۔ حسن دہلوی۔ ابنِ میر غلام حسین ضاحک۔ پرانے شہر دہلی میں رہتے تھے۔ ان کے مضامین سخن میں تازگی ہے۔"[۳]

علی ابراہیم خاں خلیل (گلزار ابراہیم) :۔

"حسن تخلص، نام میر غلام حسن ابنِ میر غلام حسین ضاحک۔ میر امامی ہروی کی اولاد سے تھے۔ قدیم شہر شاہ جہاں آباد میں مقیم ہیں۔ اس وقت کہ ۱۱۹۶ ہجری ہے اپنے اشعار لکھنؤ سے ناقل کے نام بنارس روانہ کئے ہیں اور لکھے ہیں کہ ان کے جملہ اشعار کی تعداد اس وقت آٹھ ہزار لسبت ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے (میر حسن) ریختہ گو شعرا کا تذکرہ لکھا ہے

۱۔ ص ص ۵۲ و ۵۳ (۲) ص ۲۱۳ (۳) ص ۱۱۵

میر ضیاء سے اصلاح سخن لیتا ہوں۔ مدت ہوئی کہ دہلی سے لکھنؤ آکر نواب سالار جنگ اور ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ کا مصاحب ہوں۔[۱]

غلام ہمدانی مصحفی (تذکرہ ہندی) :-

میر غلام حسن، حسن تخلص۔ ولد میر غلام حسین ضاحک بزرگوں کا وطن ہرات ہے۔ خود شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں پورب آگئے بقیہ عمر نواب سالار جنگ اور ان کے فرزند سردار جنگ کی رفاقت میں فیض آباد اور لکھنؤ میں گزاری۔ اوائل عمر ہی سے طبیعت موزوں تھی۔ ابتدا میں میر ضیاء الدین ضیاؔء سے اصلاح لی اس کے بعد مسلم الثبوت اساتذہ خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے جادۂ مستقیم پر چلنے لگے۔ ایک ضخیم دیوان اور کئی مثنویاں لکھیں خصوصاً آخری مثنوی سحر البیان نے معجزہ ید بیضا دکھایا ہے۔ سچ پوچھا جائے تو یہ ان کی شاہکار مثنوی ہے اور مقبول عام ہے۔ میر حسن جب تک زندہ تھے فقیر (مصحفی) سے ربط ضبط دوستانہ تھا عشرۂ ماہِ محرم میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر (۶۰) سال سے زیادہ تھی فقیر (مصحفی) نے قطعۂ تاریخ رحلت اس طرح کہا ہے :-

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں

مُرد ازیں گلزارِ رنگ و بو نیافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی

شاعرِ شیریں زباں تاریخ یافت[۲]

۱۲۰۱ ہجری

۱۔ قلمی مخزونہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ ص ۵۸ (ب)

۲۔ ص ۶۸

محمد وجیہہ الدین عشقی (تذکرہ عشقی) :۔

"غلام محمد حسن، حسن ابن میر غلام حسین ضاحک ابن میر عزیز اللہ میر امامی ہروی۔ اخلاق حسینی سے متصف تھے۔ قواعد علم و عروض و قوافی اور صنائع میں دخل رکھتے تھے۔ آج کل ان کی عشقیہ مثنوی عیاش مزاج نوجوانوں کی محفل میں بہت مقبول ہے۔ ان کا انتقال ہو کر تقریباً چار سال ہو چکے ہیں"[۱]

حیدر بخش حیدری (گلشن ہند) (قلمی) :۔

حیدری نے حسن کے متعلق کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے۔

مرزا علی لطف (گلشن ہند) :۔

"حسن تخلص، میر غلام حسن نام شاہجہاں آبادی، بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا۔ اولاد سے میر امامی ہروی کے دلّی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے۔ نواب سالار جنگ اور خلف ان کے مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انھوں نے ساتھ عزت اور عظمت کے بسر کی ہے اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے۔ اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انھیں اقرار ہیچمدانی ہے ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے۔ قریب آٹھ ہزار بیت کے انواعِ نظم میں دیوان ان کا ہے اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے۔ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں سیر روضۂ رضواں کی کی ہے۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس نکوکردار کے ہیں"[۲]

لطف نے حسن کے بیان میں گزشتہ تذکروں کا مواد یکجا کر دیا ہے۔ لطف کے

۱۔ ص ۲۱۴ (۲) ص ۹۲

تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صغر سِن ہی میں لکھنو چلے گئے تھے۔ مصحفی نے میر حسن کی وفات کی تاریخ ۱۲۰۱ ہجری نکالی ہے۔ لیکن لطف نے ان کی وفات کا سن ۱۲۰۵ لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔

پیش رو تذکروں سے گلشن ہند کا جو موازنہ گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے اس سے لطف کے تذکرے کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ لطف نے محض گلزار ابراہیم کا ترجمہ نہیں کر دیا بلکہ اپنی تحقیق اور ذاتی معلومات کی بناء پر مختلف شعرا کے حالات میں قابل لحاظ اضافے بھی کئے ہیں۔ اس موازنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ گلزارِ ابراہیم کے علاوہ شعرائے اردو کے دیگر تذکرے بھی لطف کی نظر سے گزر چکے تھے اور انھوں نے ان تذکروں سے بھی مواد کی فراہمی میں مدد لی ہے۔ اس طرح گلشنِ ہند کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ اردو شاعروں کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو اردو میں لکھا گیا ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ تذکرہ چند معمولی فروگزاشتوں کے قطع نظر مجموعی طور پر پیش رو تذکروں کے مقابلے میں زیادہ وقیع اور مستند ہے۔

اس تذکرے سے شعرا کے حالات کے علاوہ بعض تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس دور کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مثلاً شاہ عالم آفتاب کے بیان میں لطف نے عالمگیر ثانی کے قتل کا واقعہ، شہزادہ عالی گوہر کا "شاہ عالم" لقب کے ساتھ تخت نشیں ہونا اور شجاع الدولہ کو قلمدانِ وزارت تفویض کرنا، رام نرائن کی سرکوبی کے لئے اعظم آباد پر فوج کشی اور کئی دیگر واقعات کے ساتھ آخر میں غلام قادر روہیلہ کی نمک حرامی کا حال مفصّل قلمبند کیا ہے۔ اس طرح نواب آصف الدولہ کے بیان میں پایۂ تخت کی لکھنو کو منتقلی اور اس شہر کی تعمیر نو کا حال بھی ملتا ہے۔ لطف نے آصف الدولہ کے اوصاف اور سیرت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور جہاں ان کے

کارناموں کو سراہا ہے وہیں یہ تنقید بھی کی ہے کہ " افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا۔ آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا۔ مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا۔ اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"[۵]

اردو میں تنقید کے اولین اور ابتدائی نمونے تذکروں ہی میں ملتے ہیں۔ گلشنِ ہند میں نہ صرف شعرا کے حالات یکجا پیش کر دئے گئے ہیں بلکہ ان پر تنقیدی آرا کا اظہار کرتے ہوئے ان کے مرتبے کا تعیّن کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ لطف نے ہر شاعر کے بارے میں اپنی ذاتی رائے بے رو و رعایت بیان کر دی ہے۔ کہیں کہیں گلزار ابراہیم کی تنقید بھی نقل کر دی ہے لیکن اس تنقید سے وہ خود متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرے میں میر سوز کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے شخصی عناد ظاہر ہوتا ہے :۔

" جو شئے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے بلکہ جتنے خار و خس ہیں کتنے ہیں کام آتے ہیں اور بندگان خدا ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ سوز وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے سواء سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرت الٰہی کا اظہار کمال ہے کہ ایسی شئے خلق کی جاوے جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاوے پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اس کا قابل جلانے کے ہے"[۶]

لطف نے سوز کے بارے میں علی ابراہیم خاں کے اس ہجو یہ بیان کو نقل تو کیا ہے لیکن خود انھوں نے سوز کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علی ابراہیم خاں کے برعکس وہ سوز کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

" ..... سید عالی نسب اور فن سخن وری میں استاد، طرز ادا بندی کے

۵۔ گلشن ہند ص ۱۴۔ ۶۔ گلشن ہند ص ۱۱۴۔

بادشاہ اور صورت مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز...... ۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے لیکن اطوارِ سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اسی سال پھر لکھنو تشریف لے گئے۔[1]

تذکرے میں جا بجا ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف کے مزاج میں کسی قسم کا تعصب نہ تھا اور ایک اچھے نقّاد کے لئے یہ بات ازبس ضروری ہے لطف نے شعرا کے بارے میں جو رائیں ظاہر کی ہیں ان میں کہیں کہیں مبالغہ آمیزی ضرور جھلکتی ہے لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اس زمانے کی انشاپردازی کی طرز ہی ایسی تھی ہم لطف کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ عبارت کی رنگینی اور مبالغہ کی چاشنی سے گزر کر جب ہم لطف کے حقیقی خیالات تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو ان کی اعتدال پسندی اور بے تعصبی ہم پر آشکارا ہوتی ہے۔ ذیل کے چند اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ لطف کا ذوقِ سخن کس قدر شائستہ تھا۔ اپنے عہد کے بعض ممتاز شعرا کے بارے میں انھوں نے تنقیدی آرا کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔

آرزو:۔

"...... غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا"[2]

حاتم:۔

"...... شاعر خوش بیان تھا صاحب دو دیوان تھا ایک دیوان میں نہایت

(۱) گلشنِ ہند۔ ص ۱۱۳ - (۲) گلشنِ ہند۔ ص ۲۴

خرچ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا"[۱]

درد :-

"....... اس مجمع فضل وکمال کی التفات طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے ہے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلان خام کے ہے۔ اس شہسوار معرکۂ سخنوری کے توسن تند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی اور اس یکہ تاز عرصہ مضمون تراشی کے ست رنگ آسمان سیر خامہ سے بیچ میدان بلند مقام کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی ..... اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد واثر ہے زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہی ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسائلِ تصوّف میں بیشتر طبیعت آئی ہے اور شرح بھی اس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے"[۲]

سودا :-

"...... سچ تو یہ ہے کہ مرزائے مذکور سرحلقہ سخنوران اور سرآمد معنی گستران تھے۔ آشنائے معنیٔ بیگانہ اور مضمونِ تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے ..... خصوصاً طرزِ قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کرکے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دست وہم نازک خیالان ہندوستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا"[۳]

میر :-

"اقسام نظم میں یہ صدر نشین (میر) بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدہ خامہ معجز نگار رکھتا ہے۔

۱۔ گلشن ہند۔ ص ۸۱

۲۔ گلشن ہند۔ ص ص ۹۸، ۹۹

۳۔ گلشن ہند ص ۱۰۴

لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔[۱]"

آخر میں ہم گلشن ہند کے بارے میں چند صاحب رائے نقادوں اور محققین کی آرا پیش کرتے ہیں جن سے اردو ادب میں اس تذکرے کی قدر و قیمت کے بارے میں ظاہر کردہ خیالات کی مزید تائید و توثیق ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق :۔

" اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔[۲]"

حسرت موہانی :۔

"اس تذکرے (گلشن ہند) میں بہ نسبت اور مؤلفین اولی کے اکثر لوگوں کا حال مفصّل ہے اور انتخاب بہت کیا ہے..... یہ کتاب گلزار ابراہیم کے بالکل مخالف ہے اس میں بہت سا ایسا بیان ہے جو گلزار میں نہیں ہے۔[۳]"

سید سلیمان ندوی :۔

"علی ابراہیم خاں خلیل کا تذکرہ گلزار ابراہیم اور اس کا اردو ترجمہ گلشن ہند مرزا علی لطف دونوں اردو شعرا کے مشہور تذکرے ہیں ۔ یہ معلوم ہے کہ مرزا علی لطف نے گلزار ابراہیم کے تمام شعرا کو گلشن ہند میں درج نہیں کیا تھا پھر دوسری طرف لطف نے مختلف شعرا کے متعلق حالات اپنے ذاتی معلومات سے بھی بڑھائے تھے ۔ اس لئے یہ دونوں تذکرے اپنی جگہ اپنا منفرد وجود قائم کر چکے تھے۔[۴]"

۱۔ گلشن ہند ۔ ص ۱۵۳

۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۴

۳۔ اردوئے معلی جلد ۱۱ نمبر ۸ (علی گڑھ اگست ۱۹۱۰ء) ص ۶

۴۔ معارف ۔ (نومبر ۱۹۳۴ء) (اعظم گڑھ) ص ۳۹۵

پروفیسر سید محمد:۔

"لطف کا تذکرہ علی ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزارِ ابراہیم کا ہرگز ترجمہ نہیں ہے بلکہ لطف نے اس تذکرہ کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی بنیاد پر اپنے تذکرہ کی تدوین کی ہے یہ ان کی مستقل تالیف ہے اور اس میں بہت سی باتیں چشم دید اور محققانہ طور پر لکھی ہیں"۔[۱]

ڈاکٹر مسیح الزماں:۔

"مرزا علی لطف نے اس میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے متعلق رائے اس خوبی سے جمع کر دی ہے کہ خواہ تنقیدی لحاظ سے دیکھا جائے خواہ حالات کے اعتبار سے اس تذکرہ کا جواب اس سے پہلے کیا اس کے چالیس برس تک پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے تنقیدی اشارے اس کی رائیں اگرچہ پرانے طرز تنقید کا نمونہ ہیں لیکن پھر بھی اپنی جگہ پر اتنی جامع ہیں کہ ان کی مثال اس زمانے کی کسی تصنیف میں نظر نہیں آتی"[۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ:۔

"اس تذکرے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں تاریخی حالات قدرے مفصّل ہیں .... علی لطف کا یہ تذکرہ گلزار ابراہیم کی ایک اصلاح یافتہ شکل ہے"۔[۳]

قاضی عبدالودود:۔

"لطف اس کے پابند نہیں کہ کسی شاعر کے سب اشعار جو گلزار (گلزار ابراہیم) میں ہیں درج گلشن (گلشن ہند) کریں اور اپنی طرف سے کسی شعر کا اضافہ نہ کریں آفتاب کی غزل (۱۱ ابیات) جو گلشن (گلشن ہند) میں ہے گلزار (گلزار ابراہیم) میں نہیں۔

۱۔ ارباب نثر اردو (حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء) ص ۱۴۱

۲۔ "گلزار ابراہیم اور گلشن ہند" اردو تنقید کی تاریخ (الہ آباد ۱۹۵۴ء) ص ۱۲۳

۳۔ شعرائے اردو کے تذکرے (لاہور ۱۹۵۲ء) ص ۶۰

گلزار (گلزار ابراہیم) میں دو شعروں کا جو قطعہ دیا ہے وہ البتہ ہے اشتیاق کے متفرق اشعار (۳) لطف نے گلزار (گلزار ابراہیم) سے لئے ہیں لیکن (۷) ابیات کی غزل کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے فدوی دہلوی کی دو غزلیں اور ایک مطلع گلشن (گلشن ہند) میں ہے لیکن یہ سب گلزار (گلزار ابراہیم) سے غیر حاضر ہیں اور اس کے اشعار میں سے ایک بھی گلشن ہند میں نہیں۔"[۱]

ڈاکٹر جاوید نہال :-

"تذکرہ گلشن ہند ایک مفید اور قیمتی تذکرہ ہے اس میں اردو کے تمام مشہور شاعروں کا حال مل جاتا ہے یہ دراصل مشہور فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے لیکن کاربن کاپی نہیں ہے اصل میں مرزا علی لطف نے جناب خلیل ابراہیم (علی ابراہیم خان خلیل) کے فارسی تذکرے کی بنیاد پر زیادہ وسیع اور کشادہ عمارت تعمیر کی ہے۔ لطف نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ شاعروں کے حال کو پھیلایا ہے اور بہت سی نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے اور اضافے اور ترمیم سے ندرت اور نیا پن پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔"[۲]

(۸) ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی

"لطف کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ زبان کی دلکشی و سلاست کی وجہ سے پڑھنے والے کو شعرا کے حالات اور ان کے فن کے سلسلے میں کہیں بھی معلومات حاصل ہونے میں کوئی

۱۔ معاصر سہاہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۴۲

۲۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۶

دقت محسوس نہیں ہوتی۔[1]

(۹) ڈاکٹر سلام سندیلوی:۔

"دراصل یہ تذکرہ علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہے مگر اس میں مرزا علی لطف نے اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ اس تذکرے میں اردو شعرا کے حالات اس قدر تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں کہ اس سے قبل ایسے حالات دیگر تذکروں میں نہیں ملتے ہیں۔ اس تذکرے سے شعرا کے خانگی حالات اور ان کے کردار معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں سیاسی حالات بھی درج ہیں۔ ایک پُرلطف بات یہ ہے کہ "گلشن ہند" میں مختلف شعرا کے عشق کے حالات بھی موجود ہیں.... شعرا کی تاریخ وفات بھی ملتی ہے.... لطف نے شعرا کے بیان میں مکمل جملے لکھے ہیں جب کہ اس سے قبل بہت سے تذکروں میں صرف فقروں میں تعریف کی جاتی تھی۔"[2]

لطف کا اسلوب بیان:۔

اسلوب ادیب کا آئینہ ہوتی ہے۔ ادیب کی شخصیت جس داخلی اور خارجی ماحول میں تربیت پاتی ہے اس کا پرتو ادیب کی طرز تحریر میں بھی جھلکتا ہے۔ لطف کا تذکرہ "گلشن ہند" اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے بانی ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ایما پر لکھا گیا لیکن اس میں ایسی زبان اور اسلوب بیان نہیں ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی خصوصیت ہے اس کے برعکس لطف نے اپنے دور کے عام ادبی رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے رنگین اور مقفیٰ زبان استعمال کی ہے۔ شمالی ہند کے ابتدائی نثر کے کارناموں میں فضلی کی کربل کتھا اور عطا حسین تحسین کی نوطرز مرصع کو ایک مقام حاصل ہے یہ دونوں تصانیف فارسی اسلوب کے

---

[1] اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر (لکھنو ۱۹۶۸ء) ص ۴۲

[2] ادب کا تنقیدی مطالعہ (لکھنو ۱۹۶۲ء) ص ۵۶۴

اتباع میں رنگین و مقفیٰ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ چوں کہ شمالی ہند میں فارسی ایک عرصہ دراز تک سرکاری اور دفتری زبان رہی اور عوام و خواص اسی زبان میں شاعری کرتے رہے تھے اس لئے اہل اردو کے لئے بھی فارسی اسالیب کی تقلید ناگزیر ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت تک اردو اپنی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی اور ابھی اس کا کوئی کینڈا یا ڈھانچہ متعیّن نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی مزاج بن سکا تھا۔ اہل قلم کے سامنے اس زبان میں نثر کا کوئی نمونہ یا نقش بھی نہیں تھا کہ جس کو وہ اپناتے۔ حتیٰ کہ وجہی کی تصنیف "سب رس" میں بھی ہر جگہ فارسی طرزِ نگارش کی تقلید صاف نظر آتی ہے لطف نے دہلی میں آنکھ کھولی تھی لیکن اوائل شباب میں لکھنو چلے آئے تھے۔ ان کی علمی اور ادبی صلاحیتیں اسی ماحول میں جلا پائی تھیں چنانچہ گلشن ہند میں انھوں نے جو زبان اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک اپنے دور کی عام روش کے مطابق ہے۔ تذکرہ گلشن ہند کی زبان کے بارے میں رائے دینے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ لطف کی زبان اب سے ۱۷۵ برس پرانی ہے لسانی حیثیت سے بہت سے الفاظ جو اس زمانے میں مروّج تھے موجودہ زمانے میں متروک ہیں شلاً "کر کے" اب متروک ہے اس زمانے میں مروّج تھا۔ مثلاً:-

"شورش تخلّص ستوطن عظیم آباد کے مشہور میر بہنا کر کے تھے"[۱] یوں تذکرہ گلشنِ ہند کے دیباچہ میں انھوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ وہ جان گلکرسٹ کی خواہش کے پیش نظر اس تذکرہ کو سادہ اور سلیس زبان میں لکھ رہے ہیں اور انھوں نے کہیں عربی لفظ استعمال بھی کیا ہے تو ایسا کہ مبتدی اس کو پڑھ کر سبحان اللہ کہہ اٹھے اور فارسی لفظ کہیں استعمال کیا ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے واہ نکل جائے۔

" تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی

۱؎ - مرزا علی لطف (تذکرہ شورش) گلشنِ ہند (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۲۱

دیکھ کر کہیں " سبحان اللہ " اور لفظ فارسی کی جگہ یاد ے تو ایسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ " امید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سر انجام اور مقبول نگاہ خاص و عام ہو۔"[1]

ذیل کی عبارتوں سے اندازہ ہوگا کہ لطف نے گلکرسٹ کی فرمایش کے مطابق سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس زمانے کی عام روش کے مطابق عبارتوں میں قوافی کا التزام ملحوظ رکھا ہے اور رعایت لفظی سے بھی جا بجا کام لیا ہے۔

ا "آرزو تخلص ہے سراج الدین علی خاں نام متوطن اکبر آباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے کہ چراغ دہلوی جن کا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا۔ فاضلوں سے علم کے جس قدر کہ فائدہ چاہیئے تھا اٹھایا اور مرتبہ کو استعداد سے دور رہوا یعنی اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ معمور ہوا۔ ۱۱۳۰ گیارہ سو تیس ہجری تھی کہ دار الخلافہ ہندوستان میں آیا اور زور شور شاعری کا زبان دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانہ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں نے جس قدر اخلاق کے مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت ان سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر

---

[1] مرزا علی لطف (دیباچہ) گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۳ ۔

وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا اور نام اس کا "تنبیہہ الغافلین" رکھا ہے۔[۱]

۲ "انشاء تخلص، میر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے مصدر جن کا تخلص تھا عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبانِ عربی میں انھوں نے نظم کی ہیں اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحبِ دیوان ہیں سالِ گزشتہ انھوں نے ایک قصیدہ زبانِ ریختہ میں غیر منقوط یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کابل بھجوایا اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت سا پایا۔"[۲]

۳۔ "صانع تخلص، نظام الدین احمد نام، ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ " محبانِ قدیم سے مرزا محمد رفیع سودا کے اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے بڑے صاحب درد و تاثیر اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کبھی سنتے تو گھڑیوں روتے اور بے چین رہتے۔ عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار استقامت طبع رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے سنہ بائیسویں تک شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایّام زندگی کے بسر کردے تھے آخر سنہ ہجری میں ملکِ وجود سے رخت سفر باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مرتب ہے ان کا اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔"[۳]

ان عبارتوں میں اگر قافیہ پیمائی اور اس سے پیدا ہونے والی تعقید کو نظر انداز کیا جائے یا تعقید کو دور کرتے ہوئے الفاظ کی نشست کو بدل دیا جائے تو چند الفاظ کی

۱۔ لطف "ذکر آرزو" گلشن ہند (مطبوعہ) ص ۲۳۔
۲۔ لطف "ذکر انشاء" گلشن ہند (مطبوعہ) ص ۳۵۔
۳۔ لطف "ذکر صانع" گلشن ہند (مطبوعہ) ص ۱۲۲۔

غرابت کے سوا ان کی زبان جدید دور کی زبان سے قریب محسوس ہوگی۔

لطف کو رعایت لفظی کا بڑا چسکا تھا۔ شاعری میں بھی اور نثر میں بھی وہ اس کا خاص اہتمام کرتے نظر آتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جہاں برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ اس صنعت کو برتا گیا ہے عبارت کی دلکشی اور تاثیر بڑھ گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اگر کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ " نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا " فرمایا " کیا ہوا ہاتھی پھرا اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا "[1]

۲۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا "[2]

۳۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں تو پھر ایسی موافقت آئی اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی "[3]

۴۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے "[4]

۵۔ " گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے لیکن مضمون رنگین سوجھتا ہے "[5]

لطف نے عام طور پر شعرا کے حالات سیدھے سادھے انداز میں تحریر کئے ہیں لیکن جن شعرا سے انہیں خاص لگاؤ اور قرب رہا ہے ان کا تذکرہ لکھتے ہوئے لطف کی طبیعت رنگین بیانی کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ پھر وہ عربی اور فارسی کے ادق الفاظ سے بھی احتراز

---

۱ لطف " ذکر آفتاب " (گلشن ہند مطبوعہ) ص ۸۔

۲۔ لطف " ذکر امید (ایضاً) ص ۱۹

۳۔ لطف " ذکر امید (ایضاً) ص ۲۰

۴۔ لطف " ذکر امید (ایضاً) ص ۲۴

۵۔ لطف " ذکر جرات (ایضاً) ص ۴۔

نہیں کرتے۔

لطف کی ان تحریروں میں نہ صرف دور از کار تشبیہہ واستعارے ملتے ہیں بلکہ صنائع لفظی و معنوی کا بھی التزام خاص طور پر رکھا گیا ہے۔ عبارت آرائی کی خاطر خواہ مخواہ بات کو طول دیا ہے قافیوں کی پابندی کی وجہ سے کہیں کہیں جملوں میں تعقید پیدا ہو گئی ہے مثلاً۔

"بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے اور تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بے چارے گئے"[1]

ان کی استعاری طرز تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو ــــــ

" سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھروں کی مار کا اور ہدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدھا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا اور گولیوں کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہہ شرمندگی سے پانی پانی تھا"[2]

فارسی انشا پردازی کا تتبع نہ صرف مقفی عبارت اور رنگین بیانی سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ حروف ربط کے استعمال توسیع مبتداء اور توسیع خبر سے متعلق فقروں کی نشست سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے لطف نے واسطے "کہ" کی وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ جملوں کی ترکیب فارسی انشاء کے مطابق رہے۔ بعض جگہ جمع مبتداء کو واحد کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً

"ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی وہاں موجود تھا"[3]

۱۔ لطف "ذکر آفتاب" "گلشن ہند" (مطبوعہ) ص ۹

۲۔ مرزا علی لطف ذکر آفتاب "گلشن ہند" (مرتبہ شبلی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۸

۳۔ مرزا علی لطف "ذکر آصف" (مرتبہ شبلی) لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۳

غرض بحیثیت مجموعی لطف کا اسلوب اپنے دور کا نمائندہ ہے اگرچہ آج اس میں دلکشی اور جاذبیت محسوس نہیں ہوتی لیکن اُس زمانے میں اسی طرزِ تحریر کو نظرِ قبولیت سے دیکھا جاتا تھا اور وہی شخص باکمال متصور ہوتا تھا جو مقفیٰ مسجع اور رنگین عبارت لکھنے پر قادر ہو۔ تذکرہ گلشن ہند کے حسب ذیل نثری نمونوں سے لطف کے رنگین اور مقفیٰ اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ تخت نشینی بارگاہ سرفرازی شاہ عالم بادشاہ غازی قائم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہ بے آزار کو اور زیادہ کرے اس کی قدرت اور اقتدار کو[۱]

۲۔ "آفتاب تخلص نور بیز جہاں بانی مہر سپہر صاحب قرانی، شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدف سلطنت کا نام عالی گوہر تھا"[۲]

۳۔ "جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال میں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین و آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور اس خراش سے عارض رقم کی، مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کا سد ہے اور ہوا شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے۔ خیال کا اور جادو طرزی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے"[۳]

مقفیٰ عبارت کے شوق میں لطف تعقید کی بھی پروا نہیں کرتے چنانچہ حیران کا ذکر ان الفاظ میں شروع کرتے ہیں :۔

۱۔ مرزا علی لطف دیباچہ "گلشن ہند" (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۴

۲۔ مرزا علی لطف ذکر آفتاب "گلشن ہند" (مرتبہ شبلی) لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۶

۳۔ مرزا علی لطف "ذکر میر" گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶) ص ۱۵۲

"حیران تخلص میر حیدر علی نام ساکن شاہجہاں آباد کے شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص استاد[1]"

اسی صفحے پر مولانا شبلی نعمانی نے فٹ نوٹ میں تعقید کی شکایت کرتے ہوئے لکھا ہے "اس فقرے میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استادِ فن ہیں حیران ان کے شاگرد ہیں"

۱۔ مرزا علی لطف "تذکرۂ میراں ؛ گلشنِ ہند، (مرتبہ شبلی نعمانی) لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۸۵

شاعری

دیوانِ لطف

دیوان لطف کے تین نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے۔ پہلا نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہے۔ دوسرے نسخے کی "مجلس تحقیقات اردو" حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں محفوظ رہنے کی اطلاع ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بہم پہنچائی ہے[1] افسوس کہ پروفیسر عبدالقادر سروری اعزازی معتمد مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن کے انتقال بعد یہ ادارہ بھی ختم ہوگیا۔ راقم الحروف نے پروفیسر عبدالقادر سروری کے ورثاء سے استفسار کیا مگر اس نسخے کا پتہ نہیں چل سکا۔ تیسرے نسخے کی اطلاع پروفیسر سید محمد نے بہم پہنچائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"ان کا (لطف) کلیات افسوس ہے کہ لاپتہ ہے۔ مولوی غلام محمد صاحب وفا مالک تاج پریس حیدرآباد کے ہاں "دیوانِ منتخب" کے نام سے لطف کے کلیات کا نہایت ہی معتبر اور نفیس انتخاب قلمی نسخہ کی صورت میں نظر آیا[2]۔"

راقم الحروف نے اس نسخے کا پتہ چلانے کی بہت کوشش کی۔ افسوس کہ نہ مولوی غلام محمد وفا ہی رہے اور نہ ان کا تاج پریس۔

دیوان لطف کا واحد نسخہ جو کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی میں دستیاب ہوا ہے مکمل مخطوطہ ہے۔ پہلے صفحہ پر "دیوان منتخب مرزا علی خاں لطف" لکھا ہوا ہے۔ مخطوطہ کا داخلہ نمبر ۱۲۱ ہے۔ سائز ۱۰/۱ ۱/۲ ۵" ہے۔ ہر صفحہ پر سطور ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان

---

[1] مثنوی لطف (حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۶۶

[2] ارباب نثر اردو (حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء) ص ۱۳۷

ہیں۔ خط نستعلیق شکستہ ہے جگہ جگہ کرم خوردہ ہے۔ یہ مخطوطہ مرزا علی لطف کی غزلیات، قصائد اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس کے اوراق ۴۴ اور ۸۰ صفحات ہیں[۱]۔ سرورق پر کسی نے "دیوان لطف از مرزا علی خاں لطف" لکھ دیا ہے پہلے صفحہ پر فاضل بیگ ولد صفدر بیگ کی مہر ہے جس پر سنہ ۱۲۵۹ ہجری بھی کندہ کیا ہوا ہے۔ یہ مخطوطہ ہاتھ سے تیار کئے ہوئے کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے اور نہ سنہ کتابت دیا گیا ہے۔ صرف مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۵۹ آ کو یہ فاضل بیگ ولد صفدر بیگ کی ملکیت بنا۔

مخطوطہ کے آغاز سے پہلے "رب یسر بسم اللہ الرحیم وتمم باخیر" لکھا ہے۔ اس کے نیچے اس شعر سے نسخے کا آغاز ہوتا ہے۔

زیب لوح عرش سیج مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پر سادہ دیڑ کار مصرع آہ کا

مخطوطہ کا اختتام لطف کے اس شعر پر ہوا ہے۔

گلشن اقبال نیرانت رہے باآب ورنگ
دہر کا شاداب وخرم جب تلک گلزار ہے

نسخے کے اختتام پر بھی "فاضل بیگ ولد صفدر بیگ سنہ ۱۲۵۹" کی مہر ہے۔

اس نسخے میں ۷۰ غزلیات (۴۷۱ اشعار) جن میں متفرق ۱۰ اشعار اور چھ رباعیات بھی شامل ہیں اور پانچ قصائد (۲۷۷ اشعار) موجود ہیں۔ اس طرح دیوان کے اشعار کی جملہ تعداد ۷۵۸ ہوتی ہے۔ لطف کی مثنوی دیوان میں شامل نہیں ہے۔

۱۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکھتی ہیں: "یہ عجب اتفاق ہے کہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں لطف کے کلام کا جو مخطوطہ محفوظ ہے وہ بھی (۷۰) صفحات پر مشتمل ہے" (ملاحظہ ہو "مثنوی لطف" صفحہ ۶۶) ڈاکٹر صاحبہ کو سہو ہوا ہے مخطوطے کے صفحات کی تعداد ۸۰ ہے۔

مرزا علی لطف کی ایک رباعی اور چند اشعار مختلف تذکروں میں دستیاب ہوئے ہیں جو تذکرہ گلشن ہند مطبوعہ و مخطوطات اور دیوان لطف (قلمی) میں بھی موجود نہیں ہیں۔

جو کوئی کہ آفت نہانی مانگے　　اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلا دے اسے تو اپنی شمشیر نگاہ　　جس کا مارا کبھی پانی نہ مانگے[1]

سینکڑوں گل ہوئے خوش رنگ چمن میں کھِل کے
آخرش خاک ہوئے خاک میں سب رل مل کے
جس گھڑی یار میرا مجھ سے جدا ہونے لگا
روئے ہم خوب طرح اس سے گلے مل مل کے
آہ کیدھر کو چلے جاتے ہو چھوڑے تنہا
ہمرہو! ہم بھی مسافر ہیں اسی منزل کے
لطف یہ شعر کہا جس نے عجب شاعر تھا
جس کے سننے سے ہوئے ٹکڑے ہزاروں دل کے
اس سے کیوں چشم مروت تجھے اے یار نہیں
تیرے الطاف کا کیا لطف سزاوار نہیں[2]

---

[1] غلام ہمدانی مصحفی تذکرہ ہندی (مرتبہ عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء) ص ۲۰۱
اعظم الدولہ سرور عمدہ منتخبہ (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) ص ۵۵۲
مجموعہ نغز (مرتبہ محمود شیرانی) ص ۱۴۹

[2] سعادت خاں ناصر تذکرہ خوش معرکہ زیبا (مرتبہ مشفق خواجہ) (لاہور ۱۹۷۰ء) ص ۲۰۴

لطف کی غزل گوئی

تمام اصنافِ سخن میں غزل بیک وقت خارجی اور داخلی تجربات کی مظہر ہے۔ اس میں سوزِ درونِ حیات بھی ہے اور رنگینیٔ کائنات بھی۔ مسرت و شادمانی بھی ہے حسرت اور تشنہ کامی بھی۔ ایمائی اظہار بھی ہے اور ابلاغ بھی۔ کیفیات حسن و عشق بھی ہیں اور وارداتِ قلب و ذہن بھی۔ شاید اسی لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ "غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے اور تہذیب ہماری غزل میں"۔ غزل اور تہذیب کے اس رشتے کو سمجھنے میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے انداز فکر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک دبستان داخلی رجحانات کا آئینہ دار ہے تو دوسرا دبستان خارجی میلانات کا عکاس ہے۔ ایک جگہ سادگی و پرکاری ہے گہرائی و گیرائی ہے۔ سوز و گداز، درد اور تڑپ ہے تو دوسری جگہ خارجیت، صنعت گری اور رعایت لفظی ہے۔

مرزا علی لطف کی شاعری میں تغزّل کے ہر دو رنگ موجود ہیں۔ اس سے نہ صرف شاعر کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس سے عہدہ بہ عہدہ ادبی رجحانات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لطف کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں دہلی کے ماحول کا ہاتھ رہا وہیں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔ لطف کی شاعری کا آغاز دہلی میں ہوتا ہے اور لکھنؤ میں ان کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ دہلی میں وہ جب تک رہے میرؔ اور سوداؔ کو وہ اپنا امام سمجھتے رہے غالباً اسی لئے اس دور کی غزلوں میں میر کی سادگی اور سودا کا بانکپن ملتا ہے۔ بحروں کے انتخاب اور زبان و انداز بیان میں بھی میر کے مقلّد نظر آتے ہیں بعض اشعار میں جو سہل ممتنع قسم کے ہیں میر سے بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔

اور بعض اشعار میں وہ میر سے بہت زیادہ متاثر ہیں اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔

میر:- پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

لطف:- پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

میر:- عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

لطف:- گئی جوانی، آئی پیری، موئے سیہ سب ہوئے سفید
تا کے غفلت، جاگ اے غافل، صبح ہوئی اب رات نہیں

میر:- ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

لطف:- کیوں لطف میاں جیتے ہو بے یار کے دیکھے
اے ننگِ محبت تو نہ لے نامِ محبت

میر:- اس کے فروغِ حسن سے چمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

لطف:- یہی تو کفر ہے یاران بے خودی کے حضور
جو کفر و دیں کا مرے یار امتیاز رہا

میر:- انکھڑیوں کو اس کی خاطر خواہ کیونکر دیکھئے
سو طرف جب دیکھ لیجئے تب ادھر دیکھئے

لطف:۔ نہ آنکھ بھر کے کبھی ڈر سے ہم تو دیکھ سکے

وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

لطف کے اس دہلوی رنگ سخن کا اثر ہمیں غالب کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالب نے براہ راست لطف سے اکتساب کیا ہو لیکن بعض جگہ غالب نے ایسی بحروں زمینوں میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا انتخاب کیا ہے جو لطف کے ہاں ملتی ہیں اور کہیں مضامین میں بھی توارد موجود ہے چنانچہ لطف کے دیوان کا پہلا شعر ؎

زیب لوحِ عرش سچ مصرع ہے بسم اللہ کا

واہ رے پُرسادہ و پُرکار مصرع آہ کا

"سادہ و پُرکار" کا استعمال غالب کے یہاں دیکھئے ؎

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ

ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

لفظ "واشد" فارسی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جو بہت وسیع معنوں کو ظاہر کرتا ہے اور انقباض کے مقابلے میں انبساط کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔

لطف نے اس لفظ کو اس طرح استعمال کیا ہے ؎

دل کی واشد کے لئے سیر چمن کو جائیں کیا

دیکھیں روئے گل تو اس گل رو کو منہ دکھلائیں کیا

لفظ "واشد" کا استعمال غالب کے یہاں ملاحظہ ہو ؎

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل

مست کب بند قبا باندھتے ہیں

لطف کے اسی مضمون کو غالب نے اپنے اس شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

لطف کا یہ شعر پڑھیے ؎

لاکھوں ہے گل صبا سے کھلا اب کے باغ کا
پھاہا نہ سرکا آہ سے اک دل کے داغ کا

غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

لطف کا یہ شعر ؎

دیکھ کر سرو کو کل یاد جو آئی مجھ کو
کیا قیامت تری قامت نے دکھائی مجھ کو

غالب کا یہ شعر دیکھئے ؎

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

غالب نے موت کو غم سے رُستگاری کا وسیلہ قرار دیا ہے ؎

قیدِ حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لطف نے یہی بات دل میں گھر کرنے والی سادگی کے ساتھ بیان کی ہے۔

مر جائیں تو چھُٹ جائیں اس روز کے مرنے سے
پر کیا کریں ہے یاں تو مرنے کا ہی ڈھب مشکل

غالب جس طرح نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرتے تھے اسی طرح لطف نے بھی نئی ترکیبوں

میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

گمان اپنا صواب اندیش و سرتاپا خطا نکلا
جسے اہلِ وفا سمجھے تھے ہم وہ بے وفا نکلا

صواب اندیش اور سرتاپا خطا کا جواب نہیں۔ دعوے کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن جہاں تک ہمارے مطالعے کی حد ہے یہ ترکیب لطف کے سوا کسی شاعر نے استعمال نہیں کی۔ یہ ترکیب دیکھئے ؎

ہے استخوان سوختہ دنیائے سگ فریب
کب صید دام حرص ہو دانا ہما کی طرح

دنیا کو "استخوانِ سوختہ" کہنا پھر اس کی صفت "سگ فریب" بیان کرنا ترکیب کی ندرت بھی ہے اور استعارہ کا اچھوتا پن بھی۔ ایمائی تاثر غزل کی ایک اہم خصوصیت ہے اظہار اور ابلاغ میں شاعر کو بڑے سلیقہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی ایمائی تاثر ہے جس کی وجہ سے شعر ایک نشتر بن کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ ایمائیت کی مثالیں لطف کے ہاں خال خال ہیں لیکن جو بھی ہیں وہ اچھوتی اور فکر انگیز ہیں۔ ان مقامات پردہ علائم سے بھی کام لیتے ہیں ؎

واں تجھ کو خواب ناز ہے یاں ہم کو صبح تک
جنبش پلک کی دل میں ہے پیکاں خدنگ کا

لطف جب لکھنو پہنچتے ہیں تو ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ جہاں کلام میں پختگی اور زبان میں بے ساختگی پیدا ہوئی وہیں موضوع کے اعتبار سے دبستانِ لکھنو کے معیار کو پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت تک دبستانِ لکھنو کی باقاعدہ تشکیل عمل میں نہیں آئی تھی تاہم یہاں کی ادبی فضا دہلی سے یکسر مختلف تھی۔ آصف الدّولہ کا زمانہ شاعری اور رقص و موسیقی کے عروج کا زمانہ تھا۔ لکھنوی معاشرت، عورت، موسیقی اور شاعری

سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی اور اہل لکھنو کی نزاکتِ طبع کا بھی شاعری اور موسیقی پر خاصا اثر پڑا تھا۔ اب غزل میں عورت محبوب کا تصوّر واضح طور پر ابھرتا ہے اور شاعری میں اسکے خد و خال اور صفات کو پیش کرنا ہی فن کا کمال سمجھنے لگے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ صحت زبان روزمرہ اور محاوروں کی بندش الفاظ کی دروبست دچستی نئی ترکیبوں اور تشبیہہ واستعاروں پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ ایہام جو کبھی دہلوی شاعری کی اہم خصوصیت تھی اب لکھنوی شعرا کے ہاں ایک نئے انداز میں ملتی ہے۔ شاعری، صنعت گری اور رعایت لفظی میں محدود ہو کر رہ گئی۔ ایک طرح سے شاعری کی یہ خصوصیات پوری لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار ہیں اور اسی تہذیب کا عکس لطف کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ غزل کا روایتی انداز جس میں ایک قاتل اور سفاک محبوب کا تصور بھی شامل ہے۔ ایک زمانے تک مستحسن سمجھا جاتا رہا۔ لطف کی غزلوں میں ہر جگہ یہ روایتی رنگ موجود ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کمر اہل وفا کے قتل پر جو دلربا باندھے
جو کوئی کیا اس وفا دشمن سے پھر عہد وفا باندھے

اڑا کیوں رنگ چہرے کا یہ فرمائیے صاحب
گنوا بیٹھے کہیں دل بس نہ اب شرمائیے صاحب

لطف کے ہاں سنگلاخ زمینوں کی بھی کمی نہیں۔ سنگلاخ زمینوں کے استعمال کا مقصد ایک طرف تو ہم عصروں میں استادانہ حیثیت منوانا ہے تو دوسری طرف اپنی قادر البیانی اور علم عروض پر عبور کامل کا اظہار بھی ہے دبستانِ لکھنو کی عام روش کے مطابق انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اچھے شعر نکالتے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھئے ؎

مشتاق ایک نگاہ کے ہونٹوں پہ جان ہے
ظالم پہنچ کہ وقت نہیں اب درنگ کا
واں تجھ کو خواب ناز ہے یاں ہم کو صبح تک
جنبش پلک کی دل میں ہے پیکان خدنگ کا

پیمانے میں آگ، پروانہ میں آگ کی زمین میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شمع نازاں ہے فقط سر سے بھڑک جانے میں آگ
پھونک دے سارا جہاں ہے گی وہ پروانے میں آگ
شعلۂ شمعِ حرم حُسنِ بتاں سے ہے خجل
مجھ کو خطرہ ہے کہ لگ جائے نہ بت خانے میں آگ
دیکھنا قسمت کی خوبی میری باری آئی جب
جائے مے ساقی میں بھر دی میرے پیمانے میں آگ

دامان و آستین، مژگان و آستین جیسے مشکل قوافی اور ردیف میں یہ اشعار دیکھئے

دیکھا نہ اک پل کے لئے بھی انھیں جدا
یارب گرہ ہے دامنِ مژگان و آستین
کیا جانے لائی باغ میں کس گل کی بو ہمیں
رشکِ چمن تھا ورنہ یہ دامان و آستین

رعایتِ لفظی کی مثالیں ؎

دل کی واشد کے لئے سیرِ چمن کو جائیں کیا
دیکھیں رونے گل تو اس گل رو کو منہ دکھلائیں کیا
دھیان اس شیشہ کا رکھنا کہ نہ ہوگا پیوند
دل میری جان اگر ایک سرِ مو ٹوٹ گیا

نہ ہووے خرمنِ پروانہ کیوں کہ موردِ برق
زبان شمع پہ تا صبح سوز و ساز رہا

جی پر یہ کھیلتا ہے جہاں دیکھا شعلہ رو
یارب یہ دل ہے یا کہ پتنگا چراغ کا

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زباں تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوہ

مقر تھا اک جہاں میں سرمہ آلودہ وفا وہ چشم
ذرا تھی دیر بینائی کی بالکل طوطیا نکلا

کیا کم ہے سلطنت سے سگ کوئے یار اگر
قانع ہو استخواں پہ ہماری ہما کی طرح

غذا خونِ جگر سے دی جسے گودی میں پالا تھا
وہ طفلِ اشک مجھ سے آج یوں دست و گریباں ہے

ہے لطف علی قوتِ بازوئے ضعیفاں
ہر مور کہے کیوں نہ سلیماں سے گئے ہم

ایک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستون میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں

جتنے تھے اس صفائے گلو کے جو گل مریض
ہر یک کی آج کہتے ہیں گردن ڈھلک گئی

لطف نے سراپا نگاری تشبیہ و استعارہ اور تلمیحات کے بیان میں بھی لکھنوی شاعری کے روایات کو مقدم سمجھا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے بلاشبہ ابلاغ کی ایک صورت نکل آتی ہے لیکن چند پٹی پٹائی تلمیحات سے شعر کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ لطف نے

کم و بیش وہی تلمیحات استعمال کی ہیں جو اردو شاعری کا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں یعنی وہی فرہاد اور مجنوں کا ذکر ہے اور وہی حضرت یعقوب علیہ السّلام اور حضرت یوسف علیہ السّلام کے واقعات کی طرف اشارہ ہے مثلاً :-

دیدۂ یعقوب اگر نابینا ہو یوسف کے لئے
تن میں تیرے اے زلیخا جان اس غم سے رہا

ہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوہ

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سنا

گذرا کاروانِ صبر و طاقت کا یہاں معلوم
نکلنا یوسف دل کا ہے مشکل چاہ غبغب سے

مدد اے خضر عنایت کہ نو سفر ہیں ہم
نہیں ہیں راہِ عدم میں تو نقشِ پا پیدا

بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ آتش کے اس شعر پر سے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کسی نے بر سر موقع مشاعرہ میں کہا تھا کہ " مرغِ قبلہ نما " بچ رہا تھا لیکن آتش نے اس کو بھی نہ چھوڑا ۔ جب ہم لطف کے کلام میں " مرغ قبلہ نما " کی اصطلاح دیکھتے ہیں تو اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ آتش سے بہت پہلے لطف نے " مرغ قبلہ نما " کو شکار کر لیا تھا ۔

نہیں ہے قبلہ نما مرغ کی طپش بے وجہ
کہیں بچارے کی اٹکی ہے تیرے تیر میں جان

تشبیہہ و استعاروں میں بھی وہی روایتی رنگ ملتا ہے جو دبستانِ لکھنؤ سے مخصوص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہہ، استعارہ اور صنعت کلام کا زیور ہے اس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے اور اثر آفرینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن ان کے استعمال میں ایک خاص سلیقے، تناسب و توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن دبستانِ لکھنؤ کے شعرا نے تشبیہہ، استعارہ اور صنعت کو کچھ اس طور پر برتا ہے کہ شعر کی لطافت ختم ہو گئی ہے اور وہ ایک چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اپنے عہد کے اس ادبی رجحان سے لطف بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا اندازہ ان کے حسبِ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے۔

ناخن پہ دل ہلال ہے ابرو کے رشک سے
مکھڑے پہ داغ رکھتا کلیجے پہ ماہ ہے
خوبی کا تیرے بالوں کے مذکور ہے جہاں
سنبل کا نام اس جگہ ایک روسیاہ ہے

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا کلام اچھی تشبیہوں استعاروں سے یکسر خالی ہے۔ ان کے مزاج نے ابتداء میں دہلی کا رنگ قبول کیا تھا اس کا پرتو جہاں بعض اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر اسی اچھوتے اندازِ بیاں کا مظہر ہے۔

خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اس کی سرک گئی

میر نے آوازِ جرس کو جو قافلے کے آگے آگے تنہا چلتی ہے اپنی تنہائی سے

تشبیہ دی ہے ؎

اک بیاباں بہ رنگ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

لطف نے جرسِ دل کے خاموش ہو جانے کو قافلے کے جانے سے تشبیہ دی ہے۔

کبھی تو قافلہ ٹھہرا ہے سینہ چاکوں کا
نہیں ہے اب جرسِ دل کی کچھ صدا پیدا

لطف نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں جن میں ان کی قادرالبیانی اور استادانہ حیثیت جھلکتی ہے۔ دو غزلے سہ غزلے کہنا یا ہر غزل کے تمام اشعار میں معنوی ربط اور تسلسل کو برقرار رکھنا اس زمانے کا ایک عام رجحان ہو چلا تھا۔ مسلسل غزلوں میں بعض جگہ اپنی کسی حالت کا محبوب کی حالت سے تقابل کیا گیا ہے اور بعض جگہ واردات حسن عشق کا بیان بھی ملتا ہے مثلاً یہ غزل ؎

تم ہو بزمِ عیش ہے واں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم ہے یاں اور جاں سے بیزاریاں
تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا واں ہے شوق
یاں بدن پر ہیں ہجومِ داغ سے گلکاریاں
دھیان ہے آرائشِ زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفائے ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر داریاں
تم نے دکھلائی وہاں بیٹھ اور چوٹی کی پھبن
یاں میری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں

نیک و بد دونوں سے یاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادو کاریاں

یاں برنگ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں

قہقہے تم مارتے ہو واں یہ آوازِ بلند
دشمنوں سے یاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں

ہر مریضِ غم کی جاں بخشی کا ہے واں تم کو دھیان
کھینچ گئیں یاں طول وشدت سے میری بیماریاں

اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں واں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں

ربط اور تسلسل کے علاوہ اس غزل کی چند اور خصوصیات قابلِ توجہ ہیں ایک ظاہری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جمع کے قوافی ہیں اور ردیف موجود نہیں۔ معنوی خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل کے ہر شعر میں اپنی کسی حالت کا محبوب کی حالت سے تقابل کیا گیا ہے۔ یہ تقابلی بیان لطف اور غالب کے پاس مشترک ہے۔ مثلاً غالب کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موجِ رنگ کا

یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

شاعر کے وحدتِ تخیّل کا یہ ایک اچھا نمونہ ہے اس میں مطلع سے مقطع تک ایک ہی مرکزی خیال پیش کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس سے غزل کی غنائیت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ دوغزلے اور سہ غزلے زیادہ تر قافیہ پیمائی کے نمونے ہیں اگرچہ اس سخن طرازی کو لطف قیامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے دوغزلے پھیکے اور بے رنگ ہیں۔ لطف کی ایک اور مسلسل غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

یاروں نے یہ تو کہیئے کیا کیا سمجھائیاں ہیں

بے وجہ تو نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں

دوسرے اشعار:۔

میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رو کے آگے

مہتاب رو کے منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

ایک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد

کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں

روئے غبار خط وہ آئینہ رُو تو دیکھے

ہر خط میں دیکھنا پھر کیسی صفائیاں ہیں

طاقت حباب ساں اک نظارے کی ملی ہے

ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بت کدہ سے آگاہ

یاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں

لطف کی یہ غزل اگرچہ وحدتِ خیال کے لحاظ سے مسلسل نہیں ہے تاہم اس میں اندرونی ہم آہنگی موجود ہے اور غیر مسلسل غزل کی طرح انتشار نہیں ہے اس وزن میں جمع کے قافیوں کے ساتھ ردیف بھی ہے۔ یہ غزل میر کی غزل پر کہی گئی ہے اور مقطع میں جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسی زمین میں سودا کے پاس بھی غزل موجود ہے:

اے لطف اس غزل پر کہنا بقول سودا

یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

اسی زمین میں میر کے پاس پانچ شعر ہیں۔ میر کی غزل کا مطلع یہ ہے:۔

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں

اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

لطف کی غزل میں مطلع کی بے ساختگی، سلاست اور روانی کے علاوہ کئی اشعار ایسے ہیں جو نگاہ انتخاب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

طاقت حباب ساں اک نظارے کی ملی ہے

. ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

دوسرے مصرعے میں لفظ "ظالم" کا انتخاب لطف کے ذوق سلیم اور حسنِ انتخاب کا ثبوت ہے۔ اس مصرعے سے لفظ ظالم کو ہٹا کر کوئی دوسرا لفظ رکھیئے تاثر کا سارا طلسم ختم ہو جائے گا "ان فرصتوں پہ" "یہ خود نمائیاں" میں جو ہلکا طنز ہے اس سے شعر میں نشتریت پیدا ہو گئی ہے۔

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے بیزاری غزل گو شعرا کا مرغوب موضوع رہا ہے اور یہ خیال عامۃ الورود بھی ہے۔ میر تو مذہبی رواداری دکھانے کے لئے قشقہ کھینچ کر ترکِ اسلام

کر کے دیر میں بیٹھ جاتے ہیں لیکن لطف کہتے ہیں کہ ہم نہ تو کعبہ سے واقف ہیں اور نہ بت خانے سے، ہم آستانِ دل پر جبہ سا ہیں۔ فارسی شعرا نے بھی "کعبۂ گِل" پر "کعبۂ دل" کو ترجیح دی ہے۔ لطف کے شعر میں قول فیصل کی قطعیت اور خود آگاہی ہے ؎

کعبہ سے ہم نہ واقف نے بت کدے سے آگاہ
یاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں

لطف کی مندرجہ ذیل مسلسل غزل کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ان کا محبوب خود کسی پر عاشق ہو کر وابستۂ غم ہو گیا ہے وہ جو ہمیشہ بیگانہ رہتا تھا اب کسی کا آشنا ہو گیا ہے اس پُر فریب وعدہ کا یہ اثر ہے کہ آنکھیں دروازے سے لگی ہیں جو سازِ جمعیت تھا وہ خود پریشان ہو گیا ہے واسوخت نگار شعرا نے محبوب کی بے حسی اور تغافل سے تنگ آکر اپنے واسوخت میں محبوب کو بد دعا دی ہے کہ تو بھی کسی پر عاشق ہو جائے تاکہ تجھے اپنے عاشقوں کی قدر ہو سکے لیکن لطف کا انداز بہت ہی پُرلطف ہے۔ جس میں تخیّل سے زیادہ اصلیت کار فرما نظر آتی ہے :۔ ؎

کل سے اے مہ ہوں تجھے وابستۂ غم دیکھتا
خیر تو ہے آج کچھ آنکھیں بھی ہوں نم دیکھتا
آشنا کس سے ہوا جو اے بُتِ بیگانہ جو
سر ہوں تیرا آشنا ہر زانوئے غم دیکھتا
تھا فریب وعدہ پر تیرے بھی میرا ایسا حال
تو صدائے در پہ ہے جس طرح ہر دم دیکھتا
حال تیرا کچھ کئی دن سے تیرے کاکل کی طرح
اے پریشاں سازِ جمعیت ہوں درہم دیکھتا

یہ بھی قدرت ہے خدا کی جس مرے عالم کا آپ
کہتے تھے وہ آپ کا ہوں اب وہ عالم دیکھتا

اس دوسری مسلسل غزل کا مرکزی خیال بھی یہی ہے کہ لطف کا محبوب کسی کو اپنا دل دے بیٹھا ہے۔ لطف محبوب سے پوچھتے ہیں کہ کہیں آنسو پی جانے سے دل کا درد کم ہو سکتا ہے۔ آہ سرد کا باعث کیا ہے۔ تم سو سو بار بے چین ہو کر کہاں جاتے ہو۔ پھر لطف طنز کرتے ہیں کہ تم مجھے کہتے تھے کہ ضبط نالہ مجھ سے ہو نہیں سکتا اب تم ایک آہِ ضبط کر کے بتائیں۔ ؎

اڑا کیوں رنگ ہے چہرے کا یہ فرمائیے صاحب
گنوا بیٹھے کہیں دل بس نہ اب شرمائیے صاحب
کہیں آنسو کے پی جانے سے چھوٹ سکتا ہے دردِ دل
اس آہِ سرد کا باعث تو کچھ بتلائیے صاحب
یہ سو سو بار دن میں ایسے بیکل ہو کہاں جاتے
اِدھر تو آئیے صاحب اُدھر تو آئیے صاحب
مجھے کہتے تھے ضبط نالہ تجھ سے ہو نہیں سکتا
اب آپ اک آہ تو دیکھیں نہ لب تک لائیے صاحب
غضب ہو گا وہ اس آفت میں جس نے تجھ کو ڈالا ہے
ہمیں بھی اس بلائے جاں کو ٹک دکھلائیے صاحب
ہمیشہ لطف کو کہتے تھے اپنے دل کو سمجھا تو
ذرا اب آپ دل کو اپنے تو سمجھائیے صاحب

لطف کی ایک اور غزل ربط اور تسلسل کے علاوہ شعری محاسن اور اثرانگیزی کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔

کیوں کر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل
ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبشِ لب مشکل

اک آہ کے کرنے کو سو چاہئیں تمہیدیں
کیسے کہیں حالِ دل ہے آہ عجب مشکل

دو لاکھ بہانے ہوں تب رو لیجیے دو آنسو
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

ہے ضبطِ نفس سے یاں دل خوں ہوا پہلو میں
اے کوہ کن و مجنوں تھی تم پہ یہ کب مشکل

ہم بخت سیاہوں کو دن رات مساوی ہے
ہے شب سے تو مشکل روز اور روز سے شب مشکل

مر جائیں تو چھٹ جائیں اس روز کے مرنے سے
پر کیا کریں ہے یاں تو مرنے کا ہی ڈھب مشکل

کس طرح اسے ڈھونڈیں نائع ہے حیات اے لطف
اللہ کریں آسان ہے راہِ طلب مشکل

لطف کی اس غزل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غزل (غالباً) نئی زمین میں ہے کیوں کہ سودا اور میر کے پاس اس زمین میں کوئی غزل نہیں۔ غزل کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مطلع سے مقطع تک شاعر پر ایک جذبہ اور ایک ہی موڈ طاری ہے۔ اس غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مربوط ہے۔ اس میں شاعر کے دل کی واردات ہر کسی کے دل کی واردات معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کا تجربہ آفاقی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ غزل پڑھنے کے بعد ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں پہلے ہی سے ہمارے دل میں موجود ہیں اس پوری غزل میں کوئی تشبیہہ نہیں گل و بلبل، شراب و ساقی، دیر و کعبہ، واعظ و برہمن کا کہیں ذکر

نہیں سادہ الفاظ ہیں سادہ اظہار لیکن سادگی میں بلا کی پرکاری ہے اور پوری غزل اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

لطف کی غزلیں کیفیاتِ حسن و عشق سے معمور ہیں۔ یہاں شاعر کا ایک مخصوص انفرادی رنگ ہے حسن اور وارداتِ حسن کے اظہار میں وہ محاکاتی انداز اختیار کرتا ہے۔ اس سے کافر جنوں انگیزیوں کی ایک تصویر سی سامنے آجاتی ہے۔ ؎

غرورِ حسن وہ آفت حیائے عشق پہ قہر
غضب ہوا وہ اگر یوں ہی محوِ ناز رہا
چتون میں سو شرارتیں اور پشت پا بہ چشم
اس شوخ کی ہمیں تو خوش آئی حیا کی طرح

لطف کے عشق میں بڑا ہی ضبط و تحمل اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ ان کا عشق شرق کا روایتی عشق ہونے کے باوجود شکوہ طرازیوں کو پسند نہیں کرتا اس میں والہانہ انداز ہے۔ سپردگی ہے اور ساتھ ہی ایک قسم کا شرم و حجاب بھی ہے۔ وہ زبان پر محبت کا نام بھی لانا پسند نہیں کرتے صرف رمز و اشارے سے کام لینا چاہتے ہیں ؎

اے اہلِ محبت یہاں بھولے سے بھی ہرگز
لینا نہ خبردار کبھی نامِ محبت
از بس نہ ہوا ہم سے سر انجامِ محبت
شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبت

لطف کے نزدیک عشق وصال کا نام نہیں ہے بلکہ ہجر و فراق کی کیفیت کو وہ عشق سمجھتے ہیں۔ عشق کی آگ میں جلتے رہنا نقطۂ معراجِ عشق ہے۔ جب تک سینۂ سوزاں میں کسک درد اور تڑپ پیدا نہ ہو تب تک کوئی عشق کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔ زخمِ دل سینۂ عشاق پر جب تک ناسور نہیں بن جاتا اس وقت

تک عشق خام ہی رہتا ہے ؎

نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے
کہ ہر تارِ نفس جوں رشتہ شمع آج سوزاں ہے
وہ زخم دل آلودہ زنگار ہو یا رب
جو سینۂ عشاق پہ ناسور نہیں ہے
پروانہ سے شب کہتی تھی باسوزِ جگر شمع
لے لے کے مزا جل ذرا اے خامِ محبت

لطف کے نزدیک عشق زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی اس جذبے سے عاری ہو تو وہ ہر دو عالم سے بیگانہ ہے اور جو دل لذتِ عشق سے آشنا ہے وہ گویا لذتِ صد عالم سے بہرہ در ہو گیا اسی لئے لطف ایک نگاہِ ناز پر اپنا دل پیش کر دیتے ہیں۔ ؎

لے ہم سے اک نگاہ پہ گر وہ نگار دل
واللہ دل سے دیجئے بے اختیارِ دل
یک آشنائے با مزہ صد عالم آشنا است
بیگانہ دو جہاں سے ہیں آشنائے دل

لطف کے کلام میں عشقِ مجازی کے تصوّر سے عشقِ حقیقی کا تصوّر ابھرتا ہے اور اس جگہ وہ مسائل معرفت چھیڑ دیتے ہیں۔ عشقِ حقیقی کی راہ انتہائی کٹھن ہوتی ہے اور وہی جرأت و استقامت سے اس راہ پر چل سکتے ہیں جن کے ہاں حقیقی تڑپ ہو اور وہ صفاتِ باطنی و ظاہری کو سوچنے سمجھنے کا شعور رکھتے ہوں۔ یہ صرف عارفوں کا کام ہے نادانوں سے ممکن نہیں ہے۔

یہ راہِ عشق ہے نادان لباس اس کا ہے عریانی
پکڑتا برق کا دامن یہاں خارِ مغیلاں ہے

وفا سے دور ہو ظالم نہیں تو آہ اپنی بھی
حریم پردہ سوزِ عشق کی شمع شبستاں ہے

لطف کے ہاں جو تصوّف ہے وہ باقاعدہ فلسفے کی شکل میں نہیں ہے اسلئے اس میں ان رموز و نکات کی تشریح نہیں ملتی جو راہ سلوک کے منازل سے مخصوص ہیں اور نہ ہی وحدتِ الشہود اور وحدت الوجود کا کوئی سلک ملتا ہے بلکہ وہ سیدھے سادھے انداز میں اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں جو چشمِ بینا سے نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ؎

دیر و کعبہ شیخ و راہب کو مبارک ہوئے لطف
بندۂ درگاہ بندہ ہے دلِ آگاہ کا

یہی تو کفر ہے یارانِ بے خودی کے حضور
جو کفر و دیں کا مرے یار امتیاز رہا

کفر و دیں پروانہ مشرب جانے کیا وہ شعلہ رو
گاہ شمعِ کعبہ تھا گہ مشعلِ بُت خانہ تھا

کعبہ سے ہم نہ واقف نے بُت کدے سے آگاہ
یاں آستانِ دل ہے اور جبّہ سائیاں ہیں

اسی متصوفانہ رنگ میں وہ زندگی کے رموز و اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عارفانہ سوجھ بوجھ اور دروں بینی کے باعث انھیں حقیقتِ کائنات کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس عالمِ رنگ و بُو کے گرد کھینچے ہوئے حصار میں مقیّد پاتے ہوں۔ یہاں روح اور جسم کی وحدت کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور انسان کی ہستی مجبور ہو جاتی ہے ؎

اللہ رے قیدخانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ
ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے

جس دن اٹھایا خانۂ گردوں سے بسترا
دیکھو گے آسماں کا بنا گھر بگڑ گیا

آہ کیدھر کو چلے جاتے ہو تنہا
ہمرہو ہم بھی مسافر ہیں اسی منزل کے

لطف کے نزدیک عجز و انکسار اور خاکساری میں جو مزا ہے وہ امارت شان و شوکت اور جاہ و حشمت میں نہیں۔ وہ "نقوش بوریا" کو تخت جمشید سمجھتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

؎ خاکساری کا جو مزا سمجھے
تختِ جم نقش بوریا سمجھے

کیا بھلی کٹ گئی انھوں کی جو
مدّعا ترکِ مدّعا سمجھے

عبادت کا مقصد تسلیم و رضا ہے اس پر فخر و تعلّی کرنا انتہائی غیر مناسب بات ہے۔ لطف بعض جگہ اہلِ ظاہر کی عبادت کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو اپنی عبادت پر مغرور ہو گئے ہیں ؎

کتنے مغرور ہو عبادت پر
شیخ صاحب تمہیں خدا سمجھے

جلانا فرض ہے اے شیخ اس دلق ملمّع کا
نہ لے اک جام پر جس کو مغانِ ہمت آئین سا

شیخ، واعظ اور برہمن کے کردار بھی اردو شاعری میں روایاتی نوعیت کے

حامل ہیں ۔ شاعروں نے کہیں رند محتسب کا خاکہ اڑایا ہے تو کہیں شیخ و برہمن کے نظریاتی اختلاف کو ہدفِ ملامت بنایا ہے ۔ یہ لوگ اپنے اپنے عقائد کے نگہبان ہونے کے باوجود اپنے ظاہر و باطن کے فرق کی وجہ سے وہ مقام حاصل نہ کرسکے جو انھیں مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے حاصل ہونا چاہیے ۔ لطف نے بھی شیخ اور برہمن کا ذکر طنز پیرائے میں کیا ہے ۔ بعض مقامات پر تو طنز کی یہ نشتریت بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے

شیخ اور برہمن میں کیوں ہے عناد
ہم نہ مطلق یہ ماجرا سمجھے

تھی مریدوں کے لئے قلب کے صدمے کی دلیل
شیخ کا رقص میں سم پر جو وضو ٹوٹ گیا

مت لطف سے فریب کرائے شیخ روسیاہ
شاھین بھی ہوا ہے کہیں صید زاغ کا

شیخ کی سمرن شماری میں کوئی گرمی نہیں
چشمِ بینا ہو تو ظاہر ہے ہر اک دانے میں آگ

بیٹھ کر مسجد میں رندوں سے اتنا بگڑیئے
شیخ جی آتے ہو میخانے کی بھی اکثر طرف

اگر لطف کے اکثر کلام کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے وہ حرف و معنی کے ربط کا شعور و احساس بھی رکھتے ہیں اس ربط کو ظاہر کرنے میں لطف نے بڑے سلیقے اور احتیاط سے کام لیا ہے ۔ ان کے اسلوبِ بیان میں ندرت نہ ہی لیکن زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش میں ایک خاص دلکشی اور جاذبیت نظر آتی ہے انھوں نے معنی کے اظہار میں الفاظ کی رعایت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور بعض جگہ انتہائی سہل ترکیبیں وضع کی ہیں ۔ لطف کی زبان پر جہاں دہلی کی چھاپ نظر آتی

وہیں اس میں لکھنوی رنگ بھی جا بجا جھلکتا ہے۔ ان کا وہ کلام جو میر کے رنگ میں ہے زبانِ دہلی کی نمائندگی کرتا ہے جیسے جمع قوافی کا استعمال اور حرفِ ربط میں 'کسو کا' 'تجھ سے' 'کو وغیرہ کا استعمال۔ دہلوی زبان میں انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں فصاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اے ہم قفساں کوئی تو صیاد سے کہہ دو
مدت ہوئی حالِ چمن اب کچھ نہیں معلوم

ہم نہ کہتے تھے شریک مئے نہ کیجئے لطف کو
دیکھئے گا آگے یہ تو پہلا ہی پیمانہ تھا

تھا نہ جب تجھ کو کہانی سننے کا ہی امتیاز
گوش زد عالم کو میرا ان دنوں افسانہ تھا

ہوگئی زنجیر پا اپنی یہ زلفِ پُر شکن
ورنہ دل تجھ سے کو دینا کیا کوئی دیوانہ تھا

نہیں یہ شیشۂ مت اے محتسب مچا دھومیں
دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں

محاورہ اور روزمرہ بھی شعر کو اثر انگیز بناتے ہیں اور ان سے زبان کا چٹخارہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

بات پر اپنی آجا دیں تو سر پر پہاڑ اٹھا لیں لطف
سچ تو کہا یہ لوگ ہیں وہ بھی جن سے اٹھتی بات نہیں

آپ تو بات میں بگڑتے ہیں
واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم
کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں

زخمِ دل چاک جگر جیب جنوں دامن صبر
ہم نے عریاں بدنی پر بھی سیا کیا کیا کچھ

علمی اصطلاحات کی چند ترکیبیں ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہوں۔ ان ترکیبوں سے فارسی زبان پر لطف کی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
تو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں

سو المزاج کیوں نہ زمانے کو ہوے لطف
قانونِ دہر سے گئے یکسر شفا کی طرح

میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رو کے آگے
مہتاب رو کے منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

جہاں لطف نے لکھنوی زبان استعمال کی ہے وہاں وہی تصنع اور نزاکت ملتی ہے جو لکھنوی تہذیب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

اڑا کیوں رنگ ہے چہرے کا یہ فرمائیے صاحب
گنوا بیٹھے کہیں دل بس نہ اب شرمائیے صاحب

خرمنِ صبر کے اپنے تو ہوا برق وہ خال
مزرعۂ حسن میں کہنے کو جو اک دانہ تھا

شب آیا تو نصیحت کر کے افسونوں سے میں لیکن
گلی سے اس پری کے مثل سایہ بے خبر آیا

کسی شاعر کی کامیابی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے اشعار ضرب المثل ہو جائیں۔ لطف کے دیوان میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو اپنے اندر ضرب المثل بن جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

واہ رے کیفیتِ چشم اُس کے دیوانے ہیں ہم
آنکھ بھر کر جس طرف دیکھا وہ پیمانہ تھا

ہو نہ اودھر سے کشش تو ہم ضعیفوں سے ہو کیا
کہربا کے ساتھ وابستہ ہے جلوہ گاہ کیا

ہم نہ کہتے تھے شریک مئے نہ کیجئے لطف کو
دیکھئے گا آگے یہ تو پہلا ہی پیمانہ تھا

مت لطف سے فریب کرا اے شیخ روسیاہ
شاہین بھی ہوا کہیں صید زاغ کا

آج بے لطفیٔ صحبت کا گلہ کرتا ہے لطف
کل نہ سمجھا یار سو سو ڈھب سے سمجھاتے رہے

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اس خانماں آباد کا شکوا

خانماں برباد کی ترکیب تو عام ہے لطف کے اس شعر میں خانماں آباد کی ترکیب میں بلا کا طنز ہے

کیوں لطف میاں جیتے ہو بن یار کے دیکھے
اے ننگِ محبت تو نہ لے نامِ محبت

بیگانوں نے کبھی نہ وہ کانوں سنائی بات
افسوس آشنا نے جو آنکھوں دکھائی بات

گر اک نگاہ پہ سمجھے گراں تو خوش رہیے
گرا پڑا نہیں ایسا یہاں کسی کا دل

دو لاکھ بہانے ہوں تب روئیے دو آنسو
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

ہو رقیب مردہ شو پروہ نہ کیوں روشن بیان
یاں چراغ گور و شمع انجمن دونوں ہیں ایک

ہے اپنے خوں کا پیاسا خار خار گلشن اے بلبل
کوئی یاں آشیاں پھر کس توقع پر بھلا باندھے

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
ان سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی

ایہام:۔

اے خضر راہِ گمشدگاں، وقتِ لطف ہے
آگے گئے ہیں یار میں پیچھے ہوں رہ گیا

اس شعر میں پہلے مصرعے میں لطف شاعر کا تخلص بھی ہے اور کرم کرنے کے معنوں میں بھی یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رو کے آگے
مہتاب رو کے منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

دوسرے مصرعے میں مہتاب بمعنی آتشبازی اور چاند۔ ہوائیاں چھٹنا بمعنی آتشبازی اور چہرے کا رنگ فق ہونا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں محاکات نگاری کی عمدہ مثال لطف کا یہ شعر ہے۔

؎ چتوں میں سو شرارتیں اور پشت پا یہ چشم
اس شوخ کی ہمیں تو خوش آئی حیا کی طرح

تمثیل :- غبار بیکسی سے کیا غرض پاکیزہ جوہر کو
کہ بخشے ہے جلا گرد یتیمی آب گوہر کو

فزوں غربت میں خوش طینت کا ہو وقر
صدف میں ہی نہیں دیکھو گہر بند

مبالغہ :- لچکتی ہے کمر اس نازنیں کی
کرے گر رشتۂ جاں سے کمر بند

لطف کے کلام میں چاہے وہ مثنوی ہو یا غزل وہ ابتذال اور سوقیانہ پن نہیں ملتا جو دبستانِ لکھنو کے شاعروں سے مخصوص ہے غزل کے پورے دیوان میں صرف دو شعر ایسے ہیں جن پر بظاہر ابتذال کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

اپنا تو بد گمانی میں بس کام ہو گیا
گو اور طرح اس کی ہو چولی مسک گئی

لیکن معنوی اعتبار سے شعر کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا یہاں چولی کے مسک جانے میں کوئی عریانیت یا ابتذال نہیں ہے۔ ہم کو پروفیسر وحید الدین سلیم جیسے شاعر کے پاس جن کو اصلاحی دور کا شاعر کہنا چاہیے اس قسم کی مثال ملتی ہے ؎

جب جیلانِ تخیل کا ہے چڑھتا جوبن
چولیاں جامۂ لفظی کی مسک جاتی ہیں

محبوب کے لباس کے ذکر سے ابتذال کی بجائے یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لطف کا محبوب صنفِ نازک سے ہے۔ لطف کے ان اشعار سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے ؎

تم نے دکھلائی وہاں پیٹھ اور چوٹی کی پھبن
یاں میری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں
خورشید کی بھی آنکھ پلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اس کی سرک گئی
مرتا ہوں ہوا داریٔ مشّاطہ پہ میں تو
برقع میں وہ کب مہرِ درخشاں چھپے گا

دوسرا شعر جس میں ابتذال پایا جاتا ہے ؎

دو کوہِ سیم آویزاں ترے موئے کمر سے ہیں
بل اپنا کیا ہی دکھلایا ہے کم زوروں کے زوروں نے

لیکن اس شعر کا ابتذال بھی جو نہ ہونے کے برابر ہے لائق درگذر ہے کیوں کہ "کوہ سیم" کسی عضو کا نام نہیں ہے بلکہ ایک استعارہ ہے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ لطف نے ہندی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال کئے ہیں اور بعض جگہ ہندی کے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جس کی صنف غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ ؎

دیکھنا تارِ محبت کہ ہے مشکل پھر سانٹھ
رشتۂ دوستی اے شوخ کبھو ٹوٹ گیا

لطف نے تکرارِ الفاظ کے صوتی حسن سے بھی اکثر جگہ فائدہ اٹھایا ہے۔ شعر میں لفظ کی بار بار تکرار سے جو صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے وہ سامع پر ایک خاص انداز میں اثرانداز ہوتا ہے۔ اس صوتی کیفیت کا اظہار ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

جلا ہوں رات عجب بے کسی کے عالم میں
کہ بے کسی پہ جلا میری بے کسی کا دل

گو جان سے گئے ہم تو نہیں جان کا کچھ غم

صد شکر نہیں خاطر جاناں سے گئے ہم

خمریات، غزل کا ایک اہم موضوع ہے اس میں رندی بھی ملتی ہے اور سرمستی بھی جام و سبو بھی چھلکتے ہیں قلقلِ مینا بھی بلند ہوتی ہے محتسب اور زاہد کا دامن بھی آلودہ ہو جاتا ہے لطف کے ہاں خمریات کے مضامین کم ہیں لیکن جو بھی ہیں وہ طنز کی بھرپور نشتریت رکھتے ہیں۔ سہ

محتسب نے تو خرابات میں کی خونریزی

پر سرِ رند پہ شب مئے کا کدو ٹوٹ گیا

سنتے ہیں کی محتسب نے بیعت دستِ سبو

مژدہ مئے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے

واہ رے کیفیت چشم اس کے دلواتے ہیں ہم

آنکھ بھر کر جس طرف دیکھا تو پیمانہ نہ ہوا

نہیں یہ شیشۂ مئے اے محتسب چھپا دھوئیں

دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں

چھلکتا عمر کا ایک دم میں پیمانہ ہے اے ساقی

دغا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

بحیثیت مجموعی لطف کا تغزل بیک وقت دو دبستانوں کا نمائندہ ہے۔ اور اس میں وہ ساری خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں جو دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں اگر لطف کی غزل کو دو تہذیبوں کا سنگم قرار دیا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ میر کے بارے میں شیفتہ نے تبصرہ کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" اس کا اطلاق لطف پر بھی ہو سکتا ہے

انتخابِ کلام

چونکہ لطف کا دیوان شایع نہیں ہوا ہے اس لئے ذیل میں لطف کی غزلوں کے منتخبہ اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں اس سے ان کی غزل گوئی کے عام رنگ کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

کیا ہی لہراتا ہے دل کیفیتِ مجنوں کی سن
تھا تو دیوانہ عجب عالم کا پر دیوانہ تھا

سنتے تھے طوفانِ نوح آنکھوں سے دیکھا وہ تو لطف
دیکھیئے یہ چشمِ گریاں اور اب دکھلائیں کیا

کچھ خبر ہے تجھے کہتے ہیں ترے زخمی کا
آج پھر چاک کا سینے کے رفو ٹوٹ گیا

کل ہی مقدور نہ تھا درد سے دم لینے کا
لطف پھر آج تیرا قصد ہے دل دینے کا

خدا ہی جانے رہا یا نہ رہا امتیاز رہا
اودھر تو ناز رہا اور اِدھر نیاز رہا

چمن کو کل جو تری مئے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہوئے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

نہ آنکھ بھر کے کبھی ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

کہاں پھنسا دیا دل لطف تو نے ہے ظالم
امان مانگتا جس سے کہ ایک جہان رہا

کشورِ دل تو سدا کا نہیں ویرانہ تھا
یہ خرابہ بھی کسی وقت پری خانہ تھا

خرمنِ صبر کے اپنے تو ہوا برق وخال
مزرعۂ حُسن میں کہنے کو جو اک دانہ تھا

اگر ہو تنگ دلی پر برنگ غنچہ صبور
گرہ سے ہو تیرا آپ ہی گرہ کشا پیدا

کیا جو میرا سا نالہ تو کیا تکلف ہے
میرا سا سرو تو قمری کرے بھلا پیدا

کہیں تو قافلہ ٹھہرا ہے سینہ چاکوں کا
نہیں ہے اب جرسِ دل کی کچھ صدا پیدا

غنیمت اے ستم ایجاد آج لطف کو جان
کہ ایسے گم شدہ ہوتے ہیں پھر کہاں پیدا

ساقی لگا دے خُم مرے منہ سے کہ یار بار
احسان کون کھینچے سبو اور ایاغ کا

ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتی ہے
ہر اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

ایک دن حالِ دل زار نہ دیکھا نہ سنا
سچ یہ تجھ سا ہے دل آزار نہ دیکھا نہ سنا

دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

سرشک آتا تھا ہمدم کل تلک آہ رنگیں سا
گریباں آج لختِ دل سے ہے دامانِ گلچیں سا

دکھا دیں بے ستونِ چرخ کا عالم تجھے فرہاد
جو مل جاوے ہمیں بھی کار فرما کوئی شیریں سا

میرے گمان میں جو تھا سروِ گلشن لیلیٰ
ذرا جو غور کیا صاف تشنۂ خوں تھا

فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال
کس منہ سے اسے بھیجئے پیغام محبت

کیا سرگذشت اپنی لکھیں تجھ کو ہم ہیں اور
موج سرشک و دیدہ گریبان و آستین

مژگاں کا خونِ دل سے جو عالم ہے کچھ نہ پوچھ
ہے اتحاد پنجۂ مرجان و آستین

دوست کرتے ہیں دشمنی مجھ سے
دستِ قاتل عبث پکڑتے ہیں

اللہ رے وفورِ تحیر کہ اہل دید
کوچے میں اس کے بیٹھ گئے نقش پا کی طرح

فصلِ گل ہے لطف اور بیکار ہیں طفلانِ شہر
کیا تھی ایک بار دیوانوں سے ویرانے ہوئے
پلکیں وہ نکیلی کہ نظر جب پڑے ان پر
سینے میں یہ عالم ہو کلیجے کا کہ چھن جائے
واہ رے ہمت، سفالِ کہنہ جائے جام ہے
یہ بساط اور ننگ نسبت ہم چشمی جم سے رہا
ہم اور فرہاد بحرِ عشق میں باہم ہی کودے تھے
جو اس کے سر سے گزرا آب میرے تا کمر آیا
مانا کہ قلبِ یار ہے آہن یہ جذبِ عشق
کامل ہو گر تو کھینچ لے آہن ربا کی طرح
کیا کم ہے سلطنت سے سگ کوئے یار اگر
قانع ہو استخواں یہ ہماری ہما کی طرح
اوس کے جلے ہوؤں کی یہ تربت کا ہے نشاں
جلتا ہے واں بجائے چراغِ مزار دل
دیوے گا زیرِ خاک بھی آرام خاک لطف
پہلو میں یوں ہی گر رہا یہ بے قرار دل
تجھ کو بس اک نگاہ یہ دیویں جو لیوے تو
ہر چند دو جہاں بھی نہیں ہے بہائے دل
شعلۂ شمعِ حرم حُسنِ بتاں سے ہے خجل
مجھ کو خطرہ ہے کہ لگ جائے نہ بت خانے میں آگ

طاقت حباب ساں اک نظارے کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں
آج کیا جانئے وہ کیوں آرام جاں آیا نہیں
حرفِ رنجش کل تو کوئی درمیاں آیا نہیں
بس غم یار اب نبیڑ جلدی
نہیں تو یار ہم نبڑتے ہیں
کچھ تو ہے اس خزانے میں کہ بتاں
نقدِ جاں چھوڑ دل پہ اڑتے ہیں
آہ یہ طرفہ تر ہے صیادی
مرغِ بسمل کے پر جکڑتے ہیں
دھیان ہے آرائش زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
چھین کر باتوں میں دل کو لطف سے وہ بت بنے
یاد رکھنا غیر کی کرنا وہاں دل داریاں
کتنا آزاد ہے اس قیدِ تعلق کے ساتھ
سچ کہوں وضع بہت لطف کی بھائی مجھ کو
ہے مگر وادئ مجنوں کا پیاسا کوئی خار
کھینچتی ہے جو ادھر آبلہ پائی مجھکو
چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے اے ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

کھینچ کرے ہی چلی آج تو بے تابیٔ دل
اس کی محفل میں ہمیں دیکھئے کیا بنتی ہے

یہ ہنر بھی تمہیں معلوم ہے اے شیشہ گراں
کوئی خاطر بھی جو ٹوٹے تو بھلا بنتی ہے

سوادِ خطِ یک رنگی ہو تو ہے حسن و عشق ایک ہی
یہاں ہے خاطرِ برہم وہاں زلفِ پریشاں ہے

دل اک عالم کا اوس کے ہاتھ سے بے ساختہ خوں ہے
قیامت ہو اگر ہاتھوں میں وہ اپنے حنا باندھے

نہ ہو دل تنگ غنچہ کے دھن تنگی کے دعوے سے
سخن ایسے پریشاں کا گرہ میں کیا کوئی باندھے

ہے اپنے خوں کا پیاسا خار خار گلشن اے بلبل
کوئی یاں آشیاں پھر کس توقع پر بھلا باندھے

یارانِ پیش رو ذرا ٹھہرو جیوں جرس
ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے

کیا دن تھے وہ بھی لطف کے رہتے تھے مثل زلف
کانوں سے اس کے ہم سے پریشاں لگے ہوئے

نالوں نے میرے شقفِ فلک کو ہلا دیا
آواز اس پہ بھی نہ ترے کان تک گئی

نالے کا آگے لطف کے دعویٰ ہے عندلیب
بس اے زباں دراز تو اتنی بہک گئی

تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیاء اس چراغ سے

اس گل بدن بغیر ہمیں صبح باغ میں
صورتِ ہزار کم نہیں فریاد زاغ سے

گر جام واژگون فلک ہے یہی تو لطف
اپنے نصیب کیوں ہیں یہ درد اس ایاغ سے

نہ ناز کیجئے وارستہ خاطروں کے ساتھ
کدھر آپ خریدار کون آپ کا ہے

مسیحا اپنا ہے اک اور وہی لب جاں بخش
خدا کے فضل سے بیمار کون آپ کا ہے

تنگ ہے وحشت پہ اپنی وسعتِ ارض و سما
نت پھڑک کر اس قفس میں سر ہی ٹکراتے رہے

گردشِ چشمِ بتاں کہ بسکہ ساغر نوش ہے
گردشِ گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی

بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے
خود بخود کچھ وہ کھنچے اودھر ادھر ہم رک گئے

اِدھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اتنی ہوئی جدائی
بڑھائی تھوڑی سی جب اِدھر سے بہت سی تم نے اُدھر گھٹائی

ہوا آوارۂ ہند ہے کہاں لطف اب خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

لطف کی قصیدہ نگاری

لطف نے تمام اہم اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جب وہ حیدرآباد میں تھے تب نواب ارسطوجاہ اور میر عالم کے درباروں سے وابستگی نے انھیں قصیدہ نگاری کی طرف مائل کیا اور اس صنف میں بھی انھوں نے کمالِ فن کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

لطف نے کل پانچ قصائد کہے ہیں۔ چار قصائد میر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کے وزیر اعظم الامرا، دیوانِ دکن کی مدح میں اور ایک قصیدہ میر عالم دیوانِ دکن کی مدح میں ہے۔ گلشنِ ہند کے مطبوعہ نسخوں میں یہ قصائد موجود نہیں۔ مخطوطۂ دیوانِ لطف اور گلشنِ ہند کے قلمی نسخوں میں لطف کے یہ قصائد موجود ہیں۔

کلکتہ سے دکن آنے کے بعد لطف ارسطوجاہ کے دربار سے متوسل ہو گئے تھے ارسطوجاہ نے انھیں مصاحبین میں شامل کر کے ڈیڑھ سو روپئے ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ ارسطوجاہ کی مدح میں جو پہلا قصیدہ لکھا گیا ہے وہ ۱۰۱ شعر کا ہے۔ قصیدے کے چوتھے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ارسطوجاہ کو اعظم الامرا کا خطاب ملنے کی تہنیت میں کہا ہے۔

ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ لطمہ خوار
عمانِ مدح کا ترے پیدا نہیں کنار
نظارۂ علوئے مراتب میں سایہ سان
ہیں سر پہ پا بلند فراشانِ روزگار

زینے شمار کب ہوں ترے اوج قدر کے
ہے اوّل قدم یہاں ختم آخر شمار
حاشا کے اعظم الاُمرا کے خطاب سے
ہوا ہے چراغِ چشم کیاں تجھکو افتخار
کیوں کر کے مائدہ یہ صنادید کے ترے
کتنے ہی اعظم الوزرا ہوں گے ریزہ خوار

پانچویں شعر میں کہا گیا ہے کہ تیرے بزرگوں کے دستر خوان پر کتنے ہی اعظم الامرا ریزہ خوار ہوں گے۔ اسلئے اعظم الامرا کا خطاب ہرگز تیرے لئے باعث افتخار نہیں۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۹۷ بتائی ہے جس کے دو مطلع ہیں[۱]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ ۱۰۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں تین مطلع ہیں۔

پہلا مطلع ؎ ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ لطمہ خوار
عمان مدح کا ترے پیدا نہیں کنار

دوسرا مطلع ؎ بخشش نے تیری رشکِ بیاباں کئے بحار
ہمت سے تیری غیرت دریا ہے کوہسار

تیسرا مطلع ؎ اے ذرّہ ہا زنامِ تو خورشید اعتبار
تاثیر اسمِ اعظم از اسمِ تو آشکار

اس قصیدے میں میں تشبیب ہے نہ مدح غائبانہ۔

پہلے ہی شعر سے ممدوح کو مخاطب کر کے مدح کی گئی ہے ؎
ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ لطمہ خوار
عمانِ مدح کا ترے پیدا نہیں کنار

---

[۱] مثنوی لطف، (حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۳۲

مدح کو عمّان سے تشبیہ دی ہے اور قصیدے میں جا بجا اسی رعایت سے الفاظ کنار، بحر، سیل، قطرہ، موج، کشتی وغیرہ لائے گئے ہیں۔ لطف نے قصیدے میں غالب کی طرح :۔

(میری تنخواہ میں تہائی کا ٭ ہوگیا ہے شریک ساہوکار) تنخواہ کی کمی کا رونا رویا ہے۔ غالب کی یک تہائی تنخواہ اگر ساہوکار کی نذر ہو جاتی تھی تو لطف نے کہا ہے کہ ان کی یک تہائی تنخواہ ڈولی اٹھانے والے کہار لے لیتے ہیں۔

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے اے امیرِ فلک قدر ذی تبار
سرکار سے ہے تیری جو راہِ تفضّلات
ہے ڈیڑھ سو روپئے تیرے خادم کا ماہوار
ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار
بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیرِ بار
باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں پہ ہے
مثلِ مجردات فقط ان کا ہے شمار
پیزار اک جو لوں سرِ دشمن کے واسطے
بیزار جی سے ہوں تو نہیں بنتا پھر ازار

اس قصیدے میں لطف نے تعلّی کرتے ہوئے اپنے آپ کو ناصر علی

سرہندی پر ترجیح دی ہے اور استدلال یہ پیش کیا ہے کہ ناصر علی کے اشعار اہل معنی کی گرفت یعنی اعتراض سے نہ بچ سکے لیکن میرے اشعار پر اگر حاسد بھولے سے بھی انگلی رکھے تو پھر اپنی اس حرکت پر مارے ندامت کے وہ اپنی انگلی کاٹ لے گا۔ ؎

ناصر علی وقت کہوں گر میں آپ کو
اس کا مجھے بجانِ سخن گر ہو افتخار
کیوں کر کہ اس کے جادۂ افکار کا جگر
اکثر گرفتِ اہل معانی سے ہے فگار
اور طبع زاد پر میرے گر سہو سے حسود
انگلی لگے تو کاٹے بہ دندانِ انحصار

لطف نے یہ قصیدہ ناصر علی سرہندی ہی کی زمین میں لکھا اور ناصر علی کے قصیدے کا یہ مشہور مطلع جو ذوالفقار خاں کی مدح میں کیا گیا تھا اپنے قصیدے میں پیش کرتے ہوئے اس کے جواب میں خود بھی مطلع کہا ہے

ناصر علی کا مطلع ؎

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

لطف کا مطلع ؎

اے ذرہ ہا زنامِ تو خورشید اعتبار
تاثیر اسم اعظم از اسمِ تو آشکار

ناصر علی نے اگر ذوالفقار خاں کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مضمون کی بنیاد "ذوالفقار" پر رکھی ہے تو لطف نے بھی اعظم الامراء کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "اسم اعظم" کہہ کر ناصر علی کی ٹکر کا مطلع پیش کیا ہے۔ لطف نے ناصر علی کا مطلع نقل کرتے

دوسرے شعر میں بڑے ہی شاعرانہ انداز میں ناصر علی کے مطلع کی اہمیت کو اس طرح گھٹایا ہے

جُز لفظ ذوالفقار نہیں کوئی اس میں بات
ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار

اس قصیدے میں تشبیب اور گریز وغیرہ نہیں اس کے باوجود یہ قصیدہ لطف کے قصائد میں گلِ سرسبد ہے۔ اس قصیدے میں پُرلطف ضایع بدائع بھی ہیں اور شگفتہ تشبیہات بھی۔ حافظ شیرازی نے اپنی غزل میں "کنارِ آبِ رکناباد" اور "گلگشتِ مصلّیٰ" کا ذکر کیا ہے ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نہ خواہی یافت
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلّیٰ را

لیکن حافظ اور غالباً کسی دوسرے فارسی شاعر نے بھی گلگشتِ سبز وار نہیں باندھا۔ "سیر بیاضِ شعر کی" "گلگشتِ سبز وار" سے تشبیہ میں ندرت اور تازگی ہے۔

کُنجِ خمول کو میں سمجھتا ہوں خانہ باغ
"سیر بیاضِ شعر" کو "گلگشتِ سبز وار"

اس قصیدے کے بعض اشعار میں جو مبالغہ کیا گیا ہے وہ کہیں کہیں حدِ اعتدال سے زیادہ ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔

دب کر ترے زمانے میں ہر اک ضعیف سے
دار و مدار گر نہ کرے چرخِ بے مدار
قطرے کی طرح جھڑ پڑیں انجم بہ روئے خاک
ایسا ہی دستِ قہر ترا دے اوسے فشار
خاطر پہ کاہ کے جو ذرا بار ہووے کوہ
کر ڈالے تیرا شحنۂ عدل اوس کو سنگسار

سرگرم رقص بہر خوش آمد ہو مثلِ خرس
ہو جائے گرگ میش سے سہواً اگر دوچار
جوں جوں مردہ خشک رگِ سنگ میں ہو آگ
دیکھے نگاہِ گرم سے پنبہ کو گر شرار

کہتے ہیں تیرے (ارسطو جاہ) زمانے میں چرخِ بے مدار ہر ایک ضعیف سے دب کر اس کی خاطر مدارات نہ کرے تو تیرا دستِ قہر اس کو (آسماں کو) ایسا فشار دے کہ ستارے قطروں کی طرح زمین پر ٹپک جائیں ۔ اگر تنکے کے دل پر پہاڑ بار معلوم ہو تو تیرے عدل کا کوتوال پہاڑ کو سنگسار کر دے گا ۔ اگر بھیڑیا بھولے سے کسی بکری کے مقابل ہو جائے تو (تیرے عدل سے گھبرا کر) بکری کے آگے از راہِ خوشامد خرس کی طرح ناچنے لگے ۔ اگر " شرارِ نگاہِ گرم " روی کو دیکھ لے تو پتھر کی رگ میں آگ خونِ مردہ کی طرح خشک ہو جائے ۔ یہ مبالغہ دیکھئے ۔

ہووے اگر تو گرم تماشا بچشمِ فیض
سرسبز نارون سا ہو گلریز کا انار

تو اگر چشمِ فیض سے دیکھے تو آتشبازی کا انار نارون کی طرح سرسبز ہو جائے شعر میں لفظ " نارون " کا استعمال بھی بہت ہی معنی خیز ہے اور صنعت ایہام کی ایک بہت ہی اچھی مثال ہے ۔ بظاہر تو " نارون " بہ معنی انار ہے ۔ لیکن اس لفظ میں آتش بازی کے انار کی مناسبت سے " نار " یعنی آگ موجود ہے (نار + ون) اس لفظ کے دوسرے معنے آگ کا جنگل بھی نکلتے ہیں ۔ کیوں کہ سنسکرت میں " ب " تلفظ میں " و " بدل جاتا ہے اس لحاظ " بن " اور " ون " دونوں لفظ جنگل کے لئے مستعمل ہیں ۔

مبالغے کی انتہا دیکھئے ؎

روزِ وغا ہیب سے تیرے صفِ عدو
برہم ہو بادِ تند سے جوں مور کی قطار

جنگ کے دن تیری آواز سے لشکرِ دشمن اس طرح منتشر ہو جاتے جیسے طوفانی ہوا سے چیونٹیوں کی قطار درہم برہم ہو جاتی ہے۔

یہ مبالغہ دیکھئے کس قدر دلچسپ ہے ؎

حافظ ہو جس کی غارِ ہلاکت میں تیری حفظ
ہوں نسجِ عنکبوت اسے آہنی حصار

غارِ ہلاکت میں اگر تو کسی کا حافظ ہو تو مکڑی کا جالا بھی اس کے لئے لوہے کا حصار بن جائے۔

تلوار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

کیا خاک پھر بجھے لبِ زخمِ عدو کی پیاس
تر آبِ شور سے تری تلوار کی ہے دھار
قہرِ خدا ہے خود یہ دشمن کہ تیری تیغ
ٹھہری ہے کب وہ کر کے کمرگاہ سے گزار
یوں پشتِ زیں سے بہہ کے نکل آئے زیرِ تنگ
کہتے ہیں جوں عوام کہ صابن میں جیسے تار
تنہا نہ فرقِ مغفریٔ اوس پاس ہے کدو
بازوئے مدعی کو بھی سمجھے (ہے) ایک خیار
زخمِ حمائلی سے گلے میں حریف کے
زیرِ کمر ہی اترا ہے جو اس نے ڈالا ہار

پھڑکے گا اپنے خوں میں کیا خاک اس کا صید
اک سانس لے سکا نہیں جس کا کبھی شکار
تھا گر حریف اس کا پیادہ تو دو ہوا
اور چار پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

گھوڑے کی تعریف :-

ہے زیرِ ران تیرے جو دیو پری جمال
کحلِ ضیائے چشمِ صبا جس کا ہے غبار
کہتا ہے یوں نسیم سے ہنگامِ جست وخیز
ٹھوکر سے بچ سکے گا نہ مفلوج رعشہ دار
گاہے سبک عنانی ہے دریا پہ جوں حباب
وقتے گراں رکابی ہے آتش میں جوں شرار
آہن سم ایسا سنگ کے سطح پہ وقتِ جست
پرکار وار نقش کرے دائرے ہزار
رنگِ حنا میں دے ہے عرق یوں کفل پہ زیب
خوں کردہ جیسے عارضِ خوبانِ گل عذار
چھو جائے گر ہوا تک اس آتشِ مزاج کو
مشکل ہے پھر کہ لے کرۂ خاک پر قرار
آباد اس کا خانۂ زیں تجھ سے نت رہے
راکب کو ایسے چاہیئے ایسا ہی راہوار

کہتے ہیں کہ ارسطو جاہ کے آتش مزاج گھوڑے کو ہوا چھولے تو پھر کرۂ خاکی پر ہوا کا ٹھہرنا محال ہے۔ مبالغے کے قطع نظر اس شعر میں طبعیات کا یہ تجربہ بھی ہے۔

کہ ہوا کو گرم کرنے سے وہ پوری طاقت کے ساتھ پھیل جاتی ہے۔

چھو جائے گر ہوا تک اس آتش مزاج کو
مشکل ہے پھر کہ رے کرۂ خاک پر قرار

جس طرح غالب نے فنِ سپہ گری کو اپنے لئے وجہ نازش قرار دیا ہے اور شاعری کو اپنے لئے باعثِ عزت نہیں سمجھا ہے:۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اسی طرح لطف نے بھی فنِ سپہ گری پر ناز کیا ہے۔

کیوں کر کہ شاعری مری میراث کچھ نہیں
نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار
فنِ سپہ گری میں وہ ہے کسب کونسا
جو جانتا نہیں میں بتائید کردگار
پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب
کھُل جائے گا وہ تجھ پہ کسی روز وقتِ کار

یہ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح غالب نے اپنے قصیدے میں جو بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں کہا گیا ہے حسنِ طلب سے کام دیتے ہوئے تنخواہ میں اضافہ اور ماہ بماہ ایصال کرنے کی استدعا کی ہے:۔

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ ٭ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اسی طرح لطف نے بھی حُسنِ طلب سے کام لیتے ہوئے بڑے پُرلطف انداز میں اضافہ تنخواہ کی خواہش کی ہے۔

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض

سو یہ ہے اے امیرِ فلک قدر، ذی تبار

سرکار سے ہے تیری جو راہِ تفضلات

ہے ڈیڑھ سو روپئے تیرے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں

جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے

ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی

میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں یہ ہے

مثل مجردات فقط ان کا ہے شمار

پیزار اک جو لوں سرِ دشمن کے واسطے

بیزار جی سے ہوں تو نہیں بنتا پھر ازار

ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے

بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام

کافر ہوں سو پچاس میں جو ہو کشودِ کار

تضعیفِ اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف

کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں میرے تین سو
چھ سو جب امیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

لطف کا دوسرا قصیدہ لامیہ ہے۔ جو نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کہا گیا ہے اس قصیدے کے دو مطلع ہیں اور ۷۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ سیاقِ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ عید کے موقعہ پر پیش کیا گیا ہے۔ اس قصیدے میں بطورِ تشبیب چھ شعر کہنے کے بعد بہت ہی خوبصورتی سے گریز کیا گیا ہے۔

تھی جو مرغِ فکر کو منقارِ حسرت زیرِ بال
چہچہے ہیں آج واہے عید کا جیسے ہلال
نغمہ پردازی میں ہے سرگرم اس انداز سے
جس کے آگے ناطقہ ہو مرغِ خوش الحان کالال
ہر نوائے نغمہ پرور تہنیت آہنگ ہے
ہر صدائے زمزمہ گستر ہے اک فرخندہ فال
دیکھ اس خوش لہجگی کے ساتھ سرمستِ نشاط
باعث تفریح خاطر کا کیا میں نے سوال
بلبلِ مینا ہنس کے میری سرگرانی پر کہا
پنبۂ افسردگی گوشِ غفلت سے نکال
آج لبریزِ طرب ہے اک جہاں ساغر کی شکل
قہقہہ ہے ایک عالم میں صراحی کی مثال
جلوہ فرما ہے ارسطو جاہ بہرِ نذرِ عید
چار بالش پر وزارت کی بصد جاہ و جلال

ایک شعر کی گریز کے بعد ہی مدح شروع کی گئی ہے اس قصیدے میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کے ساتھ ساتھ ہاتھی کی بھی مدح کی گئی ہے۔

خیرہ کردے برق ساں چشم عدوے خیرہ رائے
وہ تجلّی آفریں ہے تیری تیغ مہ صقال
کیوں نہ روشن دل ہو جوں خورشید وہ آئینہ تن
خونِ اعدا سے میسّر ہے اسے اکلِ حلال

گھوڑے کی تعریف :-

بس کہ ہے اک خرمنِ گل سر سے لیکر پاؤں تک
ہے نسیم صبح سی مانا ترے گل گوں کی چال
پر وہ رشک نکہتِ گل وہ تو ہم جلوہ رہی
جو دے ہے بادِ صبا جس کی رکاب انتشال
اچپلاہٹ اس کی مشکل سوجھتی معشوق کو
رنگِ عاشق کو سبک پردازیاں اسکی محال
معرکہ میں خوں سے اعدا کے ہنگام نشیب،
کردے رشکِ گلشن فردوس میدانِ قتال

ہاتھی کی تعریف :-

وصف بیل کوہ پیکر کا ترے کسب ہو کہ یاں
خامہ رکھتا ہے قدم مثلِ سیہ مستاں سنبھال
ابرِ رحمت ہے یہ مجنوں کو وہ گردوں منزلت
اور اعدائے سیاہ دل کے لئے ہے جنگا کال

جان پر دشمن کے ٹوٹے آسماں جب اسکو دیکھ
کیوں نہ مثلِ سبزہ رہ پھر ہو اس کا پائمال
اس شکوہ و شان پر دلکش ہے ظالم اس قدر
ہے بجا گر اس کو رخسارِ بتاں کا کہئے خال
ہے سبک رَو مثل آب جلد دَو ہے مثلِ باد
گرم خوں مانند آتش ہے وہ کوہِ اعتدال

لطف نے اس قصیدے کو دعا پر ختم کیا ہے اور دعائیہ اشعار میں ندرت پیدا کی ہے :-

مدح کو اے لطف بس تو اب دعا سے کر بدل
کیوں کہ مدت سے اجابت کو ہے شوق اتصال
صفحۂ گیتی پہ جب تک مہر کو ہے عشق نور
اور جس دن تک شہ ہے مہ کو لازمی شکل ہلال
نیّر اقبال کو تیرے رہے عشق عروج
کوکبِ اعدا کو لازم ہو سدا اوجِ زوال

آخری شعر میں " اوجِ زوال " کی ترکیب اکبر الٰہ آبادی کی ترکیب "ترقی معکوس" کی طرح نہایت ہی پر لطف ہے۔

لطف کا تیسرا قصیدہ بھی نواب ارسطو جاہ کی مدح میں ہے۔
یہ قصیدہ کیوان جاہ متبنّیٰ ارسطو جاہ کی تسمیہ خوانی کے موقع پر کہا گیا ہے۔ یہ قصیدہ بغیر مطلع کے ہے۔ بہت ہی دلچسپ تشبیب کے بعد آٹھویں شعر میں کیوان جاہ کا نام لیتے ہوئے تشبیب سے مدح کی جانب گریز کی گئی ہے۔ یہ ۲۵ شعر کا قصیدہ ہے نہ جانے لطف نے کیوں اس قصیدے کو مطلع سے محروم رکھا۔ اس کی تشبیب نہایت

مربوط، بحر مترنم اور اشعار رواں ہیں تشبیب میں استفسار اور جواب کی طرز ہے۔

جب بخورِ عنبرِ عیش و صدائے عودِ جشن
مل کے دونوں نے بہم تا عرشِ اعظم راہ کی
چرخِ ہفتم پر ہوا کیوں ان کا عطر آگیں دماغ
فرطِ حیرت سے اشارت اس نے سوئے ماہ کی
یعنی اے مسند نشینِ چرخِ اوّل دہر میں
محفلِ دنیا کی تو نے سیر خاطر خواہ کی
کہہ تو کس دولت سرا میں ہیں یہ بزم آرائیاں
رشکِ جنت جس کی نکہت ہے ترے خرگاہ کی
ماہ نے سُن کر کہا اس بزم کا کس سے ہو ذکر
ہاں مگر اتنا کہ وہ محفل ہے واہی واہ کی
میں بھی ہوں واں چاندنی کے تفوّیہ کا عہدہ دار
روشنی بھی ہے گی خدمت بندہ درگاہ کی
کاخ سے تیری کمند اس فیض کی اے بے خبر
سچ تو ہے بعدِ مسافت۔ لی فقط کوتاہ کی
یعنی کیواں جاہ جس کی طبع جود منیر
رکھتی ہے خورشید سیمائی دلِ آگاہ کی
جس کی ہمتائی میں سر ہے چرخ ہفتم پر امیر
آج ہے تقریب غافل اس کی بسم اللہ کی

اس قصیدے کو دعا پر ختم کیا ہے لیکن دعا میں عجیب طنز کیا ہے۔

رشوتیں دے کر اجابت نے اجارہ ہی کیا
جب دعا کی عالمِ بالا پہ بھی تنخواہ کی

لطف کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی معاشرے میں رشوت کی برائی موجود تھی۔

چوتھا قصیدہ بھی لطف نے ارسطو جاہ کی مدح میں کیا ہے اس قصیدہ میں ۲۸ اشعار ہیں لیکن قصیدے کی ابتداء میں مطلع نہیں ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس قصیدے کا گیارھواں شعر مطلع ہے۔

قصیدے کی ابتدا میں خوشبو کے بیان کو تشبیہ میں بسایا گیا ہے پھر خوشبو کی رعایت سے بہت ہی لطیف گریز کیا گیا ہے۔

کل معطر تھی صبا تک نکہت دلکش کے ساتھ
جس کے آگے بوئے گل کو حکمِ نوکِ خار ہے
بے کلی کی دل نے فرطِ شوق سے ایسا کہ میں
بے تکلف بول اٹھا ظالم یہ بوئے یار ہے
سن کے آشفتہ ہوئی مانند زلفِ مہ وشاں
بولے تو مفتونِ بوئے طرہ طرار ہے
تیرے آگے قدر رکھتی ہے شمیم زلفِ یار
یاں خجل مشکِ ختن اور نافۂ تاتار ہے
اس کے گلزارِ طبیعت کی یہ بو ہے بے خبر
جس کی نکہت سے معطر عقل کا گلزار ہے
رشکِ افلاطوں ارسطو جاہ جس کا باغِ طبع
رو کشِ فردوس محسودِ جمالِ یار ہے

دسویں شعر میں مطلع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گیارواں شعر بطورِ مطلع لکھا ہے۔

مطلعِ خوش آب یہ جو سلکِ گوہر دے تو نذر
گر سخن سنجوں میں تجھ کو آبرو درکار ہے
تجھ سے دُرِ عقل کو یہ گرمیٔ بازار ہے
جا چھپا خجلت سے دریا میں درِ شہسوار ہے

لطف کے اس شعر میں مبالغہ کی دلچسپ مثال دیکھئے:۔

لائے پھر تیری شمیمِ خلق اس کو اس کی جا
سر کی گر جاگہ سے نافِ آہوئے تاتار ہے

انسان کی ناف جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے "ٹل" جاتی ہے۔ لیکن لطف نے آہوئے تاتار کی ناف ٹلنا باندھا ہے۔

ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد لطف میر عالم سے متوسّل ہو گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے میر عالم کی مدح میں ایک قصیدہ کہا یہ ٦٦ شعر کا ہے۔ جس میں دو مطلع ہیں۔ پہلا مطلع استفساریہ ہے۔ اور یہ استفسار بھی تجاہل عارفانہ کی قسم کا ہے اور نو شعر کی تشبیب میں انصاف کی تعریف کرتے ہوئے گریز کر کے میر عالم کی مدح کی گئی ہے:۔

جہاں وابستۂ احساں ہے کس انصاف پرور کا
کہ دامِ صید سعئی باز ہے دانہ کبوتر کا
جوانانِ چمن کرتے ہیں عرصہ تنگ بہمن پر
چراغِ پیرزن ہوتا ہے سدِ راہ صرصر کا
شبوں کو شمع کے شعلہ سے ہنگامِ ہم آغوشی
پرِ پروانہ لیتا ہے مزا بالِ سمندر کا

دلِ رگ زن میں گر گزرے خیال معنی کاوش
رگِ دیوانہ بن پوچھے لہو پی جائے نشتر کا
بہم اضداد کو بھی انس ہے کنجشک کے گھر میں
برائے دفع سرما فرش ہے شاہیں کے شہپر کا
گرا ہو ناز کا جوں اخگرِ افسردہ خاکستر
شرارت پر مزاج اک خس برابر ہو جو اخگر کا
محال مردود بالیں سر دیوانہ ہو ہر سنگ
سرِ مو گرم اگر شعلے سے ہو خاشاک بستر کا
زمانے میں رواج از بسکہ استغنا نے پایا ہے
عرض بھی ان دنوں شاید نہ ہو محتاج جوہر کا
بایں دست تہی دیتا چنار انگلی ہے کانوں میں
صبا کرنے لگی ہے ذکر کچھ گل کے اگر زر کا
عجب کیا گر جہاں مفروش ہووے عدل و احساں سے
کہ تابع یہ چرخِ گرداں ہے دکن کے عدل گستر کا
امیرِ عادل عالی ہمم وہ میر عالم ہے
رہینِ بخشش کا ایک عالم ہے اب جس معدلت گر کا

اس قصیدے میں ایک جگہ لطف نے تعلّی کرتے ہوئے اپنے آپ کو سرِ نکتہ دانی کا شہنشاہ کہا ہے۔

سرِ نکتہ دانی پر یہ دعوئ شہنشاہی
بحقِ راستی حق ہے مرا کج رکھنا افسر کا

لطافت شعر کی میرے رہی ہیں بہ پیشانی
کروں موئے سر زلف پری گرتار مسطر کا
وہ بندش تنگ ہے پھر خاندانِ نظم کی میری
ملا سہواً بھی جس مصرع سے رشتہ سلک گوہر کا
نہ خاکستر بھی اس آتش کدہ میں پھر ملے اس کا
جو عمداً گرم کرکے باندھ دوں مضموں سمندر کا
بتِ معنی کی آجاؤں اگر صورت تراشی پر
تو کافر ہوں نہ کردوں سرد گرہنگامہ آذر کا
کرے عرضِ ضیا جس جا میری طبع صفا پرور
صفا سے مارے واں دمِ منہ تو دیکھو صبح خاور کا

لطف کو رعایت لفظی سے جو شغف رہا ہے وہ قصیدوں میں بھی نمایاں ہے انھوں نے اپنے قصائد میں لفظی اور معنوی مناسبتوں کا بہت ہی خوبصورتی اور مہارت سے استعمال کیا ہے۔

ذیل کے اشعار میں رعایت لفظی کا التزام ملاحظہ ہو:۔

شبوں کو شمع کے شعلہ سے ہنگام ہم آغوشی
پر پروانہ لیتا ہے مزا بال سمندر کا
دل رگِ زن میں گر گزرے خیال معنی کاوش
رگِ دیوانہ بن پوچھے لہو پی جائے نشتر کا
زمانے میں رواج ازبسکہ استغنا نے پایا ہے
عرض بھی ان دنوں شاید نہ ہو محتاج جوہر کا

کردوں ہوں مطلعِ ثانی میں طرف قبلۂ محفل
کہ اک مدّت سے ہوں احرام بند اس کعبۂ در کا

درختِ زندگانی کا ثمر تیری محبت ہے
تبر ہمدم نہ کیوں دشمن کے ہو پھر نخلِ بے پر کا

عجب کیا ہے شمیمِ خلق سے تیری خجل ہو کر
پھرے گا کارواں سوئے تتار اب مشکِ ازفر کا

تیری سدِّ کرم روشن ہے آئینہ سی عالم میں
بجا ہے تو اگر دستورِ اعظم ہو سکندر کا

بتِ معنی کی آجاؤں اگر صورت تراشی پر
تو کافر ہوں نہ کردوں سرد گر ہنگامہ آذر کا

یہ سطحِ خاک کا مجھ کو ہوا ہے نرد کا تختہ
قضائے شش جہت میرے لئے عالم ہے ششدر کا

شبوں، شمع، شعلہ، پر، پروانہ، بال اور سمندر، رگِ زن

کاوش، رگ، لہو، نشتر، عرض اور جوہر، طرف، قبلہ، احرام، کعبہ اور در، درخت، ثمر، تبر، نخل، بے پر، شمیم، کاروان، تتار اور مشکِ ازفر، سدّ، آئینہ اور سکندر، بتِ معنی، صورت تراشی، کافر اور آذر، نرد، تختہ، شش جہت اور ششدر —— یہ رعایتِ لفظی کے نمونے صرف ایک قصیدہ (انصاف پرور کا، کبوتر کا) سے پیش کئے گئے ہیں۔ رعایتِ لفظی کی مزید چند مثالیں نواب ارسطو جاہ کی مدح والے قصیدے سے پیش کی جاتی ہیں:-

ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ لطمہ خوار
عمانِ بحر کا ترے پیدا نہیں کنار

دب کر ترے زمانے میں ہر اک ضعیف سے
دار و مدار گر نہ کرے چرخ بے مدار
زخمِ حمائلی سے گلے میں حریف کے
زیرِ کمر وہ اترا ہے جو اس نے ڈالا ہار
ہے زیرِ راں ترے جو وہ دیوِ پری جمال
کحلِ ضیائے چشمِ صبا جس کا ہے غبار
ہو غرقِ موج کشتیٔ آب گہر سپہر
عمّانِ کف سے ہو تیری گر ابر سایہ دار

آشنا، بحر، لطمہ، عمّان اور کنار، چرخ اور بے مدار، حمائلی، گلے، کمر، دیو، پری، کحل، ضیاء چشم، اور عناد، غرق، موج، کشتی، آب گہر، سپہر، عمان، کف، اور ابر

قصیدہ لامیہ کی یہ رعایتیں بھی کافی دلچسپ ہیں —

مکتبِ فکر اس کے میں اطفال ابجد خواں جو ہیں
جس ارسطو طبع کو دیکھو ہے افلاطون خصال
ہے ترے فتراک کے قابل تو ہے چرمِ سہیل
ورنہ کس لائق ادیمِ طائفی کی ہے دوال
گر نہ ہو اس کی فتوت قدر دانِ مردمی
آج کرتا ہے یہ چرخ زن صفت قحط الرّجال
ہیں جو اس کے جامِ طبعِ پاک کے یاں جرعہ کش
دُردان کے سامنے ہے ساغرِ جم کا زلال

ہو ہلال چرخ اس کے زیرِ پا جوں نعل کفش
جس بلند اختر کے ہاتھ آوے تری صف نعال
ابرِ رحمت ہے یہ مجنوں کو وہ گردوں منزلت
اور اعدائے سیاہ دل کے لئے ہے جس کا کال

اطفال، ابجد خواں، ارسطو اور افلاطون، فتراک، چرم، سہیل ادیم طائفی اور دوال، فتوت، مروحی، زن، قحط الرجال، جام، جرعہ، دُرد، ساغر اور جم، ہلال چرخ، نعل، اختر اور صف نعل، ابر، گردوں، سیاہ۔

راہ کی ماہ کی والی زمین والے قصیدے میں لفظی رعایتوں کی مثال دیکھئے:۔

کیوں نہ ایسا ہو سکندر طالع اس کو تربیت
ہے امیرِ اعظم دوراں ارسطو جاہ کی
وہ ارسطو جاہ جس کی وسعت ملکِ کرم
پیک وہم فلسفہ کو رہ ہے سال و ماہ کی
جان و دل سے وہ زبس شیرِ خدا کا ہے غلام
شیرِ گردوں واں کرے ہے بازیاں روباہ کی

سکندر اعظم اور ارسطو۔ فلسفہ، شیرِ خدا، شیر گردوں اور روباہ۔ تاتار ہے ذخار ہے والے قصیدے میں رعایتِ لفظی کی مثالیں۔

تیرے آگے قدر رکھتی ہے شمیمِ زلفِ یار
یاں خجل مشکِ ختن اور نافہ تاتار ہے
مارے چشمک نہ محیطِ چرخ پر جس کا حباب
تیرے بحرِ فکر وہ یک قلزمِ ذخار ہے

شمیم، زلف، یار، مشک، ختن اور تاتار، محیط چرخ، حباب، بحر، قلزم اور ذخّار۔

صنعتِ تجنیس کی مثالیں:۔

بیزار اک جو یوں سرِ دشمن کے واسطے ۔ بیزار جی سے ہوں تو نہیں بنتی پھر ازار
تضیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف ۔ کیوں کر کہ یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
دب کرتے زمانے میں ہر اک ضعیف سے ۔ دار و مدار گر نہ کرے چرخِ بے مدار

کرتی جو کچھ کتاب ہے مجھ دل کباب کو
یہ غم تراشیاں نہ کرے یار غمگسار
لابد ہے جب کہ جمع ہو خاطر بیان جو
طالع ہے دربدر جو پھرے پھر ذلیل و خوار

تشبیہات:۔

مرہمِ زخمِ غریباں بس کہ اس کا لطف ہے
شامِ غربت سے عیاں ہے خندۂ صبحِ جمال

"لطف" کو "مرہمِ زخمِ غریباں" کہنا اچھی تشبیہہ اور تعبیر ہے۔

ہے سبک رو مثلِ آب اور خاک اڑاتا شکلِ باد
گرم خوں مانندِ آتش ہے وہ کوہ اعتدال

اس شعر میں آب و خاک باد و آتش عناصر کے اجتماع کے علاوہ ہاتھی کو کوہ اعتدال کہہ کر تشبیہہ میں ندرت پیدا کی ہے

عید مجھ کو منہ سے تیرے ہے کہ شکل ماہِ نو
بے تکلف حلقۂ گوشِ اطاعت پر ہے دال

"ماہ نو" کو "حلقۂ گوشِ اطاعت" سے تشبیہہ دینا اور پھر اطاعت پر دال" دلیل کہہ کر تشبیہہ کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔

قصائد لطف کی مزید چند اچھوتی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

ذال سا خم ہے عدوئے کج سرشت اور تیرا تیر
راست رو دشمن کے دل میں جوں الف مابینِ ذال

جس زمیں پر ہو ترشح تیرے ابرِ طبع کا
پھوٹے واں برگِ شجر شکلِ زبانِ خوش مقال

لطف کے قصاید میں صنعتِ تضاد کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔

سریرِ نکتہ دانی پر یہ دعویٰ شہنشاہی
بحق راستی حق ہے مرا کج رکھنا افسر کا

بس کہ اس کی طبع کا فطری فضائل پر ہے میل
ہے رذائل پر نگاہ اس عمر میں اکراہ کی

ہے زیرِ راں ترے جو وہ دیو پری جمال
کحلِ ضیائے چشمِ صبا جس کا ہے غبار

گر مہر قدر دانی کا تیرے نہ ہو فروغ
ہو اور علم آج شبِ جہل سے بھی تار

جہاں میں جب تلک زہر و شکر تلخی و شیرینی
کریں معمول پر اپنے اثر کیا خیر کیا شر کا

مری روشن سوادی تیرہ بختی کی ہوئی باعث
ممد ہے ورنہ یہ دون آشنا ہر کور اور کر کا

کہ مدح و ذم میں مملو اک جہاں میں ہووے تو ہرگز
نہ ہوں دیندار کا مداح نے حاجی ہوں کافر کا

تکریر:۔

ابرو یم بے ساختہ خجلت سے پانی پانی ہیں
دیکھ اس ذی جود کا فیضِ کفِ دریا نوال
سُن کے یہ مژدہ صبا سے ہو گیا دل باغ باغ
عقل بولی یہ تیرے اقبال کا آثار ہے

تنسیخ الاعداد:۔

تھا گر حریف اس کا پیادہ تو دو ہوا
اور چار پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

ایہام:۔

ادب سے دور ہے عرضِ مکرر لطف سے ہرچند
مزہ ہے لطف کی تکرار میں قندِ مکرر کا

پہلے مصرعے میں لطف شاعر کا تخلص ہے اور دوسرے مصرعے میں لطف بہ معنی مہربانی آیا ہے اس ایہام سے حقیقت میں خندۂ مکرر کا مزہ پیدا ہو گیا ہے۔

جب بخورِ عنبرِ عیش و صدائے عودِ جشن
مل کے دونوں نے بہم تا عرشِ اعظم راہ لی

پہلے مصرعے میں بخورِ عنبر بمعنی لوبان وغیرہ کا دھواں صدائے عود بمعنی مشہور ساز عود کی آواز۔ عود کے ایک معنی لوبان کے ہیں۔ یہاں دوسرے معنوں سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

ندرتِ تعبیر:۔

لطف کے قصیدے میں ندرتِ تعبیر کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

؎ خلقِ خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

اپنی پالکی کا آپ زیر بار ہونا اس ندرت تعبیر کا جواب نہیں ہے ندرت تعبیر کے بعد جدّت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

آج یہ قوت ضعیفوں کو ہے اس کے عہد میں
کہربا آتا ہے سر کے بل کشش سے کاہ کی

کہربا، کاہ کو کھینچتا ہے لیکن لطف نے کاہ کی جانب کہربا کو سر کے بل کشش دیکر تعبیر میں جدّت پیدا کی ہے۔

کنایہ:۔

خبر جس دن نہ ہووے خلق کو جیب و گریباں کی
ہو مرا ہاتھ اس دن اور داماں ہو ساقی کوثر کا

جس دن خلق کو جیب و گریباں کی خبر نہ ہو وہ کونسا دن ہو سکتا ہے فوراً ذہن منتقل ہوتا ہے روزِ محشر کی طرف۔ سرعتِ انتقال ذہن کی یہی خوبی اس کنایہ کی جان ہے۔

لف ونشر:۔

جہاں میں جب تلک زہر و شکر تلخی و شیریں
کریں معمول پر اپنے اثر کیا خیر کیا شر کیا

حسنِ تعلیل:۔

معدلت سے اس کے ہے کوتاہ یاں دستِ ظلم
عود کو دیتے ہوئے ڈرتا ہے مطرب گوش مالی

عود (مشہور ساز) کو سازندہ۔ آمادہ کرتے (ملاتے) وقت اس لئے زیادہ پیچ نہیں دیتا کہ کہیں تار ٹوٹ نہ جائے لیکن لطف اس کی یہ علت بیان کرتے ہیں کہ ممدوح کی عدالت کی وجہ سے ظلم کا ہاتھ یہاں تک کوتاہ ہوگیا ہے کہ وہ ساز کو گوشمالی دیتے ہوئے ڈرتا ہے۔

صیقل طلب ہوا نہ ترے ہر رائے سے
رہ جائے کیوں نہ ماہ کا آئینہ لکّہ دار

شاعر چاند میں دھبّوں کا سبب یہ بتاتا ہے کہ ممدوح کی صورت سے چونکہ چاند نے صیقل طلب نہیں کی یا اکتساب نہیں کیا اس لئے چاند میں دھبّوں کا رہ جانا ضروری ہے۔

علمی اصطلاحات:۔

گزرے اثبات ہیولیٰ کا اگر دل میں خیال
صاف پھر ابطال جزُ بے قدر و بے مقدار ہے
ہے سُبک رو مثل آب اور تیز رو مثلِ باد
گرم خو مانند آتش ہے وہ کوہِ اعتدال

لطف کی مثنوی نگاری

مرزا علی لطف نے "مثنوی نیرنگ عشق" اپنے قیام لکھنو کے زمانے میں تصنیف کی ۔ ان کی اس مثنوی کا ذکر سب سے پہلے ان ہی کے ایک ہمعصر شاعر قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء (۱۱۸۸ ہجری م ۱۷۷۴ عیسوی) میں کیا ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"مثنوی لدھا خوب گفتہ و داد معانی دادہ" [۱]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس مثنوی کو مرتب کر کے شایع کیا ہے وہ اس مثنوی کے سنہ تصنیف اور نام کے بارے میں رقم طراز ہیں :-

"(شمالی ہند کی) سب سے پہلی مثنوی جس کی تصنیف کے سنہ کا ہم کسی حد تک تعین کر سکتے ہیں وہ لطف کی مثنوی "نیرنگ عشق" ہے قدرت اللہ شوق کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۸۸ ہجری مطابق ۱۷۷۴ء) سے قبل لکھی جا چکی تھی ۔ اس لحاظ سے "نیرنگ عشق" شمالی ہند کی اولین مختصر مثنویوں میں سے ہے" [۲]

ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تائید میں لطف کی اس مثنوی کے سنہ تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مرزا علی لطف کی مثنوی نیرنگِ عشق ۱۱۸۸ھ سے کچھ پہلے لکھی گئی ۔" [۳]

---

[۱] ۔ طبقات الشعراء (مرتبہ نثار احمد فاروقی) (دہلی ۱۹۶۸ء) ص ۳۲۶ ۔ و نیز قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ ص ۱۳۹)

[۲] ۔ مثنوی لطف موسوم بہ نیرنگِ عشق (حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۷۹

[۳] ۔ اردو مثنوی کا ارتقاء (شمالی ہند میں) (الہ آباد ۱۹۶۵ء) ص ۲۰۱

مرزا علی لطف کے ایک ہم عصر شاعر غلام ہمدانی مصحفی نے بھی لطف کی مثنوی کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے :-

"مثنوی آبدار بہ سلکِ نظم کشیدہ" ؎۵

اس مثنوی کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ۱۹۶۲ء میں اپنے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ شایع کیا ہے اس کا پیش لفظ پروفیسر عبد القادر سروری نے لکھا ہے ۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی مرتب کردہ مثنوی میں ۴۱۱ اشعار ہیں ۔ اس مثنوی کے نسخوں کی تفصیل انھوں نے اسطرح بیان کی ہے :-

"مثنوی نیرنگ عشق" کے بارے میں یہ اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے مخطوطے کمیاب ہیں ۔ مجھے تلاش سے اس کے جملہ چار مخطوطے دستیاب ہو سکے ہیں جن میں ایک رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے (مخطوطہ ر) دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ (ع) تیسرا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن (ا) اور چوتھا، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن (م) میں محفوظ ہے ان میں سے آخری نسخہ سب سے زیادہ صحیح ہے علی گڑھ کا نسخہ ناقص الاول اور نہایت ہی شکستہ اور زشت خط میں لکھا ہوا ہے مثنوی لطف کو مرتب کرتے ہوئے میں نے مجلس تحقیقات اردو کے مخطوطات کو بنیاد بنایا ہے اور اہم اختلافات فٹ نوٹ میں درج کئے ہیں مثنوی کے نام کے لحاظ سے بھی مخطوطوں میں اختلافات ہیں علی گڑھ کے مخطوطے میں نام ندارد ہے ۔ آصفیہ کے نسخے میں مثنوی لطف درج ہے اور رامپور کے مخطوطے میں "مثنوی لطف" لکھا ہے مجلس تحقیقات اردو کے مخطوطے کے سرورق پر سرخی سے "مثنوی لطف و گل" درج ہے

۵۔ تذکرہ ہندی (مرتبہ عبد الحق) (دہلی ۱۹۳۳ء) ص ۲۰۱

لیکن ایک متبادل نام "نیرنگ عشق" بھی لکھا ہے۔ اس لئے میں نے مثنوی لطف کے ساتھ دوسرے نام کو متبادل نام کی حیثیت سے برقرار رکھا ہے[1]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے بیان کردہ چار نسخوں کے علاوہ میری تحقیق میں اس مثنوی کے مزید دس نسخوں کا پتہ چلتا ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

الف۔	مثنوی لطف	کتب خانہ سالار جنگ میوزیم (حیدرآباد)
ب۔	مثنوی لطف	اسٹاٹ سی بیلیو تھک (جرمنی)
ج۔	ایضاً	نیشنل لائبریری پیرس (فرانس)
د۔	ایضاً	کاپر کالج، (انگلینڈ)
ھ۔	ایضاً	انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی)
و۔	ایضاً	ایضاً
ز۔	ایضاً	ایضاً
ح۔	ایضاً	رامپور رضا لائبریری۔ رام پور۔
ط۔	ایضاً	کورس کرسٹی کالج کیمبرج، انگلینڈ۔
ی۔	ایضاً	انڈیا آفس لائبریری۔ لندن۔ انگلینڈ۔

(الف) مثنوی لطف کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے[2]

یہ مثنوی تذکرۂ گلشن ہند کے مخطوطے میں شامل ہے۔ خطِ نستعلیق ہے۔ کتاب کی سائز ۹ × ۶ ہے۔ اس میں ترقیمہ نہیں ہے جس کی وجہ سے کتابت کا سنہ اور کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا مثنوی کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے اس مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس

---

[1]۔ مثنوی لطف موسوم بہ نیرنگِ عشق (حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۹۴ و ۹۵ –

[2]۔ قلمی، مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم) داخلہ نمبر ۱۰۶۰ –

مخطوطے میں مثنوی کے ۴۰۸ اشعار ہیں۔ پہلا شعر:۔

عشق ہے کوئی عجب نیرنگ باز
عشق ہے طرفہ بلائے جاں گداز

مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

لطف بس اب بے ادب اتنا نہ ہو
منہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو
لائق انسان نہیں یہ قال وقیل
ہے جو مداح علیؑ یاں جبرئیل[1]

(ب) مرزا علی لطف کی مثنوی کا ایک نسخہ اسٹاٹ سی بیلیوتھک (جرمنی) میں ہے۔ تذکرہ گلشنِ ہند کے مخطوطے میں مرزا علی لطف کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کے بعد یہ مثنوی نقل کی گئی ہے۔ یہ خط نستعلیق ہے اور بہت ہی عمدہ لکھا گیا ہے۔ یہ مخطوط اسپرنگر کی ملکیت تھا بعد میں ٹیوبن گن لائبریری کو منتقل ہوا۔ اس مثنوی میں (۴۱۱) اشعار ہیں مثنوی میں عنوانات نہیں دئے گئے ہیں جس طرح ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے دیئے ہیں۔ اشعار میں بھی فرق ہے چند مثالیں دی جا رہی ہیں:۔

مثنوی مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت:۔

عشق اندوہ وفا کیشاں ہے
عشق فریاد جگر ریشاں ہے[1]
عشق اندوہ وفا کیشاں ہے عشق
عشق فریاد جگر ریشاں ہے عشق[2]

---

[1]۔ مثنوی لطف ص ۹۹

[2]۔ قلمی مخزونہ کتب خانہ اسٹاٹ بیلیوتھک (جرمنی) داخلہ نمبر ایم۔ ایس اورینٹل اسپرنگر ۳۴۹۔

مطبوعہ نسخہ میں آٹھواں شعر اس طرح دیا گیا ہے:۔

عشق سے یہ رنگ زرد و چشم تر
عشق سے لختِ دل و خونِ جگر

مخطوطہ جرمنی میں یہ شعر اس طرح ہے:۔

عشق ہے یہ رنگ زرد و چشم تر
عشق ہے لختِ دل و خونِ جگر

مثنوی کا آغاز

عشق ہے کوئی عجب نیرنگ باز
عشق ہے طرفہ بلائے جاں گداز

مثنوی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے ۔

لائق انساں نہیں یہ قال و قیل
ہے جو مداح علی یاں جبرئیل

(ج) گلشن ہند کا نیشنل لائبریری پیرس (فرانس)[1] کا یہ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے ہو سکتا ہے کہ اس مخطوطے میں مثنوی بھی شامل ہو۔ راقم الحروف کی رسائی اس نسخے تک نہیں ہو سکی ہے۔

(د) مثنوی مرزا علی لطف کا جو نسخہ " کاپر کالج انگلینڈ" میں موجود ہے اسکا داخلہ نمبر ۶۶ اور سلسلہ نمبر ۱۱ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنے تحقیقی مقالے "کیمبرج کی اردو قلمی کتابوں پر ایک سرسری نظر"[2] میں اس نسخہ کا ذکر کیا ہے۔[3]

لہ۔ قلمی مخزونہ نیشنل لائبریری (فرانس) داخلہ نمبر ۸۵۷

ٹہ۔ معارف (علی گڑھ ۱۹۲۶ء) ص ۱۲۶

(ھ) انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے پہلے نسخے گلشنِ ہند (دیکھیے ۱ مقالہ ہذا) میں مرزا علی لطف کی مثنوی موجود ہے چنانچہ افسر صدیقی امروہی اور سید سرفراز علی رضوی نے لکھا ہے :-

"ان کی (لطف کی) تصنیف ایک عاشقانہ مثنوی بھی ہے جو تمام و کمال اس تذکرے میں نقل کر دی گئی ہے[۱]"۔

(و) انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے اردو مخطوطات کی ایک طویل فہرست صفحہ ۳۷۷ تا ۴۶۷ پر مشتمل ہے جس میں ۱۱۶۸ کتابیں ہیں۔ اس فہرست کے ۶۷۹ سلسلہ نمبر پر "مثنوی لطف" مصنف مرزا علی لطف لکھا ہے۔ کاتب کا نام، سنہ تصنیف اور سنہ کتابت کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔

(ز) اس فہرست میں سلسلہ نمبر ۱۰۷۱ پر "مثنوی عشقیہ" مصنفہ مرزا علی خاں لطف (صاحبِ تذکرۂ گلشنِ ہند) لکھا ہے۔ کاتب کا نام، سنہ تصنیف اور سنہ کتابت کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔

(ح) تذکرۂ گلشنِ ہند کے ایک نسخے کی رام پور رضا لائبریری رامپور میں موجودگی کی اطلاع اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۴۔ مئی ۱۹۷۳ء کے ذریعہ راقم الحروف کو دی ہے چونکہ یہ مکمل نسخہ ہے گمان اغلب ہے کہ اس نسخے میں بھی مرزا علی لطف کی مثنوی شامل ہو گی[۲]۔

(ط) مرزا علی لطف کی مثنوی کی کورس کی سٹی کالج، کیمبرج انگلینڈ میں موجود رہنے کی نشاندھی قاضی عبدالودود نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں کی ہے[۳]۔ یہ مثنوی بھی لطف کے تذکرۂ گلشنِ ہند میں لطف کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کے بعد موجود ہے۔

۱۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول پاکستان ۱۹۶۵ء) صفحہ ۱۲۷

۲۔ شخصی مکتوب بتاریخ ۱۴۔ مئی ۱۹۷۳ء

۳۔ ایضاً بتاریخ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

(دی) تذکرۂ گلشنِ ہند کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن انگلینڈ میں موجود ہے[1]
چوں کہ یہ مکمل نسخہ ہے اس لئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نسخے میں لطف کی مثنوی شامل
ہوگی۔

لطف کے تذکرۂ گلشنِ ہند کے ابھی تک دو نسخے شایع ہوئے ہیں پہلے نسخے کو عبداللہ
نے مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھوا کر ۱۹۰۶ء میں رفاہِ عام پریس لاہور سے چھپوا
کر شایع کیا۔ اس نسخے میں مثنوئ لطف (موسوم بہ نیرنگ عشق) مولوی عبدالحق نے
حذف کر دی ہے قلمی نسخوں میں یہ مثنوی موجود ہے۔

دوسرا نسخہ اٹھائیس برس بعد ڈاکٹر زور نے تذکرۂ گلزار ابراہیم کے ساتھ مرتب کر کے
انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا۔ اس نسخہ میں بھی مثنوی لطف موجود نہیں ہے

مثنوی کا قصہ:۔

قصے کے آغاز سے قبل لطف نے عشق کی تعریف و توصیف میں ۱۳۰ اشعار لکھے
ہیں۔ پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان کو عشق حقیقی تھا
شب و روز وہ آہیں بھرتا رہتا تھا اس کی جمال پرستی کا یہ عالم تھا کہ کوئی خوبصورت نازنین نظر آئے
تو وہ بے تاب ہو جایا کرتا تھا۔

کوئی کافر جسم گر پڑتا نظر ⁂ دن وہ کٹتا اس پہ شب سے تیرہ تر
دیکھتا زلف پریشاں گر کوئی ⁂ زلف سے ہوتا پریشاں تر کہیں
گر نظر آتا کوئی غنچہ دہاں ⁂ ساتھ یہ دل تنگ ہوتا غنچہ ساں
الغرض وہ نوجوان خوش خصال ⁂ تھا خرامِ عشق کا نت پائمال

نالہ و فریاد ہی اس کا روزگار تھا۔ جب کئی دنوں تک اس نوجوان کا یہی حال رہا تب
پاس والوں کا جینا محال ہوگیا۔ ان کی نیندیں حرام ہوگئیں تمام لوگ بیزار ہوگئے

---

[1] کیٹلاگ آف ہندوستانی میں اسکرپٹس ان لائبریری آف دی انڈیا آفس (انگلینڈ سنہ ۱۹۶۲) ص ۲۰۹

لاچار ہو کر پڑوسیوں نے اس نوجوان کو سمجھایا کہ بستی میں تیرا رہنا مصلحت نہیں۔ یہاں سے چلا جا تاکہ ہم چین کی سانس لے سکیں۔ نوجوان کو اس محلے سے کیا سروکار تھا۔ وہ ایک دوسرے محلّے میں جا کر اپنا ٹھکانا ایک سایہ دار درخت کے نیچے کر لیا۔

اپنے دل کی بے تابی کو وہ یہاں بھی نہ روک سکا اور رات دن آہ و فغاں کرنے لگا۔ یہاں کے ہمسائے بھی اس سے تنگ آ گئے اور درپئے ایذا ہوئے۔ نوجوان اس جگہ بھی نقلِ مقام کر کے تمام شہر میں بے سروپا پھرنے لگا۔ کسی بھی جگہ وہ تین دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا تھا۔ جس جگہ بھی جاتا تھا وہاں کے لوگ اس کی اس نالہ و فریاد سے آزردہ ہو جاتے تھے۔

الغرض یوں ہی وہ محبت آشنا ٭ بے سروپا شہر میں سارے پھرا
جس جگہ جاتا تھا وہ افسردہ دل ٭ اس سے سب ہوتے تھے وہاں آزردہ دل
جو کوئی آزردہ یا خوش اس سے ہو ٭ تھی کسی سے کچھ نہ اس کو گفتگو
پھر تو باہم مل کے سب خورد و کلاں ٭ جان کر دیوانۂ بے خانماں
جس سے جو آزار پہنچا یا گیا ٭ سر پہ اس شیدا کے سب آیا گیا
سنگِ طفلاں سے بدن تھا خونچکاں ٭ قد تھا اس کا رشکِ نخلِ ارغواں
جس طرف جاتا دلِ پُر یاس سے ٭ بھاگتی ایک خلق اس کے پاس سے

آہ و فغاں ہی اس کا قرار تھا سارا شہر بے آرام ہو گیا۔ پیر و جوان سب اس نوجوان سے تنگ آ گئے کہ تمہارے شب و روز کے نالۂ فغاں سے ہم بیزار ہو گئے ہیں زندگی گزارنے کا یہ کونسا طریقہ ہے اس سے تو موت بہتر ہے۔ آخرِ کار اس نوجوان کو شہر بدر کر دیا گیا۔ دربانوں کو بطورِ خاص ہدایت دے دی گئی کہ اس نوجوان کو کسی صورت سے شہر میں داخل نہ ہونے دیں الغرض نوجوان کو شہر چھوڑ کر جنگل جانا پڑا۔ اس صحرا نوردی میں موسم بہار آ گیا گل و گلزار دیکھ کر نوجوان اور بھی بے چین ہوا اٹھا۔ پھرتے پھراتے ایک دن وہ ایک سرسبز و شاداب

پُر فضا مقام پر پہنچا کچھ فاصلے پر اس نے ایک دلکش سماں بھی دیکھا۔ یہ مقام نوجوان کو بہت پسند آیا وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے سوگیا اور اس جگہ کو اپنا مسکن بنالیا:۔

دیکھ دیوانے نے یہ صحرا کا جوش ✤ بے تحاشا کر اٹھا دل سے خروش
تھا جنوں میں گرچہ نوشتی خرام ✤ پر اڑا دی خاک صحرا کی تمام
ناگہاں ایک سمت کتنی اک شجر ✤ سبز و سایہ دار اسے آئی نظر
جذب نے پہنچایا ایک دم میں وہاں ✤ دیکھا زور ہے دلکش و خرّم مکاں
تھی ہوا از بسکہ سرد و جاں فزا ✤ دل وہاں بے اختیار اس کا لگا
کر کے ایک سایہ کے نیچے سو گیا ✤ کچھ تسلی سا دل اس کا ہو گیا

اس مقام پر ایک پریشان حال درویش نے ایک کنواں بھی کھودا تھا۔ جو مسافر شہر سے جنگل کے راستے سفر کرتا وہ اس پُر فضا مقام پر آرام لینے کی خاطر ضرور ٹھہرتا تھا۔ جب نوجوان کو اس مقام پر بے آب و دانہ قیام کے کئی دن گزر گئے۔ درویش اسے دیکھ کر وہاں پہنچا۔ نوجوان کو غربت زدہ خیال کر کے استفسار حاصل کیا۔ نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ درویش سمجھ گیا کہ یہ نوجوان کسی کے عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے ایک ساتھی مل جانے پر درویش بہت خوش ہوا اور شب و روز نوجوان کی خدمت کرنے لگا درویش کی خدمت اور محبت کی وجہ سے نوجوان کی وحشت کم ہونے لگی وہ ہوش میں آنے لگا درویش نوجوان کی حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

جب کئی دن گزرے دیوانے کو وہاں ✤ اک جا بیٹھے ہوئے بے آب و ناں
وہ جو رہتا تھا فقیر خستہ حال ✤ کر کے اک غربت زدہ اس کو خیال
آ کے استفسار حال اس سے کیا ✤ دیر تک یک قیل و قال اس سے کیا
جس قدر کوشش کی اس درویش نے ✤ کچھ کہا مطلق نہ اس دلریش نے
تب وہ سمجھا کہ دیوانہ ہے یہ ✤ عقل سے یک لخت بیگانہ ہے یہ

جان کر درویش نے مہجور یار ٭ مغتنم سمجھا اسے قربِ جوار
بس کے تنہائی سے تھا وہ جاں بلب ٭ دل سے تھا مصروف خدمت روز و شب
ہوش میں یہ آپ کو پانے لگا ٭ عقل کو یہ کچھ کام فرمانے لگا
یہ تمنّا دیکھ یوں پُر متصل ٭ خوش ہوا بے حد فقیرِ سادہ دل

ابھی نوجوان کو ہوش میں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ پھر ایک بار اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک روز اس ملک کی شہزادی اپنی کنیزوں کے ساتھ بغرض تفریح نکلی۔ شہزادی بہت ہی خوبصورت تھی۔ شہر میں اس کے حسن کا بڑا چرچا تھا۔ سینکڑوں اس کے حسن کے دلدادہ تھے اس پر مرتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ آفتاب کی تمازت شباب پر تھی کہ شہزادی کا گزر اس مکان کے قریب سے ہوا۔ شہزادی کو یہ پرفضا ٹھنڈا مقام بہت پسند آیا۔ گرمی کی شدت کے سبب شہزادی نے خدام سے کہا کہ دو گھڑی اس مقام پر آرام کریں گے۔ خادموں نے شہزادی کی چنڈول (پالکی) کو اس مقام پر لا رکھا جہاں وہ نوجوان ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ناگہاں پالکی کا پردہ ہوا سے اُڑ گیا۔ شہزادی کی آنکھیں نوجوان سے چار ہوئیں۔ نوجوان پر گویا بجلی گر پڑی۔ شہزادی کی نگاہ تیر کی طرح نوجوان کے دل کے پار ہو گئی وہ شہزادی پر عاشق ہو گیا۔ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگا۔

شہزادی کے غرورِ حُسن نے اس گدا کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ دو گھڑی آرام لینے کے بعد شہزادی نے کوچ کا حکم دیا۔ پالکی شہر کی جانب روانہ ہوئی نوجوان نے بہت کوشش کی کہ ضبط کرے مگر وہ عشق کی آگ میں پھنکا جا رہا تھا۔ نوجوان اپنے دل پر قابو نہ پا سکا اور اپنا دردِ دل بیان کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا پالکی کے ہمراہ وہ بھی روانہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ شہر کے دروازے کے قریب پہنچ گیا شہزادی کی سواری شہر میں داخل ہو گئی۔ شہر کے دربانوں نے اس نوجوان کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ مجبور و بے چین ہو کر نوجوان ایک

بلند درخت پر چڑھ گیا اور پالکی کی روانگی کا نظارہ کرنے لگا آخر کار شہزادی کی پالکی نوجوان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ۔ جوں ہی پالکی نوجوان کی نظروں سے غائب ہوئی نوجوان کو بے خبری میں اپنی جان کا ہوش نہ رہا وہ درخت سے گر پڑا اور اس کا وہیں انتقال ہو گیا ۔

چھوڑ کر جوں غنچہ خونِ دل میں تر ❊ اُس گرفتہ دل کو پا سے تا بہ سر
حکم فرمایا سواری کو کہ ہاں ❊ ہو شتابی شہر کی جانب رواں
بولا گو پہنچا نہ جسم ناتواں ❊ ہے تیرے ہمراہ یہ آزردہ جاں
تھا درخت ایک وہاں نہایت ہی بلند ❊ جس کی تھی ہر شاخ گردوں پر کمند
چڑھ گیا اُس پر کہ اور ایک آدھ دم ❊ دور سے ہی دیکھتا ہے محتشم
جوں ہوا اس کو نظر سے وہ نہاں ❊ پھر رہی اپنی خبر اُس کو نہ یہاں
تھا شجر پر یا کہ جوں پختہ ثمر ❊ گرتے ہی تھا لاکھ ٹکڑے خاک پر

درویش کو اس نوجوان سے بڑا انس تھا وہ بھی اس کے ساتھ چلا آیا تھا ۔ نوجوان کی اندوہناک موت پر وہ خون کے آنسو رونے لگا ۔ عشق کے اس انجام پر درویش حیراں ہو گیا نوجوان کی لاش کو اٹھا کر اُس کے مسکن لایا اور وہیں پر اُس کو دفن کر کے مزار بھی بنا دی۔

بسکہ اوس درویش کو اُنس اس سے تھا ❊ مضطرب ساتھ اوس کے آیا تھا
ناگہاں دیکھی جو اس نے اس کی لاش ❊ خاک پر مانند مینا پاش پاش
دیکھ کر درویش نے یہ ماجرا ❊ ہو کہ حیران عشق کے نیرنگ کا
اُنس جس خاک سے تھا اس نے کیا ❊ پائے دل اس کا نہ تھا اُٹھنے دیا
وہاں بنایا اس ستم کش کا مزار ❊ خاک میں سونپا دلِ امیدوار

ادھر شہزادی اپنے محل سرا کو پہنچی تو اس کے دل کی حالت بھی متغیر ہو گئی ۔ اسکے چہرے پر اسرار عشق عیاں ہو گئے ۔ اپنے دل میں وہ بھی سوز و گداز محسوس کرنے لگی ۔ دو چار دن میں شہزادی کی حالت خراب ہونے لگی عشق کی آگ بھڑک اٹھی ۔ شاہی محل میں

پھولوں کی سیج بھی اس کے لئے نوکِ خار بن گئی اپنی کنیزوں سے کہنے لگی کہ میرا دل گھبراتا ہے بے چینی بڑھ رہی ہے۔

وہ بلائے جانِ اربابِ نیاز ٭ اتری تو دولت سرا میں آبناز
پر دل نازک بہ زیرِ بارِ عشق ٭ منکشف چہرہ پہ سب اسرارِ عشق
آہ آخر لب تلک آنے لگی ٭ کیا ہی گرم و سرد دکھلانے لگی
رفتہ رفتہ اشک بھی خوں ہوگیا ٭ یا تو یم تھا یا کہ جیحوں ہوگیا
فرش گل پر بے کلی سے زار تھی ٭ ہر رگِ گل اس کو نوکِ خار تھی
گزرے اس حالت سے جب دو چار روز ٭ با دمِ سرد اور آہ سینہ سوز
دیکھی بے ڈھب عشق نے جب دل کی آگ ٭ دی ہی بھڑکا سینہ سوزاں کی آگ
دردِ دل کی پھر تو طغیانی ہوئی ٭ کیسی طغیانی کہ دیوانی ہوئی
بولی جی شدت سے گھبراتا ہے آج ٭ خود بخود کچھ دم رکا جاتا ہے آج
ہولِ دل کا گرچہ تھا کب سے خلل ٭ پر نہیں کل سے دلِ بے کل کو کل
کچھ نہیں کھلتا یہ کیا اسرار ہے ٭ سانس لینی آج تو دشوار ہے
قصرِ شاہی ہے سیہ زنداں مجھے ٭ خوش نہیں آتا رُخِ خنداں مجھے
بیٹھوں ہوں گر باغ میں جا ایکدم ٭ اور دونا دل کو ہوتا ہے الم

پھر وہ اپنی محرمِ راز کنیزوں کو لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوئی شہزادی کے عشق کی انتہا یہ ہوگئی کہ اس نے اپنے ماں باپ کے جاہ و جلال و رتبے کا تک خیال نہ کیا۔ آخرکار وہ نوجوان کے مسکن کو پہنچی۔ شہزادی نے اپنے عاشق نوجوان کو وہاں نہیں پایا۔ شہزادی نے ایک کنیز کو بھیجا کہ وہ اس جیسے نوجوان کے بارے میں دریافت کرے۔ کنیز کی زبان سے نوجوان کا نام سُن کر درویش بے اختیار رو پڑا۔ پھر اس نے نوجوان کی اندوہناک موت کا حال بیان کیا۔ اور اس نوجوان کے مزار کی نشاندھی کی۔ کنیز نے یہ تمام ماجرا شہزادی کو سنایا۔ شہزادی سخت

اندوہ گیں ہوئی۔

جوں سُنی اس رشک مہ نے یہ خبر ٭ رہ گئی حیران منہ اس کا دیکھ کر

بعد کتنی دیر کے اپنے میں آ ٭ بولی ظالم پھر تو کہہ یہ کیا کہا

پھونک کیا آتش سا یہ تو نے ہے غضب ٭ جل گیا کاشانۂ دل جس سے سب

کر دیا غارت صبر و تاب ٭ ہوگیا قصرِ توانائی خراب

وہ دیوانہ وار پالکی سے اتر کر نوجوان کے مزار پر آئی۔ چشم پُرنم سے حسرت کی نگاہ کرتے ہوئے آہ سرد بھر کر نوجوان کی مرقد پر گر پڑی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ آخرکار عشق نے اپنا کام کیا۔ ناگاہ مزار شق ہو گئی۔ نوجوان اور شہزادی دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ دفعتاً دوبارہ مزار برابر ہو گئی عاشق و معشوق ہم آغوشی کی حالت میں اوسی مزار میں دفن ہو گئے۔

اپنی ہی مطلق نہ تھی اس کو خبر ٭ ہووے کس کو پاسِ ناموسِ پدر

مضطرب اُفتاں و خیزاں برق وار ٭ پہنچی اس بیدل تلک حد بے قرار

کر کے یک آلودۂ حسرت نگاہ ٭ گر پڑی مرقد پہ اس کی بھر کے آہ

پھر کوئی آتا تھا دیوانی کو صبر ٭ شق ہوئی جوں سینۂ عاشق وہ قبر

دونوں اپنی اپنی جاگہ سے چلے ٭ کیا ہی بے کھٹکے ملے باہم گلے

لب پہ لب سینہ بہ سینہ زیرِ خاک ٭ کیا ہی دل جمعی سے باہم تپاک

وہاں پر موجود کنیزیں درویش، جوان اور بوڑھے متحیر اور دم بخود ہو گئے یہ خبر آن کی میں تمام شہر میں پھیل گئی۔ شہزادی کے والد شاہ کامران اور ملکہ دونوں کو اس کی اطلاع پہنچی تو روتے پیٹتے اس کے مزار پر پہنچے۔ بادشاہ نے سپاہیوں مزار کھودنے کا حکم دیا۔ دیکھا کہ شہزادی اور نوجوان ہم آغوش ہیں۔ بادشاہ نے جب دونوں کا یہ عشقِ صادق دیکھا تو اپنی حمیت پر جبر کر کے دونوں کو ایک جگہ مدفون رہنے دیا اور مزار کو دوبارہ ڈھانک دینے کا حکم دیا۔ عاشق و معشوق کو موت کے بعد وصال نصیب ہوا۔

واقعی جس وقت کھدوایا انھیں ٭ شوق میں دست و بغل پایا انھیں

تھا ہم آغوشی کا یہ عالم بہم ٭ جوں رکھے پیچیدگی نقشِ درم

دیکھا شاہِ دادگر نے جب یہ حال ٭ عاشقِ صادق انھوں نے کر خیال

جبرا پنی ہی حمیّت پر کیا ٭ ایک جا باہم انھیں رہنے دیا

قصّے کا ماخذ

مثنوی کے قصے کا ماخذ ایک پنجابی روایت ہے جس کی بنیاد پر قایم نے بھی اپنی مثنوی "جذبِ الفت" لکھی تھی۔ اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شوق "طبقات الشعراء" میں قایم کی مثنوی کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

"مثنوی شاہ لدھا کہ فقیرے تکیہ دار عاشق مزاج در نواحی پنجاب بود بسیارے بادہ ہائے رنگین بستہ اول تا آخر ہمہ اشعار انتخابی است"[1]

قدرت اللہ شوق کے بیان کے مطابق لطف کی مثنوی کا ماخذ بھی یہی قصہ ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"مثنوی لدھا خوب گفتہ داد معانی دادہ"[2]

اسی بناء پر نثار احمد فاروقی نے لطف کی مثنوی کے بارے میں لکھا ہے: "یہ وہی قصہ ہے جسے قائم نے بھی اردو میں لکھا ہے .... یہ اصلاً عہدِ اورنگ زیب کی ایک فارسی روایت سے ماخوذ ہے"[3]۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے بیان کے مطابق "قایم کے قصّے کا ماخذ عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی قصّہ لدھا فقیر ہے"[4]۔

ص ۲۲۶۔

[1] تذکرۂ طبقات الشعراء (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ ص ۸۰ (ب) ونیز طبقات الشعراء (مرتبہ نثار احمد فاروقی)

[2]۔ ایضاً ص ۱۳۹۔

[3]۔ تذکرہ طبقات الشعراء۔ مرتبہ نثار احمد فاروقی) دہلی ۱۹۶۵ء ص ۱۱۷

[4] اردو مثنوی شمالی ہند میں (علی گڑھ ۱۹۶۹ء) ص ۲۶۴

لیکن قایم نے عاقل خاں رازی کی مثنوی کا حوالہ دیئے بغیر قصّہ کے ماخذ کے بارے میں صرف اتنا اشارہ کیا ہے کہ یہ قصّہ انھوں نے کسی راوی سے سنا تھا۔

شب اک ماتم سرائے خانۂ عشق ٭ بیان کرتا تھا یوں افسانۂ عشق
کہ تھا پنجاب میں اک مرد درویش ٭ گرفتار بلائے حالت خویش
چنانچہ نوحہ خوانِ بزمِ ماتم ٭ کرے ہے گرفتار اس طرح نالش غم[1]

قایم کی یہ مثنوی "کلیات سودا" میں سودا کے تخلص کے ساتھ شامل ہے محققین کا خیال ہے کہ یہ الحاقی کلام ہے غلطی سے سودا کے نام سے منسوب ہو گیا ہے چنانچہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت لکھتے ہیں:۔

"کلیات سودا کا یہ نسخہ اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ اس میں سودا کے متعدد شاگردوں کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے"[2]

نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) نے "مختار اشعار" کے نام سے "دیوانِ قایم" مرتب کیا ہے اس میں یہ مثنوی "درویش و عروس" کے نام سے شامل ہے۔ وہ سودا اور قایم سے منسوب اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ مثنوی قایم کے دیوان میں بھی موجود ہے اور دیوان سودا میں جا بجا تغیّر کے ساتھ چھپ گئی ہے لیکن قرائن سے ظاہر ہے کہ قایم کی تصنیف ہے اصلاح کے لئے استاد کو نقل دی تھی۔ انھوں نے اصلاح بھی کی واپس کرنے کی نوبت نہ آئی کہ شاید استاد و شاگردی میں بگاڑ ہو گئی۔ اسی سبب سے قایم کے دیوان میں اصلاح رہ گئی اور سودا کے دیوان میں وہی مثنوی اصلاح شدہ

۱۔ کلیاتِ سودا (مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت) ص ص ۳۲۹ و ۳۴۳ ۔

۲۔ کلیات سودا (الہ آباد ۱۹۷۱ء) ص ۱۵۰

چھپ گئی ہے[۱]

ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی مختلف شواہد کی بناء پر اسے قایم کی مثنوی قرار دیا ہے[۲]۔ لطف اور قایم کی مثنویوں کے قصوں میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قایم کی مثنوی لطف کی نظر سے گذر چکی تھی۔ لطف قایم کو میر اور سودا کے بعد سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور ان کے کلام کے بیحد مدّاح تھے[۳]۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ انھوں نے قایم کی مثنوی سے استفادہ کیا ہو۔

مثنوی کے آغاز میں قایم نے عشق کی تعریف و توصیف میں اشعار لکھے ہیں۔ اس کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے اس قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ پنجاب میں ایک درویش رہا کرتا تھا درویش نے ایک پُر فضاء سرسبز و شاداب مقام پر اپنا تکیہ بنایا تھا۔ مسافر آتے جاتے ہوئے یہاں آرام کرنے کے لئے رُک جایا کرتے تھے۔ درویش عشق کے مرض میں مبتلا تھا۔ وہ شب و روز آہ و فغاں کیا کرتا تھا۔ ایک روز ایک بارات اس طرف سے گزری براتیوں نے دلہن کی ڈولی کو اس جگہ اتارا جہاں درویش آرام کر رہا تھا۔ دلہن نے گرمی کی شدّت کے باعث ڈولی کا پردہ اٹھایا۔ درویش اور دلہن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ شام کے وقت جب دھوپ کی تمازت کم ہوئی تب بارات شہر کی جانب روانہ ہوئی۔ وداعِ یار کا منظر درویش کے لئے بڑا ہی جاں گسل

۱۔ دیوان قایم (آگرہ ۱۸۹۶ء) ص ۸۰

۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں (علیگڑھ ۱۹۶۹) ص ۲۶۴

۳۔ لطف نے اپنے تذکرے میں قایم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے۔" (گلشنِ ہند (مطبوعہ) ص ۱۳۳۔

تھا۔ وہ ایک بلند درخت پر چڑھ کر دلہن کی ڈولی دیکھتا رہا ڈولی جب نظاروں سے اوجھل ہوگئی تو درویش درخت سے گر کر جاں بحق ہوگیا۔ تکیے کے آس پاس موجود لوگوں نے اس درویش کی تدفین کی اور اس تکیہ ہی میں اس کی قبر بنا دی۔ ادھر وہ نازنین درویش کی محبت میں بےچین اور غمگین رہنے لگی عزیز و اقارب نے اس کا ہر طرح علاج کروایا مگر افاقہ نہ ہوا آخر کار اس کے والدین کو بذریعہ خط اس کی اطلاع دی گئی کہ وہ لوگ آکر دلہن کو لے جائیں۔ دلہن کے والدین اور دوسرے رشتہ دار آئے اور دلہن کو اپنے ساتھ لے گئے ایک دایہ نازنین کے ساتھ تھی۔ درویش کے تکیے کے قریب بغرض آرام یہ چھوٹا سا قافلہ رکا۔ سب لوگ آرام کرنے لگے لیکن نازنین درویش کے لئے بےچین تھی آخر کار وہ تکیے میں آئی اور درویش کے حادثے کی اطلاع پاکر فرطِ غم سے درویش کی قبر پر گر پڑی معاً قبر شق ہوئی اور نازنین درویش سے ہم آغوش ہوکر قبر میں سما گئی پھر قبر برابر ہوگئی۔ دلہن کے ماں باپ، عزیز و اقارب حیراں و پریشان دیکھتے ہی رہ گئے۔ بالآخر روتے پیٹتے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

لطف اور قایم دونوں کی مثنویوں کا آغاز عشق کی تعریف و توصیف سے ہوتا ہے دونوں میں ایک نوجوان کا مسکن جنگل ہی ہے۔ نوجوان کے سامنے چنڈول یا محافہ (ڈولی) رکھی جاتی ہے اور بوجہ گرمی نازنین ڈولی کا پردہ اٹھاتی ہے نوجوان پہلی ہی نظر میں نازنین پر عاشق ہوجاتا ہے شام کو جب دھوپ کی تمازت کم ہوتی ہے تو ڈولی شہر کی جانب روانہ ہوتی ہے۔ نوجوان آہ و فغاں کرتے ہوئے ڈولی کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ نوجوان کا ایک بلند درخت پر چڑھنے اور اس بلند درخت سے گر کر فوت ہونے کا سانحہ بھی دونوں مثنویوں میں مشترک ہے۔ دونوں مثنویوں میں تکیے ہی میں نوجوان کی تجہیز و تکفین ہوتی ہے۔ نوجوان کی مزار شق ہوتی ہے اور نازنین اس میں سماجاتی ہے اور عاشق و معشوق دونوں ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔ قبر برابر ہوجاتی ہے۔

دونوں قصّوں میں چند اختلافات بھی ہیں۔ مثنوی لطف میں ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس کی آہ و فغاں سے لوگ تنگ تھے۔ مثنوی قایم میں ایک درویش کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس سے کوئی نالاں نہ تھا۔ مثنوی لطف میں نوجوان کو شہر بدر کیا جاتا ہے جب کہ مثنوی قایم میں درویش خود کٹھیا یا تکیہ میں رہتا ہے۔ مثنوی لطف میں درویش نوجوان کی دیکھ بھال کرتا ہے جب کہ مثنوی قایم میں مسافر درویش کا خیال رکھتے ہیں۔ مثنوی لطف میں محبوبہ شہزادی ہے جب کہ مثنوی قایم میں محبوبہ ایک عروس ہے۔ مثنوی قایم میں دلہن اپنے سسرال جاتی ہے جب کہ مثنوی لطف میں شہزادی اپنے محل واپس ہوتی ہے۔ مثنوی قایم میں دلہن اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ تکیہ پر آتی ہے۔ جب کہ مثنوی لطف میں شہزادی اپنی چند محرمِ راز کنیزوں کے ساتھ نوجوان کے مسکن پر آتی ہے۔ مثنوی قایم میں جذبۂ عشق، عاشق و معشوق میں اسی وقت بیدار ہوتا ہے جب کہ مثنوی لطف میں شہزادی چار دن کے بعد نوجوان کے عشق میں بے قرار ہوتی ہے۔ مثنوی لطف میں بادشاہ مزار کو کھدوا کر دیکھتا ہے۔ عاشق و معشوق کو دیکھتا ہے جبکہ مثنوی قایم میں نازنین کے عزیز و اقارب روتے پیٹتے اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔

قدماء اپنی فارسی اور اردو مثنوی کی ابتداء "حمد"، "نعت"، "منقبت" اور اس بادشاہ کی تعریف سے کرتے تھے جس کی فرمائش پر یا جس کے عہدِ حکومت میں وہ مثنوی تصنیف کی گئی۔ لیکن متوسطین میں بعض شعرا نے حمد و نعت کے اس طریقے کو ختم کر دیا اور اپنی مثنوی کی ابتدا بیانِ عشق سے کی۔ جیسے میر کی مثنوی "دریائے عشق" جس میں ۲۲ شعر عشق کی تعریف میں لکھے گئے ہیں یا جیسے قایم کی مثنوی "جذب الفت" جس میں ابتدائی ۱۹ اشعار میں کیفیاتِ عشق کا بیان ہے۔

قایم نے عشق کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:-

الٰہی شعلۂ زن کر آتشِ دل ٭ تپ دل دے بقدرِ خواہش دل
جو شور انگیز چشم گریہ آلود ٭ لبِ زخم جگر کو رکھ نمک سود
کرامت کردہ عشقِ آتشِ انگیز ٭ کہ تا ہر استخواں میرا ہو گل ریز
بنامِ آنکہ عشق آموز دل ہے ٭ چراغ شمع سوزِ دل ہے
سکوت برمحل ہے دل کی تفریح ٭ سخن پر اس کو سو درجہ ہے ترجیح

لطف نے بھی اپنی مثنوی کی ابتدا عشق ہی کی نیرنگیوں کے بیان سے کی ہے۔ چنانچہ ۱۱۴۱ اشعار کی مختصر مثنوی میں ۳۰ شعر صرف عشق ہی کی توصیف میں لکھے ہیں مثلاً

عشق ہے کوئی عجب نیرنگ باز ٭ عشق ہے طرز بلائے جاں گداز
عشق زور ہی برقِ خرمن سوز ہے ٭ عشق زور ہی ناوک دلدوز ہے
عشق ہے یک شعلہ آفاق سوز ٭ عشق ہے اک آتشِ عالم افروز
عشق اندوہِ دفا کیشاں ہے عشق ٭ عشق فریادِ جگر ریشاں ہے عشق
عشق زور ہی خانہ برانداز ہے ٭ عشق ہی گہہ سوز گا ہے ساز ہے
عشق ہے تسکینِ دل پردرد ہے ٭ عشق یارِ جان غم پُر درد ہے
عشق ہے درمانِ دردِ بیدلاں ٭ عشق ہے نورِ نگاہِ مقبلاں

لطف نے مختلف زاویوں سے عشق کی عکاسی کے باوجود یہ لکھا ہے کہ زبانِ خامہ عشق کی داستان انشا نہیں کر سکتی۔ ۵

کیا زبان خامہ کو تاب و تواں ٭ عشق کی انشا کرے جو داستاں

بیان عشق کے علاوہ لطف اور قایم کی مثنویوں میں کئی اشعار ایسے ملتے ہیں جنکے تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف نے قایم کی مثنوی کو نمونہ بنایا ہوگا مثلاً

قایم	لطف
مسافر جو کوئی اوس راہ آتا	جو مسافر شہر سے جاتا کہیں
وہ دل سے یادِ منزل بھول جاتا	پہلے وہ آکر ٹھہرتا تھا یہیں
سرائے دھر تھی گویا وہ جاگہ	دیکھ آبِ سرد و جائے سایہ دار
کہ جو آیا وہ بھولا منزل در رہ	بیٹھ جاتا واں بے اختیار
زبس دیکھی جگہ مطبوع وجا سرد	دیکھتے ہی وہ مکانِ سایہ دار
اتر بیٹھے ہر اک سو عورت و مرد	کھِل گیا ایک بارگی دل غنچہ وار
ہوی گرمی سے ڈولی کی وہ جب تنگ	ٹھہری یہ یک دم یہاں دم لیجئے
کیا ان نے ہوا کھانے کا آہنگ	کوئی ساعت استراحت کیجئے
نہ جانے تھی نگہ یا تیرِ تا تار[1]	تھی نگہ یا ناوکِ خونخوار تھی
کہ بے تحریک وہ دل سے ہوئی پار	آنکھ کے ملتے ہی دل کے پار تھی
گئی وہ اوس طرف اور یہاں یہ غضبناک	وہ چلی وہاں صبر یہاں اس سے چلا
کہے تھا زیرِ لب یا چشمِ نمناک	ہوگیا رازِ نہفتہ برملا
غرض پھر خلق میں آمادہ رنجور	بڑھ گئی اس میں سواری ٹک جو دور
جو نظروں سے گیا ڈولا ایک ایک دور	اور بھی بیکل ہوا یہ ناصبور
چڑھا اک پیڑ پر وہ شعلہ آسا	چڑھ گیا اس پر کہ اور ایک آدھ دم
تفِ دل سے لہو کا اپنے پیاسا	دور سے ہی دیکھتا ہے مغتنم
جہاں تک قوتِ مدِّ نظر تھی	جب تلک مدِّ نظر تھا وہ غبار
یہ تھا یاں اور نگہ اوس کی ادھر تھی	میل بالا رکھتا تھا یہ خاکسار

[1] کلیات سودا (مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت) حصۂ اوّل میں "تیر بابار" لکھا ہے "ہوی پار" کے بجائے "ہو گئے پار" لکھا گیا ہے۔

جوں ہوا اوس کی نظر سے وہ نہاں ÷ نظر آنے سے مطلق رہ گیا جب
پھر رہی اپنی خبر اوس کو نہ یہاں ÷ ہوا وہ روز اس پر تیرہ جوں شب
اُنس جس جاگہ سے تھا اس نے کیا ÷ کہ یہ جا اس کے جیسے ہی تھی مرغوب
پائے دل اس کا نہ تھا اُٹھنے دیا ÷ یہیں رکھے اگر اس کو تو کیا خوب
خاک پر گرتے ہی بس اس ماہ کے ÷ گری بے طاقتی سے واں یہ غمناک
جان بھی رخصت تھی ساتھ ہی آہ کے ÷ طرح پاتی کے لرزی ہر طرف خاک
پھر کوئی آتا تھا دیوانہ کو صبر ÷ اسی صورت سے یہ غلطاں کچھ دور
شق ہوئی جوں سینۂ عاشق وہ قبر ÷ کہ جذبِ عشق نے ٹکڑے کی وہ گور
اور وہاں جتنے جواں و پیر تھے ÷ جو تھے ان نازنیں کے اقرباواں
دم بخود جوں پیکر تصویر تھے ÷ ہوئے اس ماجرے سے سب وہ حیراں
لطف بس چپ رہ کدھر کو دھیان ہے ÷ بس اے قایم خموشی پیشہ کر تو
یہ سخن تیرے نہیں شایان ہے ÷ سخن کے طول سے انداز کر تو
ختم کر بس شاعری کو اب یہیں ÷ سخن ہے گرچہ اے دل میوۂ لب
عشق ہی تیری طبیعت کا نہیں ÷ یہ خاموشی کو کر سن شیوۂ لب

میر کے شاگرد راسخ عظیم آبادی نے قایم کے قصّے کی بنیاد پر اپنی مثنوی "اعجازِ عشق" لکھی۔ مثنوی کے آغاز میں عشق کے توصیفی اور تعریفی (۲۵) اشعار ہیں۔ اس کے بعد ایک قطعہ، دوسرا قطعہ (۱۷) اشعار کا، نعت (۴۹) اشعار کی "مناجات عاشقانہ" کے (۴۲) اشعار کے بعد "صفتِ عشق" کے عنوان سے (۳۸) اشعار ہیں۔ اسکے بعد اصل قصّے کا آغاز ہوتا ہے۔ قصّہ وہی ہے جو قایم نے بیان کیا ہے۔

---

۵ ۔ کلیات سودا حصّہ اول: مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت ؛ ص ۲۴۴ پر یہ شعر "سودا" کے تخلص سے لکھا گیا ہے۔ دیوان قایم میں قایم تخلص درج ہے۔

راسخ نے قایم کے بعد یہ مثنوی لکھی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راسخ کی نظر سے قایم کی مثنوی گزری ہوگی اسی بنا پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:[۱]

"قایم چاندپوری (۱۲۱۰ ہجری) اور راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ ہجری) کی عمروں میں جو تفاوت ہے اس کے پیش نظر یہ قیاس غلط ہو کہ راسخ کی مثنوی قائم کی مثنوی کے بعد لکھی اور ممکن ہے کہ قایم کی مثنوی راسخ کی نظر سے گزری ہو اور اسے دیکھ کر انھیں یہ قصہ نظم کرنے کی ترغیب ہوئی ہو۔"[۲]

ڈاکٹر گیان چند جین بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ہم خیال نظر آتے ہیں وہ بھی لطف، قایم اور راسخ کی مثنویوں کے قصے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اس جواں درویش کی روئداد وہی ہے جو قایم کی مثنوی جذبِ الفت اور راسخ کی مثنوی اعجازِ عشق میں بیان کی گئی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ان حضرات کے یہاں محبوبہ کسی کی عروس نو ہے مثنوی لطف میں شہزادئ شہر ہے۔"[۳]

پروفیسر عبدالقادر سروری کو لطف کی مثنوی کے قصے کے بارے میں تسامح ہوا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"اس میں ایک شاہ صاحب کا قصہ منظوم کیا گیا ہے جو ایک دلہن کے حسن پر جس کا محافہ ان کے تکیہ کے قریب کچھ دیر کے لئے رکا تھا ایسے فدا ہو جاتے ہیں کہ جب محافہ روانہ ہو جاتا ہے تو جان بحق ہو جاتے ہیں۔

---

[۱] سید عزیزالدین احمد بلخی نے اپنی کتاب "تاریخ شعرائے بہار" (پٹنہ ۱۹۳۰ء) صفحہ ۷۰ پر راسخ عظیم آبادی کی تاریخ وفات ۲۲ رجادی الآخر ۱۲۴۸ھ لکھی ہے۔

[۲] ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (دہلی ۱۹۶۲ء) ص ۲۲۴

[۳] اردو مثنوی شمالی ہند میں (علی گڑھ ۱۹۶۹ء) ص ۳۸۰

اس کی خبر جب لڑکی کو ملتی ہے تو وہ شاہ صاحب کی خبر پا کر
جان دے دیتی ہے۔[1]

اس بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالباً سروری صاحب نے جب اپنی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقاء" لکھی اس وقت لطف کی مثنوی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔

ڈاکٹر گیان چند جین کو مثنوی لطف کے نام کے بارے میں سہو ہوا ہے چنانچہ وہ رقم طراز ہیں :۔

"مرزا علی لطف کی مثنوی "لطف و گل" بھی میر کی تقلید میں لکھی گئی۔"[2]

ڈاکٹر گیان چند جین نے اس کتاب کے صفحات مابعد میں اپنے سابقہ بیان کے خلاف لطف کی مثنوی کا نام "نیرنگ عشق" لکھا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۷۹ میں لکھتے ہیں:۔

"مرزا علی لطف تذکرۂ گلشن ہند کے مؤلف کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کا ایک اور ادبی کارنامہ مثنوی نیرنگ عشق" ہے
اور اسی کتاب کے ضمیمے میں فہرست مثنوی کے تحت صفحہ ۷۹۹ پر
لطف کی مثنوی کا نام "نیرنگ عشق" لکھا ہے۔"

مثنوی کے آغاز میں لطف نے میر قاسم اور راسخ عظیم آبادی وغیرہ کی پیروی ضرور کی ہے۔ لیکن مثنوی کے اختتامیہ میں متقدمین اور متوسلین کی سنت کے خلاف اپنی مثنوی کو قصیدے کی طرح گریز کے بعد حضرت علی کی منقبت پر ختم لکھا ہے۔ لطف کی مثنوی کا اختتام اس طرح ہوتا ہے :۔

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء (جدید ایڈیشن) (علی گڑھ) ص ۱۱۲

[2] اردو مثنوی شمالی ہند میں (علی گڑھ ۱۹۶۹ء) ص ۱۲۹

لطف بس چپ رہ کدھر کو دھیان ہے
یہ سخن تیرے نہیں شایان ہے
اس سے آگے ہو نہ اب غمّازِ عشق
خوب ہے پوشیدہ رکھنا رازِ عشق
ختم کر اب شاعری کو بس یہیں
عشق ہے تیری طبیعت کے تئیں
شعر کا تو یہ نہیں انداز ہے
سحر کہیے گر نہیں اعجاز ہے
معنی روشن نہ سمجھے گر عدو
کڑھنا مت اس کورِ باطن سے کبھو
یہ تو پوشیدہ نہیں ہے فاش ہے
خیرہ خور سے دیدۂ خفاش ہے
کچھ بھی موقع تھا یہاں ذکرِ عدو
عشق کی کرتا ابھی تھا گفتگو
کس طرف سے جا رہا کیدھر گماں
نفسِ کافر لے گیا مجھکو کہاں
لاکھ دشمن کا ہے دشمن یہ لعیں
خون کی جس کے دیت مطلق نہیں
قید ما و من بت میں یہ بے ادب
بے مزہ رکھتا ہے مجھکو روز و شب

ہے رہائی اسے اب اس شہ کے ہاتھ
شیر سے سلمانؓ کو دی جس نے نجات
یعنی حیدرؑ ابن عمّ مصطفےٰؐ
قاتلِ عنتر علیؑ مرتضےٰؑ
ساقیٔ کوثر امامِ جزو و کل
شافعِ محشر امامِ جزو و کل
صاحبِ قنبر شہنشاہِ نجف
فاتحِ خیبر نشانِ من عرف
وارثِ منبر شہِ گردوں مقام
حیدرِ صفدر سپہر احترام
شاہِ مرداں، مردِ میدانِ وفا
شیرِ یزداں نائبِ حکمِ خدا
لطفؔ بس اب بے ادب اتنا نہ ہو
منہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو
لائق انسان نہیں یہ قال و قیل
ہے جو مدّاحِ علیؑ یاں جبریل

فنّی محاسن و معائب:-

جہاں تک مثنوی کے فنّی لوازم اور شرائط کا تعلق ہے لطف نے انھیں بڑی حد تک ملحوظ رکھا ہے مثنوی کا قصّہ نہایت مربوط ہے۔ قصّہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی دلچسپی میں کہیں فرق نہیں آتا۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں

بیان کیا گیا ہے جو قصّے کے تسلسل اور وحدتِ تاثر پر اثرانداز ہو اور جس کی وجہ سے پلاٹ میں جھول پیدا ہو جائے۔ واقعات نگاری میں بالعموم اختصار سے کام لیا گیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے جزئیات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

مثنوی نگاری کی عام روایت کے برخلاف لطف نے فوق الفطرت عناصر سے بہت کم کام لیا ہے۔ لطف کی مثنوی میں صرف ایک واقعہ خلافِ فطرت ملتا ہے۔ قبر کا شق ہونا اور نوجوان سے ہم آغوش ہو جانا۔ لیکن یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے خلافِ فطرت نہیں ہے جو کرامات اور خرقِ عادت میں یقین رکھتے ہیں۔

کردار نگاری :-

یہ مثنوی تین اہم کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ سب سے اہم کردار ایک نوجوان آشفتہ مزاج کا ہے جو اس مثنوی کا ہیرو ہے دوسرا کردار شہزادی کا ہے جو اس مثنوی کی ہیروئن ہے اور تیسرا کردار درویش کا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے کردار بھی اس مثنوی میں شامل ہیں جن میں قابلِ ذکر شہزادی کے ماں باپ (شاہ کامران و ملکہ) وزیر اور کنیزیں ہیں۔

داستانوں اور مثنویوں میں ناولوں کی طرح جدید انداز کی کردار نگاری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لطف نے مثنوی کے پلاٹ کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے کرداروں میں مثنوی کے ہیرو کو نمایاں طور پر متعارف کروایا ہے۔ مثنوی ایک ہی واقعہ کے اطراف گھومتی ہے۔ اسی وجہ سے لطف نے ہیرو یعنی نوجوان کے مرکزی کردار کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نوجوان عشق میں مبتلا ہے۔ نوجوان کی اس اضطراری کیفیت کو عشقِ حقیقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مثنوی کے اس مرکزی کردار کا لطف نے

اس طرح تعارف کروایا ہے۔

یک جواں بس عاقل و فرزانہ تھا ؛ لیک دل رکھتا پنٹ دیوانہ تھا
صید تھا وہ شاہباز عشق کا ؛ زخم خوردہ یکہ تاز عشق کا
دردِ دل میں سوز جاں میں اسکی تھا ؛ نالہ ہر اک استخواں میں اسکی تھا
تھا رہائی سے نہ مطلق اس کو کام ؛ مُرغِ دل رکھتا تھا نت پابندِ دام
دیکھتا دلکش کوئی صورت اگر ؛ پھر نہ اپنی اس کو کچھ رہتی خبر

نوجوان کا جذبۂ عشق صادق تھا جس کی وجہ سے وہ آرام و آسائش کی پروا نہ کرتے ہوئے شب و روز آہ و فغاں میں مصروف تھا۔ ہمسائے اس کی آہ و زاری سے بیزار تھے۔ بالآخر خورد و کلاں اس کے در پئے آزار ہوئے بچوں نے سنگ باری سے اس کو زخمی کر کے شہر بدر کر دیا۔ نوجوان نے رضا و رغبت کے ساتھ ان تمام آزار کو قبول کیا کوئی جوابی کارروائی نہ کی جو اس کے کردار کی استقامت کی غمازی کرتا ہے۔

کام تھا فریاد و زاری سے اُسے ؛ تھا قرار اک بیقراری سے اُسے
جب کئی دن رہا یہ اس کا حال ؛ پاس والوں کو ہوا جینا محال
سب نے اس خود رفتہ سے جا کر کہا ؛ یاں نہیں ہے مصلحت رہنا تیرا
چین اپنا بھی ہمیں مطلوب ہے ؛ یاں سے اٹھ جانا ہی تیرا خوب ہے
الغرض یوں ہی وہ محنت آشنا ؛ بے سر و پا شہر میں پھرنے لگا
پھر تو باہم مل کے سب خورد و کلاں ؛ جان کر دیوانۂ بے خانماں
جس سے جو آزار پہنچایا گیا ؛ سر پہ اس شیدا کے سب آیا گیا
سنگِ طفلاں سے بدن تھا خونچکاں ؛ قد تھا اس کا رشکِ نخلِ ارغواں
الغرض یاں تک ہوئے سرگرم قہر ؛ آخرش اس کو کیا بیرونِ شہر

کر کے اس خارِ دلی سے یوں فراغ ❊ یہ تو آئے گھر کو اپنے باغ باغ

درویش کی شب و روز کی خدمت کی وجہ سے نوجوان ہوش میں آنے لگتا ہے مگر ایک ہفتہ بھی ہوتے نہیں پاتا کہ نوجوان پر سانحۂ عظیم گزرتا ہے۔ شہزادی کی ڈولی اس کے مسکن کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ ڈولی کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو نوجوان شہزادی پر عاشق ہو جاتا ہے۔

بسکہ تھی دلکش بہ شدت واں ہوا ❊ اُڑ گیا پردہ کہیں چنڈول کا

بے تکلف وہ بلائے روزگار ❊ ہو گئی اس دل جلے سے چشم چار

جوں نظر اس کی نظر سے واں لڑی ❊ خرمن جاں پر وہاں بجلی پڑی

تھی نگہ یا ناوک خونخوار تھی ❊ آنکھ کے ملتے ہی دل کے پار تھی

شہزادی کی ڈولی روانہ ہوتے ہی نوجوان کا صبر و قرار ختم ہو جاتا ہے وہ ڈولی کے ہمراہ چلتا ہے۔ ڈولی جب نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے تب ایک بلند درخت پر چڑھ جاتا ہے اور بے خبری میں درخت سے گر کر فوت ہو جاتا ہے۔ عشق کی شان رکھ جاتا ہے۔

وہ چلی واں صبر یہاں اس سے چلا ❊ ہو گیا رازِ نہفتہ برملا

آہ دل سے کھینچ کر بے اختیار ❊ ہو لیا ہمراہ مانندِ غبار

بڑھ گئی اس میں سواری ٹک جو دور ❊ اور بھی بیکل ہوا یہ ناصبور

تھا درخت یک وہاں نہایت ہی بلند ❊ جس کی تھی ہر شاخ گردوں کی کمند

چڑھ گیا اس پر کہ اور ایک آدھ دم ❊ دُور سے ہی دیکھتا ہے مغتنم

جوں ہوا اس کی نظر سے وہ نہاں ❊ پھر رہی اپنی خبر اس کو نہ یاں

تھا شجر پر یا کہ جوں پختہ ثمر ❊ گرتے ہی تھا لاکھ ٹکڑے خاک پر

جب تلک اس خستہ تن میں جی رہا ❊ پاس ناموس محبت ہی رہا

دوسرا کردار شہزادی کا ہے۔ شہزادی جب تک نوجوان پر عاشق نہیں ہوئی تھی اس وقت تک وہ بے نیاز اور سراپا ناز تھی اس وقت کی تصویر لطف نے اس طرح کھینچی ہے :۔

آفتِ دوراں بلائے روزگار ❊ کر کے عزمِ سیر دختِ شہریار
کرنے تسخیر غزالانِ ختن ❊ نکلی تھی با دامِ زلف پر شکن
صید کرتی تھی کمندِ ناز سے ❊ وحشیوں کو سینکڑوں انداز سے
تھے شہادت خواہ ہر یک سر بکف ❊ محوِ نظارہ ہوا آہو صف بہ صف
سینکڑوں تھے بے زباں اس کے ہدف ❊ ناوکِ بیداد پھیرے جس طرف

نوجوان کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد شہزادی سراپا نیاز ہو گئی اسکے مزاج میں تبدیلی آگئی۔ وہ اس کے فراق میں آہ وزاری کرنے لگی :۔

ہر رگِ گل اس کو نوکِ خار تھی ❊ فرشِ گل پر بے کلی سے زار تھی
بادمِ سرد اور آہِ سینہ سوز ❊ گزرے اس حالت میں جب دو چار روز
کیسی طغیانی کہ دیوانی ہوئی ❊ دردِ دل کی پھر تو طغیانی ہوئی
خود بخود کچھ دم رکا جاتا ہے آج ❊ بولی جی شدت سے گھبراتا ہے آج
سانس لینی آج تو دشوار ہے ❊ کچھ نہیں کھلتا یہ کیا اسرار ہے
خوش نہیں آتا رخِ خنداں مجھے ❊ قصرِ شاہی ہے یہ زنداں مجھے

نوجوان کی فرقت میں بے تاب شہزادی دیوانہ وار اپنی چند محرمِ راز کنیزوں کو لے کر نوجوان کے مسکن پر پہنچتی ہے۔ جب نوجوان کی اندوہناک موت کی خبر سنتی ہے تو اپنے والدین کی ناموس کی پرواہ کئے بغیر نوجوان کی قبر پر پہنچ کر گر پڑتی ہے۔ یہاں لطف نے شہزادی کے کردار کی بہترین عکاسی کی ہے :۔

گرچہ تھے انجم صفت سب سدِّ راہ ❊ پھر کوئی روکے سے رکتی تھی وہ ماہ

اپنی ہی مطلق نہ تھی اس کو خبر ٭ ہووے کس کو پاسِ ناموسِ پدر
مضطرب افتاں و خیزاں برق وار ٭ پہنچی اس بیدل تلک حد بے قرار
کر کے یک آلودہ حسرت نگاہ ٭ گر پڑی مرقد پہ اس کی بھر کے آہ

تیسرا کردار مخلص و ہمدرد درویش کا ہے نوجوان سے جب درویش کی پہلی ملاقات ہوتی ہے تب وحشت میں نوجوان درویش سے گفتگو نہیں کرتا۔ یہ کردار خلوص و محبت کا پیکر ہے۔ وہ نوجوان کی شب و روز بے لوث خدمت کرتا ہے۔

وہ جو رہتا تھا فقیرِ خستہ حال ٭ کر کے کوئی غم زدہ اس کو خیال
آ کے استفسارِ حال اس سے کیا ٭ دیر تک یک قیل و قال اس سے کیا
جس قدر کوشش کی اس درویش نے ٭ کچھ کہا مطلق نہ اس دلریش نے
تب تو وہ سمجھا کہ دیوانہ ہے یہ ٭ عقل سے یک لخت بیگانہ ہے یہ
جان کر درویش نے مہجورِ یار ٭ مغتنم سمجھا اسے قربِ دیار
بسکہ تنہائی سے تھا خود جاں بلب ٭ دل سے تھا مصروفِ خدمت روز و شب

جب شہزادی کے حکم سے اس کی کنیز درویش کے قریب جا کر نوجوان کا حال پوچھتی ہے تو درویش نوجوان کو یاد کر کے رونے لگتا ہے۔ لطف نے درویش کے کردار کا بہت اچھا مرقّع پیش کیا ہے۔

جا کے نام اس دل جلے کا جوں لیا ٭ بے تحاشا اس گدا نے رو دیا
جب تلک اس خستہ تن میں جی رہا ٭ پاسِ ناموسِ محبت ہی رہا
جان دی پر شان اپنی رکھ گیا ٭ وا چھڑے کیا آن اپنی رکھ گیا
سادگی سے وہ فقیرِ بے خبر ٭ کہہ گیا روداد ساری سر بسر

منظر نگاری :-

لطف کی مثنوی ایک حزنیہ ہے جس میں بزم آرائی اور بہاریہ منظر کشی

کا موقعہ نہیں ملتا اور نہ اس مثنوی میں اس کی گنجائش تھی۔ اس کے باوجود لطف نے اس مختصر مثنوی میں منظر نگاری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ بہار کے موسم کا مرقع نوجوان کے وہاں پہنچنے کا حال لطف نے بہت حسین انداز سے پیش کیا ہے۔

بہار کی آمد کا حال لطف سے سنیئے:۔

اتفاقاً ان دنوں تھی فصلِ گُل ✤ بلبلوں کو تھا میسّر فصلِ گُل

زور کیفیت سے آئی تھی بہار ✤ مژدہ دیوانوں کو لائی تھی بہار

سبز و خورم ہر خس و خاشاک تھا ✤ صحنِ صحرا گنبد افلاک تھا

تھا زمرّد گوں بساطِ مرغزار ✤ قطعۂ مخمل میں آب جوئبار

دیکھ دیوانے یہ صحرا کا جوش ✤ بے تحاشا کر اٹھا دل سے خروش

پھر تو کی شورش جنوں نے اس قدر ✤ فصلِ گُل کی بھی نہ تھی اس کو خبر

ہم فغاں ہوتا تھا بلبل سے کبھی ✤ جا الجھتا زلفِ سنبل سے کبھی

روتا قمری کی گہے فریاد سے ✤ گہہ بگڑتا وہ قدِ شمشاد سے

شورِ طاؤساں سے گھبراتا کبھی ✤ پات کے کھڑکے سے ڈر جاتا کبھی

نالہ آموز عندلیبوں کا تھا گہہ ✤ گاہ تھا آبِ رواں کا سدِّرہ

ہم زبانی اس کو گہہ سوسن سے تھی ✤ گاہ نرگس سے بندھی تھی ٹکٹکی

خندۂ گل پر کبھی روتا تھا زار ✤ گریۂ شبنم پہ ہنستا بے شمار

مکالمے:۔

لطف نے مکالمہ نگاری کے ذریعہ قصّے میں ڈرامائی انداز پیدا کیا ہے۔ شہزادی نوجوان کے مسکن پر پہنچ کر اپنی کنیز کو درویش کے پاس بھیجتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ نوجوان کا پتہ معلوم کرے۔ لطف کی مکالمہ نگاری کا انداز ملاحظہ ہو:۔

بولی یوں اک خادمہ سے بے حجاب ✤ پوچھ اس درویش سے جا کر شتاب

آج وہ دیوانۂ آفت قریں ٭ کیا سبب ہے جو نظر آتا نہیں
جوشِ وحشت میں مگر وہ مستمند ٭ اور کوئی دشت کر بیٹھا پسند
لا خبر اس بے خبر از خویش کی ٭ سینہ چاک و جاں بلب دلریش کی
دیکھ یوں اُس شمع رو کو بے قرار ٭ مضطرب یہاں سے چلی وہ شعلہ وار

خادمہ درویش کے پاس جا کر نوجوان کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ نوجوان کا نام سُن کر درویش بے تحاشا رونے لگتا ہے۔ نوجوان کی اندوہناک موت کا حال خادمہ کو بیاں کرتا ہے۔

جا کے نام اس دل جلے کا جوں لیا ٭ بے تحاشا اس گدا نے رُو دیا
اور کہا مت پوچھ اس شیدا کا حال ٭ زندگی ہو جائے گی ناحق وبال
وہ تو دیوانہ ہے ایسی کر گیا ٭ تازہ پھر آئینِ قیسی کر گیا
یہ بلا سوجھی تھی اس ناشاد کو ٭ رشک شاید جس پہ ہو فرہاد کو
جب تلک اس خستہ تن میں جی رہا ٭ پاسِ ناموسِ محبت ہی رہا
جان دی پر شان اپنی رکھ گیا ٭ واپچھڑے کیا آن اپنی رکھ گیا
سادگی سے وہ فقیر بے خبر ٭ کہہ گیا روداد ساری سر بسر
کر کے سب اوّل سے آخر تک بیاں ٭ اس کی مرقد کا دیا اس کو نشاں
سنتے ہی جوں برق یہ یہاں سے چلی ٭ کیا چلی اور ایک آفت لے چلی

خادمہ درویش سے سارا ماجرا سن کر شہزادی کے پاس پہنچکر نوجوان کا حال بیان کرتی ہے شہزادی اپنے عاشق صادق کی دردناک موت کی خبر سنکر حیراں رہ جاتی ہے صبر و تاب رخصت ہو جاتا ہے بے اختیار ڈولی سے دیوانہ وار اتر کر نوجوان کی مرقد پر پہنچتی ہے۔ حسرت سے آہ بھر کر نوجوان کی مرقد پر گر پڑتی ہے۔

جو سنی اس رشک مہ نے یہ خبر ٭ رہ گئی حیراں منہ اس کا دیکھ کر

بعد کتنی دیر کے اپنے میں آ ٭ بولی ظالم پھر تو کہہ یہ کیا کہا
پھونکی کیا آتش پہ تونے ہے غضب ٭ جل گیا کاشانۂ دل جس سے سب
کر دیا غارت متاعِ صبر و تاب ٭ ہو گیا قیصر توانائی خراب

زبان و اسلوبِ بیاں اور شعری محاسن کے اعتبار سے بھی لطف کی یہ مثنوی اردو شاعری کے سرمایہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ غزل اور قصیدے کے ضمن میں لطف کے اسلوب کی جن خصوصیات کا مطالعہ کیا گیا وہ مثنوی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں لطف کی مثنوی سے صنعت کاری اور تشبیہہ نگاری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

تشبیہات:۔

لطف نے جو سادہ و مرکب تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں آج بھی ندرت برقرار ہے۔ مثلاً قدما اور متاخرین محبوب کی مانگ کو کہکشاں سے تشبیہہ دیتے آئے ہیں لیکن لطف نے سبزہ زار کے درمیان بہنے والی ندی کو کہکشاں سے تشبیہہ دیکر ندرت پیدا کی ہے۔

سبزۂ دلکش میں تھا یوں آبِ رود ٭ چرخ پر ہو کہکشاں جیسے نمود

چند اور تازہ تشبیہات ملاحظہ کیجئے۔

ہر شکن اس زلفِ عنبر فام کی ٭ تھی گرہ پیشانئ ناکام کی

لطف نے تشبیہات کا استعمال محض روایتی انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ ان سے پیکر تراشی اور جذبات نگاری کا کام بھی لیا ہے۔

شہزادی نے نوجوان سے کوئی التفات آمیز برتاؤ نہیں کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ خوشی دل سے رخصت ہو جائے۔ اس کیفیت کو لطف نے اس طرح بیاں

کیا ہے جو محسوساتی تشبیہ کی عمدہ مثال ہے۔

؎ یوں خوشی بھاگی دلِ ناکام سے
مرغ وحشی ہو رہا جوں دام سے

محسوساتی تشبیہ کے بارے میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے۔

"محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے کیوں کہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذکر کے ساتھ فوراً ان کی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اسی لئے مشبہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں ہیں مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان ہے۔ ؎

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے" [۱]

لطف کی محسوساتی تشبیہ میر انیس کی اس تشبیہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

جب شہزادی درویش کے مسکن سے اپنے محل میں واپس آتی ہے اور نوجوان کو درخت سے گرنے کے بعد پیوندِ خاک کر دیا جاتا ہے اس وقت شہزادی اپنے آپ میں اچانک تبدیلی پاتی ہے اور اپنے دل کو زیر بارِ عشق محسوس کرتی ہے لیکن مارے شرم کے اظہارِ حال نہیں کر سکتی۔

؎ پر حیا از بس کہ دامن گیر تھی
بے صدا جوں بلبل تصویر تھی

کسی کے برجستہ حال کو دیکھ کر اپنے حال کو سپند سے تشبیہ دینا حال اور سپند کی نئی تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ خال اور سپند کی سیاہی ہے۔

---

[۱] موازنہ انیس و دبیر (مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں) (الہ آباد ۱۹۷۰ء) ص ۱۱۰

۵ دیکھتا برجستہ گر اک خال تھا
جوں سپند اس کا پھر اور ہی حال تھا

تشبیہ کے علاوہ اس شعر میں تجنیس خطی حال اور خال ہے۔

لطف نے لختِ دل کو گلبرگ تر" سے "گفتار" کو "آہ آتش باد" سے "خونچکانِ جسم کو" "نخلِ ارغواں" سے "دیوانہ وحشت نژاد" کی دشت پیمائی کو "غبار گردباد" سے "دل" کو "غنچہ" سے "آہ" کو "غبار" سے تشبیہ دی ہے۔

چشم سے جاری تھا خونابِ جگر ⁂ لختِ دل مژگاں پہ تھے جوں گلبرگِ تر
سوزِ دل سے اس کی جو گفتار تھی ⁂ سو فقط اک آہ آتشبار تھی
سنگ طفلاں سے بدن تھا خونچکان ⁂ قد تھا اس کا رشکِ نخلِ ارغواں
واں ہوا دیوانۂ وحشت نژاد ⁂ دست پیماں جوں غبارِ گرد باد
دیکھتے ہی وہ مکان سایہ دار ⁂ کھل گیا یک بارگی دل غنچہ وار
آہ دل سے کھینچ کر بے اختیار ⁂ ہو لیا ہمراہ مانندِ غبار

لطف نے سادہ تشبیہات کے علاوہ مرکب تشبیہات بھی نہایت ہی سلیقہ سے استعمال کئے ہیں۔

ہر سبزانِ چمن ہر صبح و شام ⁂ دھوتی تھی شبنم عقیقِ گُل کے جام
شعلہ کھینچا آتش جانکاہ نے ⁂ سرکشی کی نونہالِ آہ نے

"گل" کو "جام" سے تشبیہ دینا تشبیہ سادہ ہے لیکن "عقیق گُل کا جام" مرکب تشبیہ ہے۔ اس شعر میں مرکب تشبیہ کے علاوہ حسنِ تعلیل بھی ہے۔ شبنم تو پھولوں پر گرتی ہی ہے لیکن شاعر شبنم کے گرنے کی علت یہ بیان کرتا ہے کہ وہ "سبزانِ چمن" کیلئے "عقیقِ گل، کے جام" دھونے کے لئے گرا کرتی ہے۔ دوسرے شعر میں "آتش جانکاہ" اور "نونہالِ آہ" مرکب تشبیہات ہیں ان تشبیہات کے علاوہ اس شعر میں رعایت لفظی

بھی ہے (شعلہ اور آتش کھینچا اور سرکشی)۔

استعارے:۔

لطف نے اگرچہ کہ استعاروں سے بہت کم کام لیا ہے لیکن جہاں بھی انھوں نے استعارے سے کام لیا ہے وہاں معنی کو استعارہ کی مدد سے روشن دیکھایا گیا ہے۔

نرگسِ فتان کسی مئے نوشں کی ؛ ہوگئی غارت گر اس کے ہوش کی
بے تکلف وہ بلائے روزگار ؛ ہوگئی اس دل جلے سے چشم چار

نرگس کہہ کر مست آنکھیں مراد لینا، محبوب کے کنائے کے لئے بلائے روزگار کی ترکیب اور دل جلا کہہ کر عاشق کے معنی مستعار لینا استعارہ اور کنایہ کا حسن ہے۔ لطف نے جا بجا پُر لطف تمثیلوں سے مثنوی میں حسن پیدا کیا ہے۔

تمثیل:۔

جوں نظر اس کی نظر سے وہاں لڑی ؛ خرمن جاں پر وہاں بجلی پڑی
کی سپاہ درد نے لشکر کشی ؛ ہوگیا تاراج ملک سرخوشی
صید لاغر کو اٹھا کر خاک سے ؛ ننگ سمجھے باندھنا فتراک سے

تشخص:۔

استعارے کی ایک قسم تشخص ہے۔ لطف نے اپنی اس مثنوی میں تشخص سے جا بجا کام لیا ہے۔

بہکی بھرتی تھی نسیم آب جو ؛ مثلِ مستاں بے تکلف چار سو
خونِ دل تھا مارتا غنچوں سے جوش ؛ سو زباں داری پہ سوسن تھی خموش
ایسی آفت سے کسی کا کیا چلے ؛ تھیں وہاں نرگس کی بھی آنکھیں تلے
صبر نے یک دست رو پنہاں کیا ؛ ہے جواب صاف طاقت نے دیا
تھا کھڑا شمشاد یک سو منفعل ؛ سرو تھا حیرت سے یک جا پا بہ گل

۳۲۰

رعایتِ لفظی:-

اردو شاعری میں رعایت لفظی یا ضلع جگت کے امام امانت لکھنوی تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن رعایت لفظی میں بے اعتدالی کی وجہ سے وہ بدنام ہیں امانت کی بے اعتدالی کی مثال اس شعر سے واضح ہوتی ہے۔

لختِ دل کو کترے گی بلّی ترے دروازے کی
رختِ تن کو کھائے گا چوہا تمہاری ناک کا

رعایتِ لفظی کو مقصود بذات بنایا جائے تو شعر اصلیت سے دور ہو جاتا ہے لیکن لطف نے الفاظ کا انتخاب اکثر اس سلیقے سے کیا ہے کہ ان سے مفہوم پورے طور پر ادا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے الفاظ اس کی مناسبت کلام میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔

گر نظر آتا کوئی غنچہ دہاں ÷ ساتھ یہ دل تنگ ہوتا غنچہ ساں
کر کے اس خار دلی سے یوں فراغ ÷ یہ تو آئے گھر کو اپنے باغ باغ
ہم زبانی اس کو گہہ سوسن سے تھی ÷ گاہ نرگس سے بندھی تھی ٹکٹکی
ہم فغاں ہوتا تھا بلبل سے کبھی ÷ جا الجھتا زلفِ سنبل سے کبھی
جب تلک مدِ نظر تھا وہ غبار ÷ میلِ بالا رکھتا تھا یہ خاکسار

غنچہ دہاں، دلتنگ۔ خار، باغ باغ۔ زبان، سوسن، نرگس ٹکٹکی۔ فغاں، بلبل، اُلجھتا، زلف۔ سنبل۔ غبار، خاکسار، یہ سب رعایتِ لفظی میں جو حدِ اعتدال سے زیادہ یا مضحکہ خیز نہیں۔

تضاد:-

خندہ گُل پر کبھی روتا تھا زار ÷ گریہ شبنم پہ ہنستا بے شمار
سرد مہری ہے ہر یک ہمدم نے کی ÷ گرم جوشی ہاں مگر اک غم نے کی

جس جگہ بیٹھا برنگِ نقشِ پا — واں سے اُٹھنا اس کا پھر مشکل ہوا

جس جگہ تھا وہ فقیرِ نامراد — ہوش میں آنے سے دیوانے کے شاد

ایہام:۔

مہر کیوں کر اس پہ ہو اس ماہ کو
کیا تناسب ہے گدا کو شاہ کو

پہلے مصرعے میں ماہ کی رعایت سے مہر کے معنی قریب سورج ہوتے ہیں لیکن لطف نے یہاں مہر بہ معنی محبت استعمال کر کے ایہام کی اچھی مثال پیش کی ہے۔

استبعاد:۔

کام تھا فریاد و زاری سے اسے
تھا قرار اک بے قراری سے اسے

سہ حرفی صنعت:۔

وہ جو ہمدم ہم نفس ہمراہ ہے
سو فقط یک نالہ جانکاہ ہے

سیّاق الاعداد:۔

جس قدر تڑپا کیا یہ نیم جاں
رحم آیا ایک کو اس پر نہ واں

لطف نے ضرب الامثال اور محاوروں کو بھی جا بجا مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

ہے مثل مشہور سب ہوشیار و مست
کہتے ہیں "دیوانہ را ہوے بس است"

شور طاؤساں سے گھبراتا کبھی

"پات کے کھڑکے" سے ڈر جاتا کبھی

تھا جنوں میں گرچہ نو مشقِ خرام

پر اڑا دی خاک "صحرا" کی تمام

کہتے ہیں کہ صنعتوں کی بہتات سے کلام میں تصنّع پیدا ہوتا ہے جوش و اثر باقی نہیں رہتا لیکن صنعتوں کے استعمال میں اعتدال شعر حُسن و اثر کو بڑھا دیتا ہے۔ لطف نے صنعتوں کو بہت ہی اعتدال کے ساتھ برتا ہے۔ کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی خاص صنعت کے لئے شعر کہا گیا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صنعت خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔

تجنیس (تمام) کی مثال:۔

ہول دل کا گرچہ تھا کب سے خلل ٭ پر نہیں کل سے دلِ بے کل کو کل

کل = بمعنی روزِ گذشتہ۔ بے کل = بمعنی بے چین۔ کل = بمعنی قرار

تجنیس کی دوسری مثالیں:۔

دیکھ کر ایسا اسے بے نام و ننگ ٭ ہو گئے پیر و جواں جاں سے بہ تنگ

"تنگ" اور "ننگ" میں تجنیس ناقص واقع ہوئی ہے۔

پر نہ یہ اس وقت بات اس پر کھلی ٭ ہے یہ بھجوائی اسی سفاک کی

پہلے مصرعے میں "پر" بہ معنی لیکن اور مصرعے کے آخر میں "پر" بہ معنی اوپر استعمال ہوا ہے۔[1]

---

[1] مولانا روم نے لفظ پر کو ایک مصرعہ میں اڑنے کے معنوں میں اور دوسرے مصرعے میں بال و پر کے معنوں میں استعمال کر کے تجنیس تام کی بہت ہی اعلیٰ مثال پیش کی ہے ؎

اگر یک سرِ موی برتر پرم ٭ فروغِ تجلّی بسوزد پرم

ترکیبی قافیہ :-

گرچہ غمخوار دل دیوانہ تھا ٭ انقباض دل کو پر سمجھا نہ تھا

"دیوانہ تھا" کے مقابلے میں "سمجھا نہ تھا" قافیۂ ترکیبی ہے۔ غالب نے بھی اس قسم کے قافیہ استعمال کئے ہیں۔ ؎

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا ٭ میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ٭ لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

حُسنِ تعلیل :-

آہ گرم اس کی سے ہو شب صبح تک
چشمِ انجم کی نہ لگتی تھی پلک

تلمیح :-

لطف نے ۱۱۱ اشعار میں کہیں بھی کوئی قصہ طلب تلمیح کا استعمال نہیں کیا ہے صرف ایک جگہ اختتامیہ میں شیر اور سلمانؑ کی مذہبی تلمیح سے اپنے کلام کی بلاغت میں اضافہ کیا ہے ؎

ہے رہائی اس سے اب اس شہ کے ہات ٭ شیر سے سلمانؑ کو دی جس نے نجات

مذہبی کتابوں میں معتبر راویوں کے حوالے سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلمانؓ فارسی مدائین یا کسی اور صحرائی علاقے سے گزر رہے تھے کہ اچانک شیر ببر سے ان کا سامنا ہوا قریب تھا کہ شیر ببر سلمانؓ پر حملہ کرتا ایسے میں ایک سوار نمودار ہوا سوار کو دیکھتے ہی شیر ببر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سوار حضرت علیؑ تھے جنھوں نے سلمان فارسی کو شیر ببر کے حملہ سے بچایا۔ یہ تلمیح ہم کو فارسی قصائد میں ملتی ہے یا پھر انیسؔ و دبیرؔ وغیرہ کے مرثیوں میں۔

جیسا کہ اس مقالے میں لکھا جا چکا ہے کہ لطف کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ نوجوانی میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ میں انھوں نے اپنی مثنوی کو لکھا مگر ان کی مثنوی میں وہی

سادگی اور روانی ہم کو نظر آتی ہے جو دبستانِ دہلی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

بعض متروک الفاظ مثلاً دہیں گی، زدھی، جوں، نیٹ، نت وغیرہ) سے جو لطف کے زمانے میں مروّج تھے، قطع نظر کر لی جائے تو لطف کی زبان بالکل آج کل کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ بیشتر اشعار سلاست اور روانی کا اچھا نمونہ ہیں۔ لطف نے مثنوی میں غزل کے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے جس کی وجہ مثنوی میں سہل ممتنع اور غزل کا غنائی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

گر نہ ہو سینہ پہ تیرے غم کا داغ
ہو چکا تھا کشورِ دل بے چراغ
یوں خوشی بھاگی دلِ ناکام سے
مرغِ وحشی ہو رہا جوں دام سے
ورنہ کرتی تھی وفا کب زندگی
ہے تصوّر سے ترے اب زندگی
ہے کوئی ترچھی نگاہ دل میں کبھی
یا کوئی کافر پلک جی میں چبھی
کشتہ کس چشمِ سیاہ کا ہے یہ آہ
اشک ہے جس کے تصوّر سے سیاہ

لطف کے ان اشعار میں غزل کا تیکھا پن شاعرانہ تعبیرات اور طنز دیکھئے:۔

سرد مہری ہے ہر اک ہمدم نے کی ٭ گرم جوشی ہاں مگر یک غم نے کی
گر نہ ہو سینہ پہ تیرے غم کا داغ ٭ ہو چکا تھا کشورِ دل بے چراغ
کرتی دلداری ٹک آہ سرد ہے ٭ مونسِ جاں ہے اگر تو درد ہے
سوزِ دل کی جب گزر جاتی ہے حد ٭ اشکِ دل سوزی سے کرتا ہے مدد

زندگانی ہوگئی جی کا وبال
مرگ کا مانع ہوا تیرا خیال
ورنہ کرتی تھی وفا کب زندگی
ہے تصوّر سے ترے اب زندگی
زیست کا یہ کونسا اسلوب ہے
موت ایسی زندگی سے خوب ہے

نوجوان کی حسن پرستی کی لطف نے بہترین عکاسی اس شعر میں کی ہے۔

دیکھتا دلکش کوئی صورت اگر
پھر نہ اپنی اس کو کچھ رہتی خبر

قصے کے ضمن میں لطف نے بعض جگہ ایسے اشعار بھی استعمال کئے ہیں جن میں قصّے کے انجام کی طرف اشارے قاری کو واضح طور پر ملتے ہیں۔

خاک میں ہو گر نہ اس کو وصلِ یار
حشر تک عاشق کو رکھے بے قرار
زندگی میں گر رکھے عاشق سے فصل
خاک میں دے بعد مرنے کے یہ وصل

ایک بات جو لطف کی مثنوی میں بُری طرح کھٹکتی ہے وہ الفاظ کی بے جا تکرار ہے۔ الفاظ کی تکرار کے اس عیب کو فارسی میں "بیضۂ نہادن مولانا ہاتفی" کہا جاتا ہے "بیضۂ نہادن" بھی ایک تلمیح ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا عبداللہ ہاتفی (متوفی ۹۲۷ھ) نے داستانِ لیلیٰ مجنوں کو مثنوی کے قالب میں ڈھالنے کے لئے عبدالرحمٰن جامیؒ سے مشورہ کیا اور اجازت چاہی۔ جامیؔ نے آزمائش کے لئے فردوسی کے یہ تین شعر ہاتفی کو سنائے اور کہا کہ تم بھی مضمون اپنے الفاظ میں ادا کرو! اگر تم یہ مضمون ادا کر سکو تو

لیلیٰ مجنوں" کو بھی نظم کر سکو گے۔

درختی کہ تلخ است وی را سرشت
گرش بر نشانی بہ باغِ بہشت
ور از جوی خلدش بہ ہنگام آب
بہ بیخ انگبیس ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد
ہماں میوۂ تلخ بار آورد

(فردوسی)

ہاتفی نے اس مضمون کو چار اشعار میں نظم کیا ؎

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت
نہی زیر طاؤس باغِ بہشت
بہ ہنگامِ آں بیضہ پروردنش
زانجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل
در آں بیضۂ دم دزد بہ جبرئیل
شود عاقبت بیضۂ زاغ زاغ
کشد رنجِ بیہودہ طاؤسِ باغ

ان اشعار کو سنتے ہی جامی نے کہا ہر چند کہ تم نے ہر شعر میں (ایک انڈا دیا ہے) اس کے باوجود تم "لیلیٰ مجنوں" نظم کر سکتے ہو۔

اگر ہاتفی نے ہر شعر میں ایک بیضہ رکھا ہے تو لطف نے بھی مثنوی کی ابتدا میں لفظ "زور ہی" کو کئی جگہ استعمال کیا ہے جو مخلِ فصاحت ہے۔

عشق زور ہی برق خرمن سوز ہے
عشق زور ہی ناوکِ دلدوز ہے
عشق زور ہی خانہ بر انداز ہے
عشق گہہ سوز گاہے ساز ہے
عشق کوئی زور ہی خوں ریز ہے
عشق یک طرفہ بلا انگیز ہے
الغرض ہے زور ہی نیرنگ باز
ہے کبھی درد اور کبھی چارہ ساز

قافیوں کے استعمال میں بھی بعض جگہ لطف کو سہو ہوا ہے اور انھوں نے معروف و مجہول کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جو قواعدِ فن کے لحاظ سے فاش غلطی ہے ؂

گر کوئی آزردہ یا خوش اس سے ہو
تھی کسی سے کچھ نہ اس کو گفتگو

"ہو" اور "گفتگو" اجتماع معروف و مجہول ہے جو غلط ہے۔ یہاں یہ تاویل کیجا سکتی ہے کہ لطف چونکہ ایرانی نژاد تھے اور ایران کے اساتذہ معروف و مجہول کے فرق کو زیادہ معیوب نہیں سمجھتے اس لئے ان ہی کی پیروی میں لطف نے اس اجتماع کو جائز رکھا ہے غالب کے پاس بھی ہم کو ایسے قوافی ملتے ہیں جس میں معروف و مجہول کا اختلاف ہے مثلاً

گئی وہ بات ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

لطف نے ایک جگہ "دشتِ گل" اور "خطِ گل" قافیہ کہا ہے ؂

کوہ اور صحرا اسے لے تا دشتِ گل ٭ تھی ہر اک تختہ پہ مشقِ خطِ گل

"دشت گل اور" "خطِ گل" غلط قوافی ہیں۔ اگر "خطِ گل" کو نستعلیق کی اصطلاح میں خط کی ایک قسم مان لیا جائے اور پہلے مصرعے کے "گل" اور دوسرے مصرعے کے "گل" کو ردیف کی بجائے ہم ردیف و ہم قافیہ سمجھا جائے تو "خطِ گل" "علم" ہونے کے اعتبار سے درست قافیہ ہے لیکن خطاطوں کی تقیم کے لحاظ سے اس طرز کا صحیح نام "خطِ گلزار" ہے "خطِ گل" نہیں۔

ایرانی نژاد ہونے کے لحاظ سے ایک جگہ لطف نے "کہ اے" کا تلفظ ایرانیوں کے لہجہ میں "کای" باندھا ہے ؎

کہ اے کای وفا دشمن یہ کیا آئین ہے
مسلمان کو نا یہ دین ہے

دوسرے مصرعے میں "نا سلماں" میں نا کا پیشاوند خالص فارسی ہے۔ اردو والوں نے اس کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے لبعض جگہ املا کی غلطیاں ہیں، لبعض مصرعے ناموزوں ہو گئے ہیں اور ایک آدھ جگہ لفظ کا انتخاب غلط ہوا ہے جو کھٹکتا ہے تعقیدِ لفظی کی مثالیں ایک آدھ نظر آتی ہیں۔

پھر تو باہم مل کے سب خورد و کلاں ❊ جا لگی کر دیوانۂ بے خانماں
سبز و خورم ہر خس و خاشاک تھا ❊ صحن صحرا گنبدِ افلاک تھا

"خورد" بجائے "خرد" اور "خورم" بجائے "خرم" محلِ نظر ہے ہو سکتا ہے یہ (اصلاحِ کاتب) ہو

یہ شعر ؎ سطح آئینہ تھا سنگ آبشار ❊ مست قہقہہ تھے تدرو کوہسار

دوسرا مصرعہ ناموزوں ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے

اس شعر میں "نے" کا استعمال محلِ نظر ہے ؎

جا کے نام اُس دل جلے کا جوں لیا ❊ بے تحاشا اُس گدا نے رو دیا

تعقیدِ لفظی کی مثال:-

آہ گرم اُس کی سے ہر شب صبح تک ؛ چشمِ انجم کی نہ تھی لگتی پلک

"اُس کی سے" میں بدترین تعقیدِ لفظی ہے۔

لطف کی رُباعیات

لطف کا جو کلام مختلف تذکروں اور مخطوطات میں دستیاب ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لطف نے چھ اردو رباعیاں کہی ہیں۔ دیوانِ لطف میں صرف پانچ رباعیاں موجود ہیں۔ یہی پانچ رباعیات تذکرہ گلشنِ ہند سالار جنگ میوزیم لائبریری اور اسٹاٹ بیلیوتھک جرمنی کے نسخوں میں بھی موجود ہیں۔ ان پانچ رباعیات میں سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے گلشنِ ہند کی ترتیب و تصحیح کے وقت صرف دو رباعیاں ہی منتخب کی ہیں[1]۔

لطف کی سب رباعیات ایجاز و اختصار کا اعلیٰ نمونہ ہیں رباعی کے بارے میں "گاگر میں ساگر" کی جو خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ وہ خصوصیت لطف کی رباعیوں میں موجود ہے۔ لطف نے اپنی رباعی کے تین مصرعوں کو پس منظر قرار دیتے ہوئے چوتھے مصرعے میں اصل تصویر پیش کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر رباعی کا چوتھا مصرعہ

---

[1] - مرزا علی لطف تذکرہ گلشن ھند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۵۱

رباعی کی جان ہے۔

عزتِ نفس اور بلند ہمتی کے مضمون پر یہ رباعی دیکھئے :۔

جو خاک نشینوں کے تئیں جانیں سقیم ٭ منہ رکھتے ہیں کیا صاحبِ تاج و دیہیم
گر خم نہ ہو ماہِ نو برائے تعظیم ٭ ہم آنکھ اٹھا نہ دیکھیں گردوں کی طرف

اس رباعی میں عزتِ نفس کے مضمون کے ساتھ ساتھ چوتھے مصرعے میں حسنِ تعلیل بھی ہے۔ ماہِ نو تو خمیدہ ہوتا ہی ہے۔ لیکن شاعر اس کی علت یہ بیان کرتا ہے۔ وہ شاعر کی تعظیم کے لئے خم ہوا ہے اور اگر ماہِ نو تعظیم کے لئے خم نہ ہو تو وہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔

لطف نے زبان کے کسی محاورے کو اپنی رُباعی کے چوتھے مصرعے کی بنیاد بنایا ہے یا ایسا برجستہ مصرعہ کہا ہے جس میں ضرب المثل ہونے کی صلاحیت ہے۔ مثلاً یہ رُباعی۔

جو کوئی کہ آفت ہنسانی مانگے
اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلا دے اُسے تو اپنی شمشیر نگاہ
جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے[۱]

---

[۱] یہ رباعی دیوان لطف، مخطوطات گلشنِ ہند میں موجود نہیں۔ تذکرہ ہندی میں یہی رباعی موجود ہے جس کو ڈاکٹر سلام سندیلوی نے نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کو لطف کی رباعیات کے بارے میں سہو ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"تذکرہ گلشنِ ہند میں مرزا علی لطف نے اپنی کوئی رباعی نہیں پیش کی ہے مگر مصحفی نے "تذکرہ ہندی" میں ان کی ایک رُباعی (مذکورہ بالا) درج کی ہے" ملاحظہ ہو :۔

(اردو رُباعیات (لکھنو ۱۹۶۳ء) ص ۲۳۶) بقیہ مضمون بر صفحہ ۳۴۱

لطف نے بعض رباعیات کسی خاص تقریب میں اور کسی خاص موقعے پر کہی ہیں جب پیشکار دکن مہاراجہ چندو لال شاداں نے اپنا مشہور آئینہ محل بنوایا تو اس وقت لطف نے یہ رباعی کہی :۔

جنت سے کہے بزم میری ضو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو[1]

"آئینہ محل" نام کی رعایت سے "ہر آئینے" کا استعمال اور پھر سکندر کی تلمیح اور منہ تو دیکھو" کے طنز نے رباعی کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

نواب نظام علیخاں آصف ثانی نے ۱۲۱۷ھ (مطابق ۱۸۰۳ء) میں سفر پانگل سے واپسی کے بعد جشن نوروز مقرر کیا تھا جس میں امراء اور عمائدین کو خطاب و منصب اور علم و نقّارے سے سرفراز کیا تھا۔ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ چندا بی بی کو "ماہ لقا بائی" کے خطاب اور نوبت و گھڑیال سے نوازا اس موقعہ پر لطف نے یہ رباعی کہی :۔

نوبت نے مہ لقا کی بصد شوکت
زیر و بم آسماں سے چاہی رفعت
ناہید نے ہنس کے مشتری سے یہ کہا
اب لیلیٰ و شیریں کی کہاں ہے نوبت[2]

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۳۰)

یہ صحیح ہے کہ مندرجہ بالا رباعی تذکرۂ گلشنِ ہند میں موجود نہیں لیکن لطف نے اپنے تذکرہ میں کوئی رباعی پیش نہیں کی یہ صحیح نہیں ہے۔ لطف کی دو رباعیاں مطبوعہ تذکرۂ گلشن ہند میں موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہو گلشنِ ہند مطبوعہ) ص ۱۵۱) مخطوطہ گلشن ہند میں لطف کی پانچ رباعیاں موجود ہیں۔

[1] لطف کے ہمعصر غلام مصطفےٰ خاں سخن نے بھی اپنے اس شعر میں آئینہ محل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

واشد کے لئے دل کے جو گلشن کو چلا ہے ✽ اس سے تو وہ آئینہ محل جائے تو اچھا

ملاحظہ ہو:۔ دیوانِ سخن (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۱۵۹ (ب)

[2] حیاتِ ماہ لقا مرتبہ غلام صمدانی خاں گوہر (حیدرآباد دکن ۱۹۰۶ء) ص ۱۳ کی روایت کے بموجب (بقیہ برصفحہ ۳۳۲)

پہلے مصرعے میں نوبت بہ معنی نقارہ ہے چوتھے مصرعے میں نوبت بہ معنی باری یا زمانہ استعمال ہوا ہے ۔ نوبت کی رعایت "زیر و بم" اور "مہ لقا" کی رعایت سے "ناھید و مشتری"، "لیلیٰ و شیریں" یہ لفظی رعایتیں بھی پُر لطف ہیں ۔

عیدِ قرباں کے موقع پر لطف نے نواب ارسطو جاہ بہادر کی خدمت میں یہ رباعی پیش کی تھی ؛ ۔

دن عید کے دیکھ تیری عالی شانی
چشم آئینہ ساں ہے منظر حیرانی
تصویر ہے فی المثل اگر تیرا عدد
حیراں ہے بَرنگ دیدۂ قربانی ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۳۱)

اس موقع پر کسی شاعر نے یہ فارسی قطعہ تاریخ کہا تھا ۔

نوید آمد بعالم مہ لقا را
نوازش کرد از نوبتِ شہنشاہ
ترانہ ساز سالش گفت ناہید
بلند آوازہ نوبت باد دلخواہ

۱۲۱۷ ہجری

عدد کو تصویر سے تشبیہ دینا اور پھر تصویر کو دیدۂ قربانی کی حیرانی سے تشبیہ دینا محسوساتی تشبیہ اور تشبیہ در تشبیہ کی روشن مثال ہے۔

لطف کے دیوان میں ایک یہ رباعی بھی درج ہے:۔

دے جس کو شراب ناب پانی کا مزہ
کیا خاک ہے اس کو زندگانی کا مزا
اے جان جوانی وہ جوانمرگ مرے
تجھ بن ہو ذرا جیسے جوانی کا مزا

غالباً اس میں نواب ارسطو جاہ کے جوانمرگ اکلوتے بیٹے سپہدار جنگ، سیف الدولہ عرف مالی میاں کی جانب اشارہ کیا گیا۔

لطف کی تاریخ گوئی

لطف کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ آصف الدّولہ کے انتقال پر جو قطعہ تاریخ کہا ہے۔ وہ یادگار ہے۔ مادۂ تاریخ کے مصرعے (آج گُل ہند کا چراغ ہوا) سے "یائے عناد" یعنی (۱۴) عدد کا تخرجہ کیا ہے۔

آصف الدّولہ جب جہاں سے گیا
اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز
خلق کا عیش کا ایاغ ہوا

دشمنوں کا دل آتشِ غم سے
دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کیے
خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دور کرکے پائے عناد
آج گُلِ ہند کا چراغ ہوا[1]
۱۲۱۲ھ

---

[1] گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) لاہور ۱۹۰۶ء) ص ص ۱۴ و ۱۵

جرأت اور ناسخ نے بھی اس موقع پر قطعات تاریخ کہے تھے۔

جرأت:۔

چراغِ ہند تھا نواب آصف الدولہ
بن اس کے شہر جدا رن ہے اور باغ جدا
بغیر اس کے جو عالم ہوا ہے بستہ ہونے
چراغ ہر کی تاریخ ہے چراغ جدا
۱۲۱۲ھ
(کلیاتِ جرأت قلمی مخزونہ لکھنؤ یونیورسٹی ورق ۱۲۱ الف)

ناسخ:۔

الٰہی آصف الدولہ بہادر
بحقِ نائب تو باد مغفور
نوشتم سالِ تاریخِ وفاتش
"بُود یا حیدرِ کرار محشور"
۱۲۱۲ھ
(دیوانِ ناسخ جلد دوم (کانپور ۱۹۰۷ء) ص ۲۱۵)

لطف کا فارسی کلام

لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کا فارسی دیوان دستیاب نہیں ہوتا۔ مجموعۂ فصاحت قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں لطف کے چند قطعات ملتے ہیں جو عیدِ قربان اور عیدِ غدیر کے موقع پر اعظم الامراء کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے۔ ذیل کا قطعہ عیدِ قرباں کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔

تا گردشِ روزگار دوراں باشد
ایامِ خزاں و نوبہاراں باشد
اعدائے تو در خاک و خوں بادِ طپاں
ہر روزِ تو ہمچو عیدِ قرباں باشد

ذیل کا قطعہ غالباً کسی عیدِ غدیر کے موقع پر نواب اعظم الامراء کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

زمانہ ناز کند بر نوازشِ تقدیر
بعصر اعظم الامراء وزیر بے نظیر
ز دودمانۂ کسریٰ امیر ابنِ امیر
بگو خوش است بعیش و سرورِ عیدِ غدیر

عیدالفطر کے موقع پر یہ قطعہ پیش کیا گیا تھا۔ اس میں لفظی رعایت اور صنعتِ تضاد کا استعمال فن کاری کے ساتھ ہوا ہے۔

عالم روشن ز شمع اقبالت باد
عیشِ دو جہان قرینِ احوالت باد
ہر جا شبِ قدر و روزِ عیدی باشد
جمع آمدہ اجزائے مہ و سالت باد

کتابیات

کتابیات

۱۔ ابوالحسن امیر الدین احمد — مسرت افزا (مترجم ڈاکٹر حبیب قریشی) (دلی ۱۹۶۸ء)

۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر — غزل اور متغزلین (لاہور ۱۹۵۵ء)

۳۔ " " " — لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (دہلی ۱۹۶۵ء)

۴۔ احسن مارہروی — تاریخ نثر اردو (حصہ اول علی گڑھ ۱۳۴۸ھ)

۵۔ احمر لاری، ڈاکٹر — حسرت موہانی حیات اور کارنامے (لکھنؤ ۱۹۷۳ء)

۶۔ " " — شخصی مکتوب ۵ اپریل ۱۹۷۵ء، ۹ ستمبر ۱۹۷۵ء

۷۔ احمد حسین — بہارِ بے خزاں بہ تصحیح ڈاکٹر نعیم احمد (دہلی ۱۹۶۸ء)

۸۔ اختر اورینوی، ڈاکٹر — بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (پٹنہ ۱۹۵۷ء)

۹۔ افسر امروہی، سید سرفراز علی رضوی — مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول) کراچی ۱۹۶۵ء

۱۰۔ اعجاز حسین ڈاکٹر سید — مختصر تاریخ ادب اردو (الہ آباد ۱۹۳۵ء)

۱۱۔ اکبر حیدری ڈاکٹر — تحقیقی جائزے (جلد اول) کراچی ۱۹۶۸ء

۱۲۔ " " — (شخصی مکتوب ۱۹ مارچ و ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء)

۱۳۔ الاب لوئیس معلوف الیسوعی — المنجد (بیروت ۱۹۵۶ء) (عربی)

۱۴۔ ایمان، شیر محمد خاں — دیوان ایمان (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۱۵۔ باطن، قطب الدین — گلستانِ بے خزاں (لکھنؤ ۱۸۷۵ء)

۱۶۔ باقر آغا محمد — تاریخ نظم و نثر (امرتسر)

۱۷۔ بیان، خواجہ احسن اللہ خاں دیوانِ بیان (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۱۸۔ بیاضِ کلامِ شعرا (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ) داخلہ نشان ۴۷۹، م۔ ۵

۹۳، ۲۶، ۶۴۲

۱۹۔ تجلّی، شاہ علی مجموعہ فصاحت (قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ)

۲۰۔ تمنا، اسد علی خاں گل عجائب (مرتبہ عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۳۶ء)

۲۱۔ تنہا، محمد یحییٰ سیر المصنفین (جلد اوّل۔ دہلی)

۲۲۔ ثمینہ شوکت، ڈاکٹر حیاتِ لطف (حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء)

۲۳۔ " " " مہاراجہ چندولال شاداں (مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

۱۹۵۹ء)

۲۴۔ " " " مثنوی لطف (حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء)

۲۵۔ جاوید نہال، ڈاکٹر انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ)

۲۶۔ جرأت، قلندر بخش کلیاتِ جرأت (قلمی مخزونہ کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی)

۲۷۔ جمیل احمد، محمد تذکرہ شاعراتِ اردو (۱۹۴۴ء)

۲۸۔ جوہر، غلام حسین گلزارِ آصفیہ (حیدر آباد ۱۸۵۴ء)

۲۹۔ چاند، شیخ سودا (اورنگ آباد ۱۹۳۶ء)

۳۰۔ حالی، شمس العلماء مولانا الطاف حسین مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ سید احمد رضوی) (الہ آباد۔ ۱۹۶۲ء)

۳۱۔ حامد حسین قادری، پروفیسر داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء)

۳۲۔ حسرت موہانی، مولانا اردوئے معلیٰ (علی گڑھ اگست ۱۹۱۰ء)

۳۳۔ " " " اردوئے معلیٰ (انتخاب شعرائے اردو) (جولائی ۱۹۲۶ء)

۳۴۔ حسرت موہانی، مولانا — اُردوئے معلّٰی (کانپور۔ جون ۱۹۲۷ء)

۳۵۔ حسن، میر — تذکرہ شعرائے اُردو (مقدمہ حبیب الرحمٰن شروانی) علی گڑھ (۱۹۲۱ء)

۳۶۔ حفیظ، شیخ محمد حفیظ — دیوانِ حفیظ (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۳۷۔ حکم چند نیّر، ڈاکٹر — شخصی مکتوب (۲۷ نومبر و ۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء)

۳۸۔ حمید اورنگ آبادی، خواجہ خاں — گلشنِ گفتار (مرتبہ پروفیسر سید محمد) حیدرآباد ۱۹۳۹ء

۳۹۔ حیرت اکبرآبادی، قیام الدین — مقالاتِ شعرا (مرتبہ نثار احمد فاروقی)

۴۰۔ حیدری، حیدر بخش — گلدستۂ حیدری (قلمی مخزونہ انڈین انسٹیٹیوٹ آکسفورڈ) (داخلہ نمبر ۵)

۴۱۔ حیدری، حیدر بخش — گلشنِ ہند (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) (دہلی ۱۹۶۷ء)

۴۲۔ " " — (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم لائبریری) داخلہ نمبر ۲۱۶)

۴۳۔ " " — (قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) (داخلہ نمبر ۵۴)

۴۴۔ خلیل، علی ابراہیم خاں — گلزارِ ابراہیم (قلمی مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

۴۵۔ خلیق انجم، ڈاکٹر — مرزا محمد رفیع سودا (علی گڑھ ۱۹۶۶ء)

۴۶۔ خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر — ذوقِ جستجو (دہلی ۱۹۶۷ء)

۴۷۔ " " — شخصی انٹرویو (۲ جنوری ۱۹۷۴ء بمقام دہلی)

۴۸۔ خویشگی، نصر اللہ خاں — گلشنِ ہند بہار (مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی) (پاکستان)

۴۹۔ خیال، نواب سید نصیر حسین خاں — مغل اور اُردو (کلکتہ ۱۹۳۳ء)

۵۰۔ ذکا، خوب چند — عیار الشعرا (قلمی مخزونہ انجمن ترقی اردو و برٹش میوزیم)

۵۱۔ رضا نقوی، ڈاکٹر سید علی — تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان (تہران) (فارسی)

۵۲۔ رفیعہ سلطانہ، پروفیسر — فن اور فنکار (حیدرآباد دکن)

۵۳۔ رفیق حسین، ڈاکٹر — اُردو غزل کی نشو و نما (الہ آباد ۱۹۵۵ء)

۵۴۔ زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری — تذکرہ اردو مخطوطات جلد اوّل (حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ء)

۵۵۔ " " — گارساں دتاسی (حیدرآباد دکن ۔ ۱۹۴۱ء)

۵۶۔ " " — تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرہ گلشنِ ہند (علیگڑھ ۱۹۳۴ء)

۵۷۔ ساحل بلگرامی — تذکرہ چمن اُردو (لاہور ۱۹۲۶ء)

۵۸۔ سحر، ڈاکٹر ابو محمد — اُردو میں قصیدہ نگاری

۵۹۔ سخن، غلام مصطفےٰ — دیوانِ سخن (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۶۰۔ سکسینہ، رام بابو — تاریخ ادب اُردو (ترجمہ مرزا محمد عسکری) (دلّی ۱۹۶۶ء)

۶۱۔ سرور، نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر — عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (دہلی ۱۹۶۱ء)

۶۲۔ سرور، پروفیسر آل احمد — شخصی انٹرویو (۲۶ دسمبر ۱۹۷۳ء بمقام علی گڑھ)

۶۳۔ سلیمان ندوی، مولانا سید — معارف (اعظم گڑھ نومبر ۱۹۳۴ء)

۶۴۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر — ادب کا تنقیدی مطالعہ (لکھنؤ ۱۹۷۲ء)

۶۵۔ " " — اردو رباعیات (لکھنؤ ۱۹۶۳ء)

۶۶۔ سید حسین بلگرامی — دیوانِ قائم (مختار اشعار) (آگرہ ۱۸۹۶ء)

۶۷۔ سید محمد، پروفیسر — ارباب نثر اُردو (حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء)

۶۸۔ سید علی حسن خاں — بزمِ سخن (آگرہ ۱۸۸۱ء)

۶۹۔ شاہ کمال — تذکرہ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری)

۷۰۔ شاداں، مہاراجہ چندو لعل — دیوان شاداں (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۷۱۔ شبلی نعمانی، شمس العلماء مولانا — موازنۂ انیس و دبیر (مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں) (الہ آباد ۱۹۷۰ء)

۷۲۔ شرق، قدرت اللہ طبقاتِ الشعرا (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۷۳۔ " " " (مرتبہ نثار احمد فاروقی) (لاہور ۱۹۶۵ء)

۷۴۔ شورش، سید غلام حسین تذکرۂ شورش (دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد (پٹنہ ۱۹۵۹ء)

۷۵۔ شہید دہلوی، میر احمد علی خاں دیوانِ شہید (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۷۶۔ شیفتہ، نواب محمد مصطفےٰ خاں گلشنِ بے خار (لکھنو ۱۸۴۳ء)

۷۷۔ " " " (محمد احسان الحق فاروقی) (کراچی ۱۹۶۲ء)

۷۸۔ شفیق، لچھمی نرائن چمنستانِ شعرا (مرتبہ عبد الحق) اورنگ آباد ۱۹۲۸ء)

۷۹۔ شیدا، عبد الشکور بیاضِ سخن (حیدرآباد دکن)

۸۰۔ صابر، مرزا قادر بخش گلستانِ سخن (لکھنو ۱۲۷۱ھ)

۸۱۔ صفا، حیدر علی خاں دیوانِ صفا (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۸۲۔ ضیغم، محمد عبد اللہ خاں یادگارِ ضیغم (قلمی مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد)

۸۳۔ " " " مطبوعہ (۱۳۲۴ھ)

۸۴۔ طالب، سراج الدین میرِ عالم (حیدرآباد ۱۹۳۶ء)

۸۵۔ طفیل احمد، یادگارِ شعرا (الہ آباد ۱۹۴۳ء)

۸۶۔ ظفر علی خاں خیابانِ فارس (ترجمہ) جلد اوّل (حیدرآباد دکن ۱۹۰۲ء)

۸۷۔ ظہیر احسن، ڈاکٹر شخصی مکتوب (۳ جنوری، ۷ فروری، ۴ دسمبر، ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء)

۸۸۔ ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر شخصی مکتوب (۱۷ مارچ ۱۹۷۴ء بمقام بمبئی)

۸۹۔ عبد الجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن (حصہ دوم) (حیدرآباد دکن ۱۹۱۰ء)

۹۰۔ عبد المجید صدیقی، پروفیسر ارسطو جاہ (حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء)

۹۱۔ عبد القادر سروری، پروفیسر اردو مثنوی کا ارتقاع (جدید ایڈیشن علی گڑھ)

۹۲۔ عبدالقادر سروری، پروفیسر مرقع سخن (حیدرآباد ۱۹۳۵ء)

۹۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید شعرائے اردو کے تذکرے (لاہور ۱۹۵۲ء)

۹۴۔ عبدالحی گلِ رعنا (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء)

۹۵۔ عتیق صدیقی گلکرسٹ اور اس کا عہد (علی گڑھ ۱۹۶۰ء)

۹۶۔ عزیزالدین احمد بلخی عظیم آبادی تاریخ شعرائے بہار (پٹنہ ۱۹۳۰ء)

۹۷۔ عشقی، محمد وجیہہ الدین تذکرۂ عشقی (دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد) (پٹنہ ۱۹۶۲ء)

۹۸۔ عشرت، ڈاکٹر ارت لعل کلیاتِ سودا (الہ آباد ۱۹۷۱ء)

۹۹۔ عرشی زادہ، اکبر علی خاں شخصی مکتوب (۱۴ مئی ۱۹۷۳ء)

۱۰۰۔ عقیل، ڈاکٹر سید محمد اردو مثنوی کا ارتقاع (شمالی ہند میں) (الہ آباد ۱۹۶۵ء)

۱۰۱۔ علی حسن خاں بزمِ سخن (آگرہ ۱۸۸۱ء)

۱۰۲۔ علوی، محمد امیر احمد مثنویات (لکھنؤ ۱۹۳۶ء)

۱۰۳۔ عمید حسن فرہنگِ عمید ساتواں ایڈیشن (طہران ۱۳۵۳ھ) (فارسی)

۱۰۴۔ عنایت حسین خاں، نواب مدائح الشعرا (قلمی مخزونہ کتب خانہ رام پور)

۱۰۵۔ غلام حسین سیر المتاخرین (لکھنؤ)

۱۰۶۔ فائق، کلب علی خاں مقدمہ آرائشِ محفل (مصنفہ شیر علی افسوس) (لاہور ۱۹۶۳ء)

۱۰۷۔ " " مومن (لاہور ۱۹۶۱ء)

۱۰۸۔ فائق، قاضی نورالدین حسین رضوی مخزن شعرا (مرتبہ عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء)

۱۰۹۔ فاطمی، ایم۔ کے اردو تذکروں میں نکات الشعرا کی اہمیت (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

۱۱۰۔ فتوت، عنایت اللہ تذکرۂ ریاض حسنی (قلمی مخزونہ کتب خانہ اسٹیٹ آرکیوز حیدرآباد)

۱۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر نگار (سالنامہ) تذکروں کا تذکرہ نمبر (پاکستان ۱۹۶۴ء)

۱۱۲۔ فیض، میر شمس الدین — دیوانِ فیض (حیدرآباد۔ ۱۳۰۰ھ)

۱۱۳۔ فصیح الدین، حکیم — تذکرہ بہارستانِ ناز (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری)

۱۱۴۔ ″ ″ ″ ″ (مطبوعہ میرٹھ ۱۲۹۹ھ)

۱۱۵۔ قاضی عبدالودود — معاصر (سہ ماہی) (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء)

۱۱۶۔ ″ ″ — معارف (نومبر ۱۹۲۲ء)

۱۱۷۔ ″ ″ — شخصی مکتوب (۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء)

۱۱۸۔ قاسم، قدرت اللہ — مجموعۂ نغز (لاہور ۱۹۳۳ء)

۱۱۹۔ قائم، محمد قیام الدین — تذکرہ مخزن نکات (مرتبہ مولوی عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۲۹)

۱۲۰۔ قاقشال اورنگ آبادی، افضل بیگ — تحفۃ الشعرا (مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل) (حیدرآباد ۱۹۶۱ء)

۱۲۱۔ قیس، محمد صدیق — دیوان قیس (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۱۲۲۔ کریم الدین — طبقات الشعرائے ہند (۱۸۴۷ء)

۱۲۳۔ کیفی چریاکوٹی، محمد مبین — جواہر سخن (الٰہ آباد ۱۹۲۳ء)

۱۲۴۔ گارساں دتاسی — ہندوستانی دے لا لتریتور ہندوی ایت ہندوستانی (فرانسیسی) (پیرس ۱۸۷۰ء)

۱۲۵۔ ″ ″ — خطبات گارساں دتاسی (مرتبہ مولوی عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۳۵ء)

۱۲۶۔ ″ ″ — تاریخ ادب ہندوستانی جلد دوم (پیرس ۱۸۷۰ء)

۱۲۷۔ گردیزی، فتح علی — تذکرۂ ریختہ گویاں (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء)

۱۲۸۔ لطف، مرزا علی — گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء)

۱۲۹۔ لطف، مرزا علی — دیوان منتخب حسن رضا علی خاں (قلمی مخزونہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ)

۱۳۰۔ ″ ″ — گلشنِ ہند (قلمی مخزونہ سالار جنگ میوزیم داخلہ نمبر ۱۰۶۰)

۱۳۱۔ ″ ″ ″ (قلمی مخزونہ اشٹاٹ بیلیوتھک جرمنی داخلہ نمبر ۲۴۵)

۱۳۲- لطف علی بریلوی   دیوانِ لطف (لاہور ۱۳۶۰ھ)

۱۳۳- 〃 〃 〃 (کانپور ۱۹۲۴ء)

۱۳۴- 〃 〃 〃 (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۱۳۵- لطف، نواب محمد لطف الدین خاں   لطفِ سخن (حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء)

۱۳۶- گوہر، غلام صمدانی   حیاتِ ماہ لقا (حیدرآباد ۱۹۰۶ء)

۱۳۷- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر   ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (دہلی ۱۹۶۲ء)

۱۳۸- گیان چند جین، ڈاکٹر   اردو مثنوی شمالی ہند میں (علی گڑھ ۱۹۶۹ء)

۱۳۹- مبتلا لکھنوی، مردان علی خاں   تذکرۂ گلشنِ سخن (مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسین رضوی ادیب)
(علی گڑھ ۱۹۶۵ء)

۱۴۰- محمد منوّر   سخنورانِ بلند فکر (مدراس ۱۹۳۶ء)

۱۴۱- محمد حسین خاں   تذکرۂ ریاض الفردوس (لکھنو ۱۸۶۷ء)

۱۴۲- محمود الحسن رضوی، ڈاکٹر سید   اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر (لکھنو ۱۹۶۸ء)

۱۴۳- محمد حسن، پروفیسر   شخصی مکتوب (۹ر نومبر ۱۹۷۴ء)

۱۴۴- 〃 〃   شخصی انٹرویو بمقام حیدرآباد - ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۴ء

۱۴۵- مست، ذوالفقار علی   تذکرۂ ریاض الوفاق (مرتبہ سید حسن) (۱۹۶۷ء)

۱۴۶- مسیح الزماں، ڈاکٹر   اردو تنقید کی تاریخ (الہ آباد ۱۹۵۴ء)

۱۴۷- مسیح الزماں، ڈاکٹر   شخصی مکتوب (۹ر جون ۱۹۷۳ء)

۱۴۸- مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر   نگارشاتِ ادیب (۱۹۶۸ء)

۱۴۹- مصحفی، غلام ہمدانی   تذکرۂ ہندی (مرتبہ عبدالحق) (اورنگ آباد ۱۹۳۳ء)

۱۵۰- 〃 〃   ریاض الفصحا (مرتبہ عبدالحق) اورنگ آباد ۱۹۳۴ء)

۱۵۱۔ مصحفی، غلام ہمدانی — عقدِ ثریا (مرتبہ عبدالحق) (اورنگ آباد۔ ۱۹۳۴ء)

۱۵۲۔ ممتاز علی، سید محمد — تذکرہ آثار الشعرا (بھوپال ۱۳۰۴ھ)

۱۵۳۔ میر، میر تقی — نکات الشعرا (مقدمہ حبیب الرحمن خاں شروانی) (بدایوں)

۱۵۴۔ ″ ″ — کلیاتِ میر (مرتبہ عبدالباری آسی) (لکھنو ۱۹۴۱ء)

۱۵۵۔ نادر، درگا پرشاد — ہدایتِ خیال (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری)

۱۵۶۔ ″ ″ — مطبوعہ (لکھنو ۱۸۸۳ء)

۱۵۷۔ ناسخ، امام بخش — دیوانِ ناسخ (جلد دوم) (کانپور ۱۹۰۷ء)

۱۵۸۔ ناصر، سعادت خاں — خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی) (لکھنو ۱۹۷۱ء)

۱۵۹۔ ″ ″ ″ ″ (مرتبہ مشفق خواجہ) (لاہور ۱۹۷۰ء)

۱۶۰۔ نثار احمد فاروقی — تین تذکرے (دہلی ۱۹۶۸ء)

۱۶۱۔ ″ ″ — ماہنامہ سب رس (حیدرآباد۔ ۱۹۶۱ء)

۱۶۲۔ ″ ″ — شخصی مکتوب (۲۲ فروری، ۲ مارچ ۱۹۷۴ء)

۱۶۳۔ نجم الغنی — تاریخِ اودھ (جلد اوّل) (مراد آباد ۱۹۰۹ء)

۱۶۴۔ ″ — تاریخ ریاست حیدرآباد دکن (لکھنو ۱۹۳۰ء)

۱۶۵۔ نساخ، عبدالغفور خاں — سخن الشعرا (لکھنو ۱۲۹۱ھ)

۱۶۶۔ نصیر شاہ — دیوان نصیر (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری)

۱۶۷۔ نصر، ایم۔ اے — لفظ و پیکر (کلکتہ ۱۹۷۶ء)

۱۶۸۔ نور الحسن، سید — تذکرۂ ماہِ درخشاں (بھوپال ۱۲۹۰ھ)

۱۶۹۔ نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر — دلّی کا دبستان شاعری (پاکستان ۱۹۴۹ء)

۱۷۰۔ نیاز فتح پوری — نگار (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء)

۱۷۱۔ وحید اختر، ڈاکٹر خواجہ میر درد تصوف اور شاعری (علیگڑھ ۱۹۶۴ء)

۱۷۲۔ وفا راشدی بنگال میں اردو (دہلی ۱۹۵۴ء)

۱۷۳۔ ہاشمی، نصیر الدین معارف (علی گڑھ، اگست ۱۹۲۶ء)

۱۷۴۔ " " مقالات ہاشمی (لاہور۔ ۱۲۵۶ھ)

۱۷۵۔ " " کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (حیدرآباد ۱۹۵۷ء)

۱۷۶۔ " " کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اوّل (حیدرآباد ۱۹۶۱ء)

۱۷۷۔ یکتا، احمد علی دستور الفصاحت (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی) (رامپور

۱۷۸۔ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر اردو غزل (دہلی۔ ۱۹۵۲ء)

1. Bailey, I. G. : *A History of Urdu Literature;* London : 1932

2. Blumehardt, J. : *Catalogue of Hindi, Punjabi and Hindustani Mss in British Museum.*

3. Blumehardt, J. *Catalogue of Hindustani Manuscript* in Library of India office; England : 1966

4. Bulmer. : *The College of Fort William in Bengal;* London : 1805

5. Gilchrist, John. : *The stranger East India Guide to the Hindustani Language.*

6. Gorekar, N. S. : *Glimpses of Urdu Literature:* Bombay : 1961

7. Kidwai, S. R. : *Gilchrist and the Language of Hindustani.* Delhi, 1972

8. Latif, A. : *Influence of English Literature on Urdu Literature;* 1924

9. Qadri, S. Shamsullah. : *Hindustani Manuscript* in the Library of India office ; London : 1926

10. Ranking, G. S. A. : *History of the College of Fort William in the Bengal Past and Present.* Vol. VII : Calcutta.

11. Roebuck, Thomas. : *Annals of the College of Fort William.* Calcutta : 1819

12. Sadiq, Mohammed. : *A History of Urdu Literature;* London.

13. Sakseena, Ram Babu. : *A History of Urdu Literature;* Allahabad : 1927

14. Siddiqui, Atiq. : *Origins of Modern Hindustani Literature;* Aligarh : 1963